ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا انگریزی ناول
پرچھائیاں
امیتاو گھوش
साहित्य

پرچھائیاں

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا انگریزی ناول

پرچھائیاں

Parchhaiyan : Urdu translation by Kadir Zaman of Akademi Award-winning English novel *The Shadow Lines* by Amitav Ghosh. Sahitya Akademi, New Delhi (1995), Rs. 170

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۶ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون - ۲۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلس آفس

سواتی، مندر مارگ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بلڈنگ۔ چوتھی منزل ۲۳ اے/۴۴ ایکس۔ ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگرہالیہ مارگ، دادر۔ ممبئی ۴۰۰۰۱۴

گنا بلڈنگ، دوسری منزل ۳۰۴-۳۰۵، ۳۰۴ اناسلائی، تینام پیٹھ - مدراس ۶۰۰۰۱۸

اے۔ڈی۔اے رنگ مندر ۱۰۹ جے۔سی۔ روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

ISBN 81-7201-991-2

قیمت ۱۷۰ روپے

طباعت : وِمل آفسیٹ ۱/۱۱۸۰۴ بجشیل گارڈن، نوین شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲

روانگی

سن ۱۹۳۹ء میں جب کہ میری پیدائش کو ابھی تیرہ سال باقی رہ گئے تھے، میرے باپ کی آنٹی مایا دیبی اپنے شوہر اور بیٹے تردیپ کے ساتھ انگلستان روانہ ہوئی تھی۔

یہ جان کر حیرانی ہوتی ہے کہ میرے قلم سے مایا دیبی کا نام اس طرح کیوں کر نکل گیا۔ میں نے اس کا نام کبھی کھُل کر نہیں لیا تھا۔ کبھی نہیں۔ میری دادی کی اکلوتی بہن کی حیثیت سے وہ میرے لیے ہمیشہ مایا ٹھاکر ماہی تھی۔ تاہم جہاں تک میرے حافظہ کا تعلق ہے میرے ذہن کے کسی کونے میں وہ مایا دیبی ہی تھی۔ ہمارے درمیان ایک بڑا فاصلہ رہا جیسے وہ کوئی بڑی فلم اسٹار ہو یا کوئی سیاسی لیڈر جن کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی ہو۔ اس کا سبب شاید یہی تھا کہ میں اُسے قریب سے نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ اکثر کلکتہ سے باہر ہی رہا کرتی تھی۔ شاید یہ صداقت نہیں ہے۔ ممکن ہے میں نے ایک بہانہ ڈھونڈ لیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُسے اپنے رشتہ دار کی حیثیت سے قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا کرنے سے اُس کی اور اُس کے خاندان کی شان و شوکت میں فرق آ سکتا تھا۔ میں اپنے آپ سے یہ سمجھوتہ کبھی نہ کر پایا کہ ان لوگوں سے اپنے خونی رشتہ کا ذکر کر کے اُن کی اہمیت کو گھٹا دوں۔

پہلی بار جب وہ ملک سے باہر گئی تو اُس کی عمر اُنتیس[۲۶] سال تھی اور اس کا بیٹا تردیپ آٹھ سال کا تھا۔

کئی برسوں بعد جب کہ میں اپنے شوز کی ڈوریاں باندھنے کے لائق ہوا اور میری عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو تردیپ نے مجھے اپنی سیاحت کے بارے میں بتایا تھا۔ اُس نے واقعات اس طرح بیان کیے میں سوچنے لگا کہ وہ خود آٹھ سال کی عمر میں لوٹ آیا ہے

اور اس کا قد گھٹ کر میرے برابر ہو گیا ہے۔ ایسا ہونا آسان نہ تھا کیونکہ میرے لیے تو وہ عمر رسیدہ آدمی ہی تھا حالانکہ وہ اس وقت بھی انتیس[۲۹] سال سے زیادہ کا نہ تھا۔ بہرحال میں نے یہی مناسب جانا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ میرے ہی برابر کا ہے۔

لیکن جب میں نے اپنی دادی سے پوچھا تو اس نے فوراً انکار کر دیا اور اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ وہ اپنے اسکول کی کتابوں سے پرے دیکھتے ہوئے بولی: نہیں: وہ تم سے بالکل مختلف دکھائی دیتا تھا۔ تمہاری طرح ہرگز نہیں تھا۔

میری دادی تردیب کو کبھی اچھا لڑکا نہ سمجھتی تھی۔ میرے ماں باپ کے سامنے کبھی اس کا ذکر آتا تو وہ یہی کہتی کہ تردیب ایک لوفر اور کاہل لڑکا ہے۔ وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے باپ کی کمائی کھاتا ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ تاکید کرتی اور جتاتی کہ میں اس کے ساتھ آوارہ گردی نہ کروں۔ وہ تو صرف اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ وقت ضائع کرنا اتنی بُری بات تو نہ تھی لیکن دادی ماں کے لیے وقت ہی سب کچھ تھا۔ اُس کے لیے وقت دانتوں کے بُرش کی طرح تھا کہ اگر استعمال نہ کرو تو وہ سکڑ جائے گا۔ میں نے اُس سے ایک بار پوچھا تھا کہ اُس وقت کا کیا ہوتا ہے جو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس نے سفید بالوں بھرے اپنے سر کو جنبش دی اور ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ضائع شدہ وقت میں سڑانڈ کی بو آتی ہے۔

جہاں تک دادی ماں کا تعلق تھا اُس نے ہمارے چھوٹے سے فلیٹ کو اس طرح سنبھال کر رکھا کہ ہمارا وقت ذرا بھی ضائع نہ ہو۔ شطرنج کے مہرے اور تاش کے پتے ہماری دہلیز کے اندر کبھی داخل نہ ہو سکے۔ گھر کے کسی کونے میں ایک لوڈو سیٹ پڑا تھا لیکن میں اپنے بیمار ہونے پر ہی اسے ہاتھ لگا سکا۔ میری ماں کو بھی اس نے ہفتے میں ایک سے زائد بار دوپہر کا ریڈیو آن کرنے نہیں دیا۔ گھر کا ایک ایک فرد ہر لمحہ کام پر لگا رہتا۔ دادی ماں اپنے اسکول کا کام گھر پر بھی کرتی تھی۔ میں اپنے ہوم ورک میں لگا رہتا اور میری ماں مکان کی دیکھ ریکھ میں۔ میرا باپ ربر کی ایک والکنائزنگ کمپنی میں ایک جونیئر آفیسر کی حیثیت سے مصروف۔ غرض کسی کا بھی وقت ضائع نہ ہونے کے پورے جتن کر دیئے گئے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے تردیب کی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اُس نے وقت کا استعمال کبھی نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کا وقت کبھی سڑا نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ بغیر اطلاع اچانک ہمارے گھر آجاتا۔ پسند نہ کرتے ہوئے بھی میری دادی اُس کے آنے پر خوش ہوتی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ ترتیب اور اُس کے ماں باپ ہی ہمارے پورے خاندان میں امیر ترین لوگ تھے۔ اسے خوشی ہوتی کہ تردیب کسی طرح اپنا وقت نکال کر اُس سے ملنے آیا کرتا ہے۔

میری دادی نے کبھی نہیں مانا لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ تردیب اُس سے ملنے کے بہانے اپنے پیٹ کی صفائی کے لیے ہمارے گھر آتا ہے۔ اُس نے جنوبی کلکتے کی سڑ گلی کی چائے پی پی کر اپنے معدے کو تباہ کیا تھا۔ اسی لیے اس کا ہاضمہ خراب تھا۔ راستے سے گزرتے ہوئے کبھی بھی اس کے پیٹ میں ہلچل مچتی اور اسے اپنا پیٹ صاف کرنے کے لیے کسی بھی نزدیک کے بیت الخلا میں گھسنا پڑتا۔ تردیب کا گیاسٹرک ہم سب لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن گیا تھا۔ مہینوں میں ایک بار یا اس سے زیادہ بھی گھنٹی بجنے پر ہم دروازے تک آتے تو تردیب کو دیوار سے ٹیکا لگا کر کھڑا ہوا پاتے۔ اُس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر ہوتا اور اس کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔ وہ فوراً مکان میں گھس کر نہیں آتا۔ یہاں بھی بڑی شائستگی کا مظاہرہ ہوتا۔ میرے ماں باپ اور میری دادی دروازے تک آتے اور اُس کی مصیبت کا خیال کیے بغیر اُس کے خاندان کے بارے میں دریافت کرنے لگتے۔ وہ بھی مُسکرا مُسکرا کر میرے اور سب کے بارے میں پوچھتا اور جب یہ یقین ہوجاتا کہ وہ ہم سب لوگوں سے ملنے اور ہماری خیر خیریت دریافت کرنے آیا ہے تو پھر وہ دروازے میں داخل ہو کر سیدھے بیت الخلاء کی طرف روانہ ہوجاتا۔ جب وہ باہر نکلتا تو پھر اُس کی ساری چہل عود کر آتی۔ وہ جم کر صوفے میں بیٹھ جاتا اور پھر سے خیر خیریت کا سلسلہ چل پڑتا۔ میری دادی باورچی خانے کی طرف دوڑتی کہ اس کے لیے آملیٹ تل کر لائے۔ ساتھ میں آٹے میں ہری مرچوں سے گوندھا پراٹھا بھی ہوتا تاکہ لے کھا کر وہ گیاسٹرک کا مقابلہ کر سکے۔ کسی بھی مہمان کی تواضع کے لیے میری دادی کا یہی بڑھیا نسخہ تھا۔ اُس کے ہاتھ کا بنایا ہوا آملیٹ (کسی کم تر مہمان کے لیے تو میری ماں کے ہاتھ کی

بنائی ہوئی دال پوری اور سنگھاڑے کے گرم گرم پراٹھے پیش کیے جاتے)

جب وہ اُس کے ہاتھ کا بنایا ہوا آملیٹ کھا رہا ہوتا تو وہ پوچھ بیٹھتی کہ گیا سٹرک کا کیا حال ہے۔ یا پھر یہ کہ گیا گیا سٹرک اچھا ہے۔ تردیپ اپنا سر ہلا دیتا اور کترا کر گفتگو کا موضوع بدل دیتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے ہاضمے کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ یہی ایک عقلمندی مجھے اس میں نظر آتی تھی۔ لیکن میری دادی نے اس کثرت سے گیا سٹرک کا استعمال کیا کہ مجھے یقین ہو گیا گیا سٹرک کوئی عضو ہے جو صرف تردیب کے جسم میں پلتا ہے۔ ایسا کوئی دانت ہو گا جو تردیب کے ہیٹ کے نچلے حصے سے جُڑا ہوا ہے لیکن میں نے کبھی ہمت نہیں کی کہ اسے دیکھوں۔

میری دادی آملیٹ تو اہتمام سے بناتی لیکن تردیب کو زیادہ دیر گھر میں ٹھہرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اُسے یقین تھا کہ تردیب دور رہ کر بھی کسی منحوس ستارے کی طرح لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ وہ مردوں کے لاأبالی پن اور اُن کے پارہ صفت ہونے سے خوب واقف تھی۔ اسے ڈر تھا کہ تردیب کی صحبت میں میرا باپ یا میں آسانی سے بگڑ سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ تردیب کو ہمارے فلیٹ میں زیادہ ٹھہرنے کا موقع ہی نہ دیتی۔

یہی میرے لیے بھی فالِ نیک تھا کیوں کہ ہمارے فلیٹ میں رہ کر تردیب کی شوخیاں ماند ہی پڑ جاتیں۔ میں اُس کے ہمراہ محلّے کی گلیوں میں نکل پڑنا ہی بہتر سمجھتا۔ لیکن اس کا بھی زیادہ موقع نہیں ملتا۔ شاید مہینے میں ایک بار اس عادت کی بدولت یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ کلکتے میں گھومنا پھرنا کوئی خوش بختی کی علامت ہے۔

تردیب کا باپ سفارتی درجہ کا ایک عہدیدار تھا۔ وہ اور مایا دیبی اکثر ہندوستان سے باہر رہتے یا پھر دِتی میں۔ کبھی کبھی دو تین سال کے وقفے سے وہ چند مہینوں کے لیے کلکتہ آتے۔ تردیب کے دو اور بھائی تھے۔ بڑا بھائی جتین، تردیب سے دو سال کا بڑا تھا۔ وہ لویَن میں ماہرِ معاشیات تھا۔ اپنی بیوی اور اپنی بیٹی اِلا کے ساتھ وہ ہمیشہ باہر ہی رہتا۔ افریقہ میں، کبھی جنوب مشرقی ایشیا میں۔ اِلا میری ہم عمر تھی۔ میرا بھائی ردبی جو اپنے دونوں بھائیوں سے بہت ہی کم عمر تھا اپنی ماں کے کئی اسقاطِ حمل کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ باپ

کے ساتھ ہی رہتا تھا لیکن جب وہ بارہ سال کا ہوا تو اُسے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کروایا گیا۔

ہاں تو تردیب بھی خاندان کا ایک فرد تھا جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ کلکتے میں بسر کیا تھا۔ کئی برسوں تک وہ اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ آبائی مکان میں رہا کیا۔ یہ مکان بالی گنج پلیس کے علاقے میں تھا۔ میری دادی کا کہنا تھا اس کی اپنے باپ کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ یہ شکایت اس لیے نہیں تھی کہ میری دادی کو تردیب کے باپ سے کوئی خاص اُنس تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ تردیب نے اپنا مستقبل تاریک کر لیا تھا۔ پسند یا ناپسند جیسی باتیں میری دادی کے لیے بڑی غیر اہم تھیں۔ دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنا اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ تردیپ نے اس پرانے مکان میں اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے بڑی غیر ذمہ داری کا کام کیا ہے۔ یہ تن آسانی کے سوا کچھ نہیں۔ کردار کی خامی۔ تردیب کم از کم شادی کے لیے راضی ہو جاتا اور گھر بسا لیتا تو شاید اس کی رائے بدل سکتی تھی (اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اُس کے لیے کسی دولت مند لڑکی کی تلاش کر لیتی) لیکن جب بھی یہ سوال اُٹھا وہ ہنس کر ٹال گیا۔ اُس کے غیر ذمہ دار ہونے کا یہ بھی ایک ثبوت تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ اپنے ارادوں میں کھوکھلا ہے اور اپنی ہی ذات میں گُم ہو کر اپنے آپ کو ضائع کرنا چاہتا ہے۔ تردیپ کے خیال کو میری دادی اپنے سر کی ایک جنبش سے خارج کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بارے میں بولتی ہوئی وہ تھکتی نہ تھی۔ ساتھ ہی مجھے اُس کے اثر سے دور رکھنے کی پوری تاکید بھی کرتی۔ اسے یقین تھا کہ اگر مردوں پر ان کی ماؤوں اور بیویوں کی گرفت نہ ہو تو وہ تردیب ہی کی طرح بگڑ جائیں گے۔

وہ اکثر تردیب سے ہمدردی جتاتی۔ بے چارہ تردیب ـــــ وہ کہا کرتی دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے تکمیل کو نہ پہنچائے۔ وہ ایک شاہانہ زندگی گزار سکتا تھا اور ملک کے سیاہ و سفید میں حصّہ لے سکتا تھا۔ لیکن اسے دیکھو بے چارہ تردیب۔ ایک بوسیدہ مکان میں رہتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ وہ بچّہ ہی تھا لیکن عجیب

بات ہے کہ وہ اُس سے ڈرتی تھی۔ اُس پر رحم نہیں کھاتی تھی۔

کبھی کبھی وہ تردیب کی طرف داری کرتی اور اس کی کاہلی کی تردید بھی کرتی۔ کہتی! آثارِ قدیمہ کے موضوع پر وہ پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ بنگال کے سینا دور سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن میری دادی کے خیال میں یہ کوئی اہم کارنامہ نہ تھا کہ تردیب کی وقعت بڑھتی۔ اسکول ٹیچر کی حیثیت سے خود دادی نے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ اُس کے خیال کے مطابق ریسرچ کا کام زندگی سے جڑا ہونا چاہیے۔ آدمی کو اتنی شہرت ملے کہ وہ اپنا نام کلکتہ یونیورسٹی یا نیشنل لائبریری کے سنگِ بنیاد پر کھُدا ہوا پائے۔ اُس کے لیے تردیب جیسے کڑھ مغز کے بارے میں سوچنا خام خیالی کے سوا کچھ نہ تھا۔

دادی کے پاس تردیب سے اس قدر بدگمان ہونے کی ایک اور وجہ تھی۔ ان دنوں ہم لوگ گول پارک میں رہتے تھے اور میری دادی نے تردیب کو کئی بار گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔ اس طرح گھومتے اور چائے کے اڈّوں پر چکّر لگانے والے نوجوانوں کے بارے میں اُس کی رائے بہت خراب تھی۔ وہ حقارت سے کہتی کہ یہ سب فیل ہو کر بیٹھے ہیں۔ سوچو ان کی بے چاری ماؤں کا کیا حال ہوگا۔ سڑک پر پڑی بھوکوں مر رہی ہوں گی۔

چند بار تردیب کو وہاں دیکھ کر اُس نے خیال کیا کہ یہی اس کا مستقل اڈّہ ہے جہاں وہ گپیں ہانکنے کے لیے روز جاتا ہے اور یہی اُس کا مقدر ہے۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ تردیب وہاں کبھی کبھی ہی آیا کرتا تھا۔ مہینے میں ایک یا دو بار۔ مجھے اس کے یہاں آنے کا کسی طرح علم ہو جاتا۔ گلی کے کونے میں اپنی اسٹال پر بیٹھا پان بنانے والا انھو چوبے یا میرا دوست مونٹو جو اپنے حمّام کی کھڑکی میں سے گلی کے آخری کونے تک جھانک لیا کرتا تھا یا پھر پرانی کتابوں کے اسٹال کا کوئی بھی آدمی مجھے تردیب کے آنے کی خبر کر دیتا تھا۔ سب یہی جانتے تھے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔

اب میں اگر گول پارک کے علاقے سے گزروں تو کیا وہی باتیں دہرائی جا سکتی ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں کیسے کہوں کہ اب وہ دنیا میرے لیے اجنبی ہو چکی کئی برسوں کی غیر حاضری

یں سب کچھ بدل چکا ہے۔ مونٹو کو امریکہ جاکر کتنے ہی سال ہو گئے اور میں نے سنا کہ نھتو چوبے نے بنارس لوٹ کر ایک ہوٹل کھول لیا ہے۔ اس کی پان شاپ کے سامنے سے میرا کبھی گزر ہوتا ہے تو ان جگمگاتی گلیوں اور وہاں کے ایئر کنڈیشنوں کے دُکانوں کے سامنے ایک ہجوم دکھائی پڑتا ہے۔ فٹ پاتھ پر تار پولین کے ڈھابے لگے ہیں۔ گلی سے لے کر ڈھکوریا کے پُل تک ایک ریل گاڑی کا سفر ہوتا ہے۔ گو ایک پان شاپ وہاں اب بھی موجود ہے لیکن مجھے اُس پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں وہاں سے کبھی کبھی موٹر کاریں گزرتی تھیں اور ہم لوگ فٹ بال کھیلتے ہوئے فوں فوں کرتی ہوئی ۹ نمبر کی بس کے لیے راستہ دے دیتے تھے۔ گاریاہاٹ روڈ پر کہیں کہیں ان مہاجروں کے ٹاٹوں کی جھونپڑیاں نظر آتی تھیں جو شروع شروع میں مشرق سے ہجرت کرکے آگئے تھے۔ گول پارک کا علاقہ ایک طرح سے کلکتے کے مضافاتی علاقہ کہلاتا تھا۔ میرا اسکول سنٹرل کلکتے میں تھا اور جب میں وہاں روزانہ ٹرین سے پہنچتا تو میرے ساتھی سمجھتے کہ میں آبادی سے باہر کسی مہاجر کیمپ سے آیا ہوں۔

کرکٹ کا کھیل ختم کرکے شام کے وقت جب میں گھر لوٹتا تو اکثر سنا کرتا کہ تردیب کہیں آس پاس ہی ہیں ہے۔ کرکٹ ایک ایسا کھیل رہا جس کے خلاف میری دادی نے کبھی ایک لفظ نہ کہا بلکہ اس کا اصرار یہ بھی ہوتا کہ میں جھیل کی طرف سے ہوکر دوڑتا ہوا پارک تک جاؤں۔ وہ مجھے گھر سے باہر ڈھکیلتی ہوئی کہتی۔ تم اپنے ملک کو اس وقت تک طاقتور نہیں بنا سکتے جب تک تم اپنے جسم کو طاقتور نہ بناؤ۔ وہ اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی کہ میں پارک تک دوڑ کر جا رہا ہوں یا نہیں۔

لیکن اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تردیب کہیں آس پاس ہی ہیں موجود ہے تو میں تیز دوڑ کر ہی راستہ پار کرتا اور گلیوں میں اُسے ڈھونڈتا۔ کوئی نہ کوئی مجھے بتا دیتا کہ وہ کہاں ہے۔ گول پارک سے لے کر گاریاہاٹ تک گھومنے پھرنے والے جتنے بھی باتونی طالب علم ہوتے یا فٹ بال کھیلنے والے لڑکے یا سیاسی گپیں ہانکنے والے کلرک وہ سب کے سب تردیب کو جانتے تھے۔ اس وقت میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا کہ تردیپ کو لوگ کیوں جانتے

ہیں اور وہ ان لوگوں میں اس قدر مقبول کیوں ہے۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا اور اُن گلیوں میں تردیب کی موجودگی سے جو کچھ امتیازی سلوک میرے ساتھ ہوا اس سے میں خوش رہا۔ تردیب کو جاننے والا کوئی بھی شخص مجھے کبھی کبھی مٹھائیاں دے دیتا یا کوئی نوجوان مجھے کسی جھگڑے سے بچا لیتا۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں کا سلوک تردیب کے ساتھ ایسا کیوں تھا۔ وہ ان کے طبقے کا نہیں تھا۔ وہ اس علاقے کا رہنے والا بھی نہیں تھا اور نہ ہی وہ باتیں کرنے کا ماہر تھا۔ وہ تو اکثر ان کی چکنی چپڑی باتیں سن کر خاموش ہو جایا کرتا۔ جب بھی وہ ان لوگوں میں پہنچتا تو تھکا تھکا یا ایسا شخص محسوس ہوتا جو خوب جسمانی محنت کے بعد وہاں آیا ہو اور تفریح چاہتا ہو

لیکن کبھی کبھی تردیب کو اگر محسوس ہوتا کہ کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی ہے جو اُس کی وقیع معلومات میں گرہ ڈال رہی ہے تو پھر وہ کسی بھی بحث پر اُتر آتا۔ مسوپٹامیہ کے قیام، مشرقی یوروپین جاز اور ابتدائی بندروں کی عادات و اطوار سے لے کر گارسیا لورکا کے ڈراموں تک کے موضوعات کو کھنگال دیتا۔ پھر اس کی باتیں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ میں اُن لوگوں کو غور سے دیکھتا جو اس کی باتیں بڑے دھیان سے سنا کرتے۔ وہ شامیں بڑی خوشگوار ہوتیں۔ اُس کا پتلا جھلایا ہوا چہرہ، اُڑتے ہوئے بال اور سنہری عینک کے اندر سے اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں کو دیکھ کر میں پھولا نہ سماتا۔

لیکن اس زمانے میں بھی جب تردیب سب کی نگاہوں کا مرکز تھا اُس میں ایک طرح کی علاحدگی پسندی تھی۔ وہ لوگوں کو دوست بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ انھیں مقامات پر خوش نظر آتا جہاں لوگ غیر جانبدار ہوتے اور کھری باتیں کرتے۔ ایسے مقامات، ایسے قہوہ خانے، ایسے شراب خانے اور ایسی گلیاں اُسے پسند تھیں جہاں لوگ آتے تو کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے لیکن شخصی معاملات سے واقف ہوئے بغیر اپنی اپنی راہ لیتے۔ یہی وجہ تھی وہ بالی گنج سے دور اپنے اڈوں پر گول پارک تک آنا پسند کرتا تھا۔ اُسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اُس کی کسی پڑوسی سے مڈبھیڑ نہ ہوگی۔

لوگ شاید اس لیے اُسے برداشت کر لیتے کہ وہ دوسروں سے مختلف تھا اور ایک

وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ اس سے کسی قدر ڈرتے تھے۔ اس کی تیز و طرّار زبان سے اور اُس کی عجیب و غریب بے محابہ گفتگو سے جو اُن کو اکثر پریشان کر دیتی۔ لیکن وہ ایک طرح سے کام کا آدمی بھی تھا۔ اُس میں پکّی دنیاداری کی جھلک بھی ہوتی جو کبھی کبھی اُن کے کام کی ثابت ہوتی۔ مثال کے طور پر طالب علم کو امتحان کا پرچہ لکھنے کے گُر سکھاتا اور کہتا کہ اس پرچے کے ممتحن پروفیسر سے اُس کی اچھی واقفیت ہے اور یہ کہ اُس کا مزاج کس طرح کے جوابات چاہتا ہے۔ طالب علم اس کا مشورہ قبول کر لیتا اور درجہ اوّل میں کامیاب ہو جاتا۔ یا یہ کہ کسی کو ملازمت کے لیے انٹرویو میں جانا ہوتا تو وہ امیدوار سے کیے جانے والے سوالات پہلے ہی سے بتا دیتا اور اس کی باتیں صد فی صد صحیح ہوتیں۔ لیکن کبھی کبھی یوں لگتا کہ وہ جان بوجھ کر غلط رہنمائی کر رہا ہے۔ ایک دفعہ ہوا یوں کہ ایک نوجوان امیدوار کسی بین الاقوامی کمپنی میں انٹرویو دینے جا رہا تھا۔ تردیپ نے اس سے کہا کہ یہ کمپنی ایک زمانے میں بڑی اصول پرست تھی لیکن اب اسے ایک مارواڑی نے خرید لیا ہے۔ اب اُس کا پورا رجحان قوم پرستی کی طرف ہے۔ اگر وہ نوجوان منتخب ہونا چاہتا ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ انٹرویو میں دھوتی پہن کر جائے۔ چناں چہ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو چوکیدار نے اس پہ دروازہ بند کر دیا۔

کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تردیپ کی کن باتوں میں سچّائی ہے۔ کبھی تو وہ اپنا ہی مذاق اُڑاتا ہوا نظر آتا اور اس کی باتیں سُن کر کوئی یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کیا جائے یا اس کے مشورے پر کام کرے۔ نتیجتاً اس کے بارے میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہوتی رہیں۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان والوں کے بارے میں بے انتہا راز داری برتتا تھا حالاں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ اُس زمانے میں نوجوان ذہن ماوزے تنگ کے خیالات سے متاثر تھا۔ اُس کے اس رویّے سے واقف ہو کر بھی لوگ اسے چھیڑتے کہ انھوں نے سنا ہے کہ تردیپ کا اثر و رسوخ والا ہے۔ اُس کا باپ ایک سفارتی عہدیدار ہے۔ اُس کا دادا ایک دولت مند جج تھا اور یہ کہ وہ خود ایک ایسے ماہر معاشیات کا بھائی ہے جو یو این میں ملازم اور بیرون ملکوں میں

رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی یہ باتیں اُس کے سننے میں آتیں ایک دوسری آواز بولنے والے کو روک دیتی اور کہتی۔ تم کہاں رہتے ہو میتری۔ تم سمجھتی ہو کہ ہم سب کو آسمان سے پھینکا گیا ہے کہ تمہاری ان باتوں پر یقین کرلیں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ شادی شدہ ہے اور اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ سنتوش پور کے پس ماندہ علاقے میں رہتا ہے۔

لوگوں کو دوسری بات زیادہ سچی لگتی کیوں کہ ایک سفارتی عہدیدار کا لڑکا جو دولت مند اور بااثر خاندان سے تعلق رکھتا ہو اس طرح سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی نہیں کرسکتا۔ کبھی کبھی میں انھیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا لیکن میں تو ایک سادہ لوح لڑکا تھا۔ میری بات کا کسے یقین ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ میں خود گلی کے موڑ پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہوں۔ میں اگر زیادہ اصرار کرتا کہ اس طرح کے بااثر اور دولت مند لوگ بھی ہمارے رشتہ دار ہیں تو وہ یہی سمجھتے کہ میں بھی گپ ہانک رہا ہوں۔

جب میں نو سال کا ہوا تو اُس زمانے میں تردیب نے دنوں تک گول پارک آنا چھوڑ دیا۔ وہاں پر مستقل آنے والوں میں اُس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ حقیقت سے صرف میں ہی واقف تھا اس لیے کہ ایک دن دوپہر میں میں اپنے ریاضی کے ٹیوشن کے لیے جاتے ہوئے تردیب کے گھر رک گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تردیب نے مجھے اپنی سیاحت کے واقعات اقساط میں سنائے تھے۔

وہ ہمیشہ اپنے گھر کے اوپری حصے میں کسی چٹائی پر لیٹا ہوا پایا جاتا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا۔ اس کے پہلو میں جلتی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے پر رکھی ہوتی۔ میں نے جب اس سے کہا کہ گول پارک کے لوگ اسے یاد کر رہے ہیں تو اس نے اپنے لبوں پر انگلی رکھ لی —— شش۔ کسی سے کچھ نہ کہو۔ تمہیں بتاتا ہوں۔ سینا خاندان کے بادشاہوں نے خزانہ جہاں چھپا رکھا ہے تو اس جگہ سے میں واقف ہوں۔ حکومت کو پتہ چل جائے تو وہ سارا خزانہ لے جائے گی۔ کسی سے کچھ نہ ہو اور اس طرح سے یہاں آیا نہ کرو۔ کیا پتہ کوئی جاسوس تمہارا پیچھا کر رہا ہو۔ یہ سن کر میں بلّیوں اچھل پڑا تھا اور اس راز کو اپنے سینے سے لگائے رہا تھا۔ پھر میں نے سب سے کہا کہ وہ یہاں سے جا چکا ہے اور اب کسی سے نہیں مل سکتا۔

لیکن ایک شام گول پارک واپس ہوتے ہوئے مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ بعض لوگوں کو وہ اس علاقے میں دکھائی دیا ہے۔ یہ سن کر میں اُس کے مخصوص اڈّہ کی طرف بھاگا اور اُسے وہاں پایا۔ وہ اپنے واقف کاروں کے ہجوم میں گھرا ہوا بیٹھا ہے اور ان کے سوالوں کے جواب دے رہا ہے۔ میں نے اسے لوگوں کے پیچھے سے سلام کیا لیکن اس نے مجھے دیکھا ہی نہ تھا۔

اتنے دنوں سے تم کہاں تھے تردیب دادا۔ کسی نے پوچھا۔ تین چار مہینے تو ہو گئے۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا جب اُس نے کہا کہ وہ یہاں نہیں تھا۔

یہاں نہیں تو کہاں؟...

میں لندن اپنے رشتے داروں کے پاس گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ بھیانک تھا لیکن آواز میں استواری تھی۔

کون سے رشتہ دار؟

میرے سسرالی رشتہ دار انگریز ہیں۔ پرائس اُن کا خاندانی نام ہے۔ میں انھیں کے پاس گیا۔ یہ کہتے ہوئے اسے لوگوں کے مشکوک احساسات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اس نے کہا کہ اس پورے عرصے میں وہ مسز پرائس کے پاس ٹھہرا تھا۔ وہ ایک بیوہ عورت ہے۔ لندن میں لیمنگٹن روڈ پر رہتی ہے۔ اس کے مکان کا نمبر ۴۴ ہے۔ وہاں کے ٹیوب اسٹیشن کا نام ویسٹ ہمپٹڈ ہے۔ اُس کی ایک لڑکی ہے جس کا نام مٹے ہے۔

کسی نے جملہ کسا۔ وہ کیسی لگتی ہے سیکسی؟

ایک لمحہ کے لیے وہ سوچنے لگا پھر اُس نے کہا نہیں سیکسی نہیں۔ عام عورتوں کی طرح نہیں۔ وہ چوڑی چکلی عورت ہے۔ وہ قد آور نہیں لیکن اس کے شانے مضبوط ہیں۔ نازکی اور خوبصورتی کا جو تصور ہے وہ ویسی تو نہیں کیوں کہ اُس کے چہرے پر سختی ہے اور اس کے جبڑے چوڑے ہیں۔ لیکن ہاں اس کے گھنے سیاہ بال ریشمی دھاگوں جیسے نرم ہیں۔ لگتا ہے کوئی مصری شہزادی ہے۔ اُس کی خندہ مسکراہٹ میں ایک بانکپن ہے مسکرانے میں اُس کی نیلی آنکھیں اس طرح پھیلتی ہیں کہ اس کے حسن کی کوئی اور برابری نہیں کر سکتا۔

اور وہ کیا کرتی ہے۔ وہ پہلوانی کرتی ہے یا یہ کہ اُس کا پیشہ بال بنانے والیوں میں

سے ہے۔ کسی اور نے سوال کیا۔
تردیب نے کہا۔ وہ ایک طالب علم ہے۔ ہاں اُسے طالب علم ہی کہیے۔ وہ رائل کالج آف میوزک میں پڑھتی ہے۔ وہ الغوزہ بجاتی ہے۔ ایک دن وہ آرکسٹرا بجانے والوں میں شامل ہو جائے گی۔
یہ سُن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں آگے کی طرف جھکا اور کہنے لگا۔ تردیب دا۔ آپ بھول رہے ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ پچھلے مہینے میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ اپنے کمرے میں چٹائی پر لیٹے تھے اور آپ دیکھ رہے تھے...
ایک قہقہہ بلند ہوا اور سب چلّانے لگے۔ جھوٹے، دھوکے باز، تم نے یہ ساری کہانی گھڑی تھی۔ تم کہیں نہیں گئے تھے۔
تردیب ذرا بھی پشیماں نہ ہوا۔ نہ میری بات سے اور نہ لوگوں کے قہقہوں سے۔ مزے سے اپنے شانے جھٹکتا ہوا وہ خود بھی لوگوں کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ اگر آپ کہنے والے کی ہر بات پر یقین کرنے لگیں تو پھر کوئی آپ سے کچھ کیوں کہے۔ میری طرف جھکتے ہوئے اُس نے میرے گال کی چٹکی لی اور سوالیہ انداز میں کہا۔ کیا ایسا نہیں ہے۔ اُس وقت بلب کی روشنی میں اُس کی عینک چمک رہی تھی۔
اُس کی خود اعتمادی دیکھ کر لوگوں کی ہنسی رُک گئی اور وہ چپ ہو گئے۔ اس نے تو دل لگی کا بہانہ کیا تھا اور لوگ اس کا شکار ہو گئے۔ اپنے ہی بارے میں ایک چٹکلہ گھڑا تھا۔ تردیب جب جانے لگا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس پر خفا ہوں کہ نہیں۔ کسی نے کہا۔ تم اُس کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ وہ تو لوگوں کو جھانسہ دینے اور اُن کا مزاق اُڑانے میں ماہر ہے۔ اس پر کسی اور نے جملہ چست کیا۔ وہ مزاق نہیں اڑا رہا تھا۔ وہ پکّا احمق ہے۔ وہ مزاق کیا جانے۔ دراصل وہ ابھی تک کلکتے سے باہر گیا ہی نہیں۔
تردیب کو اس طرح آتمکار کرنے پر مجھے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو۔ لوگوں نے چُپ سادھ لی۔ میں نے اپنی آواز مزید بلند کی اور کہا۔ سنو سچائی کیا ہے۔ تردیب کئی سال پہلے جب کہ وہ ابھی بچّہ تھا اپنے والدین

کے ساتھ لندن گیا تھا۔ اُس کے باپ کے آپریشن کے سلسلے میں۔ وہ آپریشن ہندوستان میں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سن ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ باوجود یہ کہ جنگ کا اندیشہ تھا۔ وہ لوگ وہاں گئے۔ اُس کے بڑے بھائی جتین کو کلکتہ ہی میں چھوڑنا پڑا تھا کیوں کہ وہ زیادہ دنوں تک اپنے اسکول سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ پرائس نام کا ایک خاندان ویسٹ ہمپسٹڈ میں رہا کرتا تھا۔ دونوں خاندانوں کی قدیم دوستی تھی۔ برطانوی حکومت کے دور میں پرائس کے باپ لیونل ٹرلیاسن ہندوستان میں رہتے تھے وہ اور تردیب کے دادا جو کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک اہم جج تھے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ لیونل ٹرلیاسن کے انگلینڈ واپس ہونے کے کئی دنوں بعد اُن کی بیٹی نے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی تھی جو اسے کالج میں پڑھاتا تھا۔ سب لوگ اسے اسناپ کہہ کر بلاتے تھے کیوں کہ اس کا نام ایس ین آئی پرائس تھا۔ جب اس لڑکی نے سُنا کہ تردیب کا باپ بیمار ہے تو اس نے ان لوگوں کو لکھا کہ لندن آ کر وہ انھیں کے گھر ٹھہریں۔ لندن میں اس نے ایک بڑا گھر خریدا ہے اور انھیں بہر حال کرایہ داروں کی ضرورت ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کی بھی ایک بیٹی مئے نام کی تھی لیکن جب تردیب لندن گیا تھا تو وہ ایک چھوٹی بچی تھی میں نہیں سمجھتا کہ تردیب نے اسے کبھی دوبارہ دیکھا ہو۔ مسز پرائس کا ایک بھائی بھی تھا۔ الان اس کا نام تھا اور جنگ سے قبل وہ جرمنی گیا ہوا تھا۔

اتنا کہہ کر میری سانس پھولنے لگی۔ کسی نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ تردیب کی باتوں کے مقابلے میں اس لونڈے کی باتوں میں تو اوزن ہے۔

یہ سچ ہے۔ میں پھر چیخا۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو پوچھ لو... تردیب سے۔

چاروں طرف سے قہقہے گونجنے لگے۔

میں نے اپنے لیے راہ تلاش کی۔ گلی کی طرف بھاگا اور اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ ایک گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی اور میری دادی شدید خفا تھی۔ اُس نے اپنی ہیڈ مسٹرس کی سی تُلی آواز میں سوال کیا کہ میں کہاں گیا تھا۔ اور جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور مجھے ایک چانٹا رسید کیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ میں کہاں

گیا تھا۔ مجھے کہنا پڑا کہ میں گلی کے نکڑ تک گیا تھا۔ دادی نے ایک اور زوردار چانٹا مارا اور کہا۔ میں نے تجھے جتایا نہیں تھا کہ تجھے وہاں جاکر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہیے۔ وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں، کام کرنے کے لیے ہے۔

اس واقعے کے دو سال بعد میری ملاقات مئے پرائس سے ہوئی۔ اُن دنوں وہ کلکتہ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میری اس سے دوبارہ ملاقات سترہ سال بعد ہوئی جب میں لندن گیا تھا۔

انڈیا آفس لائبریری سے مواد حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک سال کے لیے لندن جانے کی اسکالرشپ ملی تھی۔ وہاں برطانوی نوآبادیات کا سارا ریکارڈ موجود تھا۔ مجھے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان انیسویں صدی میں کپڑوں کی تجارت سے متعلق پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کرنا تھا۔ لندن پہنچنے کے کوئی ایک ماہ بعد میری ملاقات مئے سے ہوئی تھی۔ مجھے اس کا پتہ لگانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ وہ ایک آرکسٹرا میں کام کرتی ہوئی اپنی روزی کماتی تھی اور ہیلنگٹن میں رہتی تھی۔ اس نے مجھے اپنا فون نمبر تو دیا تھا لیکن وہ گھر پر کبھی موجود نہ ہوتی۔ ایک صبح میں نے گارجین کے ایک صفحہ پر تفریحی پروگرام دیکھا تو ایک اشتہار پر نظر پڑی۔ اُسی شام آرکسٹرا کا ایک پروگرام رائل فیسٹول ہال میں ہونے والا تھا جہاں وہ وارک سلو کانسرٹو پیش کرنے والی تھی۔ سرِشام میں وہاں پہنچا۔ پتہ چلا کہ ٹکٹ بہت تیزی سے بک رہے ہیں۔ میرے پاس آرکسٹرا کی پچھلی نشستوں کا ٹکٹ خریدنے کی گنجائش تھی۔ ٹکٹ مجھے آسانی سے مل گیا کیوں کہ سویڈن کی سولو بجانے والی خاتون کے ساز کی کچھ زیادہ شہرت نہ تھی۔

جب میں اندر داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ میری نشست آرکسٹرا بجانے والوں کی بالکل نشست میں ہے۔ میں نے اُسے ایک نظر میں پہچان لیا۔ وہاں موجود دوسری عورتوں کی طرح اپنے میوزک اسٹانڈ کو وہ بار بار ادھر اُدھر کر رہی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی اسکرٹ اور سفید بلوز پہنے ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی سے جو اس سے عمر میں بڑا تھا وہ باتیں کر رہی تھی اور اپنے بینگے کو سنوار رہی تھی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے بال بالکل

اُسی طرح کٹے ہوئے تھے جیسا کہ اُسے میں نے پہلی بار کلکتے میں دیکھا تھا۔ اُس کے کاندھوں پر لٹکے ہوئے اور چہرے پر دونوں طرف بکھرے ہوئے لیکن وہ بال اب سارے کے سارے چمکیلے اور سیاہ نہیں رہ گئے تھے۔ ان بالوں کی لٹوں میں چند سفید تار بھی نظر آنے لگے تھے۔ ایک وقت تک تھا کہ ان پر کبھی روشنی پڑتی تو چمکنے لگتے۔ اُس کے کاندھے اُس کے قد سے مماثلت نہ رکھتے تھے۔ اُن میں سختی بھی آگئی تھی۔ وہ اوپر سے بہت پھیلی ہوئی لگتی تھی لیکن اُس کی کمر پہلے ہی کی طرح پتلی تھی۔ جب وہ اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت سے بات کرنے کے لیے مڑی تو مجھے اُس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی۔ اُس کے دہن اور اُس کی ناک کے درمیان کئی لکیریں پڑ گئی تھیں اور وہ آنکھیں جو کبھی واضح اور رنگیلی تھیں اب وہ بے رنگ اور پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

کنسرٹ کے دوران میری آنکھوں میں اس کا وہی چہرہ تھا جسے میں نے ایک عرصہ قبل اُس کے کلکتے میں قیام کے دوران دیکھا تھا۔ ہم لوگ ایک کشادہ گھر میں منتقل ہو چکے تھے۔ اُسے نیچے کی منزل میں ایک علاحدہ کمرہ دیا گیا تھا۔ میری ماں اور میری دادی نے تاکید کی تھی کہ میں بار بار اس کے کمرے میں نہ جاؤں۔ لیکن کسی بھی شام جب بھی موقع ملتا میں اُس کے کمرے میں گھس پڑتا اور اُسے موسیقی پر ریاض کرتے دیکھتا رہتا۔ میری موجودگی سے اکثر وہ شرما جاتی۔ اپنے بینگے کو بازو رکھ کر کہتی۔ تم تو اس بے ہنگم ریاض سے اُکتا جاتے ہوں گے۔

لیکن میں اسے روکتا اور اصرار کرتا کہ وہ اپنا ریاض جاری رکھے۔ میں لطف اندوز ہو رہا ہوں گا۔ اُس کے گالوں کو پھولتا ہوا، اُس کی تیوری کو چڑھتا ہوا اور اُسے بینگا بجاتے ہوئے دیکھ دیکھ کر۔

اب تو کنسرٹ ہال میں ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے بینگا بجانے کی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اب اُسے موسیقی کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اور اس کے تمام ساتھی ایک ہی میکانکی انداز میں اپنے اپنے ساز بجا رہے تھے۔ ایسے ہی جیسا کہ چند فوجی اپنے سارجنٹ کمانڈر کے حکم پر معمول کی پریڈ کر رہے ہوں۔

جب کنسرٹ اختتام کو پہنچا تو میں نے تمام سامعین کے چلے جانے کا انتظار کیا۔ موسیقار

اپنا اپنا سامان باندھنے لگے تو میں نے ریلنگ کے قریب پہنچ کر اس کا نام پکارا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا اور اپنا ہاتھ اوپر اُٹھا کر لہرایا۔ پھر اُس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھ سے باہر ملے گی۔

میں باہر آ کر انتظار کرنے لگا۔ مشکل سے پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ وہ میری طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے شانے جھول رہے تھے۔ وہ مجھ تک پہنچی تو ہم دونوں ایک تکلّف کے احساس سے ایک دوسرے کو تکتے رہے پھر اس نے اپنا ہاتھ رُکتے رکتے بڑھایا۔ بے پایاں مسرت کے ساتھ اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میرے گلے اور دونوں رخساروں کا بوسہ لیا۔ اُس کا الفوزہ جو ایک کیس میں رکھا ہوا تھا میری گردن سے ٹکراتا رہا۔

باہر نکلتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا کہ اتنے برسوں کے بعد وہ مجھے کس طرح پہچان سکی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے رُکی اور کہنے لگی۔ میں نے دو جمع دو کا حساب لگایا۔ ماں نے کہا تھا کہ تم لندن آئے ہوئے ہو۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑی پیار سے دیکھنے لگی۔ تم تو خاندان کے انھیں افراد کی طرح ہو جن سے میں کلکتے میں ملی تھی۔ اُس بچے کو میں نے خوب یاد رکھا ہے۔ اُس کی آواز مردانہ لگی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ اُس کی پہلے جیسی آواز تھی یا اس میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

ہم دونوں فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے واٹر ٹیوب اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ رُکی اور پوچھنے لگی کہ شام گزارنے کا پہلے سے میرا کوئی اور پروگرام تو نہیں ہے۔

میں نے اپنا سر بے تعلقی سے ہلایا تو وہ کچھ سوچتی ہوئی کہنے لگی کہ جب بھی مناسب سمجھوں میں بلا تکلف اُس کے پاس رات کے کھانے میں شامل ہو جاؤں۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں تو اُبلی ہوئی ترکاری اور تلی ہوئی مچھلی کا انتظام کر دے گی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں اُس کے بنائے ہوئے کھانے پسند کروں گا کہ نہیں؟

میں نے ہاں کر دی اور کہا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

یہ سن کر وہ مسکرائی اور کہنے لگی تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں خود دالوں کو بھگو کر کو نپلیں اُگاتی ہوں۔

ٹیوب سے گزر کر اسلنگٹن سے جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ کنسرٹ بجاتی ہوئی وہ کتنی بے کل لگ رہی تھی۔ وہ جھینپی اور کہنے لگی کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ آرکسٹرا میں اس لیے بجاتی ہوں کہ کسی طرح اپنی روزی کما سکوں۔ اس نے اپنا گلا صاف کیا۔ پھر جھجھک کر کہنے لگی۔ میں تو زیادہ تر فلاحی اداروں سے وابستہ ہوں۔ ایمنسٹی اور آکسفوم کی طرح کے چھوٹے چھوٹے اداروں سے جن کے نام تم نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔

میں نے اُس سے کچھ اور سوال کیے۔ اُس نے وضاحت کی کہ اُس کے کام کا تعلق وسط امریکہ میں زلزلے سے متاثر لوگوں کی امداد سے ہے۔ ان باتوں سے ظاہر تھا کہ اُسے اپنے کام میں اطمینان نصیب ہے۔

اسلنگٹن گرین کے ایک نکڑ پر ایک مکان کی پہلی منزل پر اُس کا کمرہ تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے اس نے لائٹ آن کی۔ لائٹ کے ساتھ ٹیلی ویژن بھی آن ہوا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آف کیا اور کہنے لگی کہ یہی ایک ٹیلی ویژن اس کی کمزوری ہے۔ اسے وہ ہمیشہ آن رکھتی ہے۔ اس کا کمرہ بھرا رہتا ہے اور اس کے بغیر کمرہ خالی خالی محسوس ہوتا ہے۔

یہ ایک بڑا کشادہ اور آرام دہ کمرہ تھا۔ ہر طرف گملے لگے ہوئے۔ کھڑکیوں سے ہرے ہرے درخت نظر آتے ہوئے۔

کمرے میں فرنیچر بہت کم تھا۔ ایک آرام کرسی، ایک میز اور دیوار سے لگا ایک بڑا پلنگ۔ کچھ کشن ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے کہ کمرہ بھرا بھرا دکھائی دے۔ کشن کے غلافوں پر گجراتی چھپی لگی تھی۔ کمرے کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہاں مہمان زیادہ نہیں آتے۔

میں نے کچھ تکلف کے ساتھ اپنے بک شلف کی طرف مجھے بلایا اور کہا کہ میں تھوڑی دیر کتابوں میں مشغول رہوں تاکہ وہ ہمارے لیے کھانا بنا سکے۔ بک شلف میں مجھے کچھ روسی ناول اور بعض پرچرائد کے علاوہ موسیقی سے متعلق کتابیں نظر آئیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے اچانک میری نظر ایک فوٹو گراف پر پڑی۔ یہ فوٹو کئی اور کاغذ کے پرزوں کے ساتھ کارڈ بورڈ میں رکھی ہوئی تھی۔ ایسے کارڈ بورڈ لندن میں اکثر طالب علم اپنی میزوں پر رکھتے ہیں۔ یہ اُسی کی تصویر تھی۔ بہت پرانی۔

میں یہ تصویر دیکھ ہی رہا تھا۔ وہ کچھ لینے کے لیے ریفریجریٹر کی طرف بڑھی۔ اُس کی نظر میری طرف پڑی تو وہ میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے جب دیکھ لیا کہ میں اُس کی تصویر ہاتھ میں لیے ہوں تو کچھ کہنے کے لیے اُس نے اپنا منہ کھولا۔ لیکن وہ کچھ سوچ کر فوراً مُڑی اور چولہے کے پاس چلی گئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں اُس کے پیچھے ہو لیا اور قریب پہنچ کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چولہے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے کہا یہ تصویر شاید بہت پہلے لی گئی ہے۔ اگر میری یادداشت مجھے دھوکہ نہیں دیتی ہے تو تمہارے کلکتے میں جب قیام تھا تو تم بالکل اسی طرح تھیں۔

بالکل اسی طرح تو نہیں۔ اُس نے اپنے پکوان کی طرف دھیان دیتے ہوئے چند ہی لفظوں میں اپنی بات مکمل کی۔ یہ تصویر اس سے چند سال قبل لی گئی تھی۔

پھر اپنے ہاتھ صاف کرتی ہوئی وہ مجھے دیکھنے لگی۔ پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے کہا۔ یہ وہی تصویر ہے جس کی ایک کاپی تردیب کو بھیج کر میں خوش ہوئی تھی۔

بعد میں جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ ۱۹۵۹ء میں جب تردیب ستائیس سال کا تھا اور وہ انیس کی تو دونوں میں خوب خط و کتابت چلی تھی۔ تردیب نے کہا تھا کہ اُس نے پہل کی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں لندن سے واپس ہو کر اُس نے ہر کرسمس کے موقع پر اُس کو مبارک باد کے کارڈ بھیجے تھے۔ اس سال اُس نے دو کارڈ بھیجے تھے۔ ایک کارڈ مٹے کے لیے تھا۔ اس کارڈ کے ساتھ اُس نے ایک نوٹ بھی بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ اس نے اُسے ہمیشہ یاد رکھا ہے۔ بدنصیبی ہو گی اگر آپس کا یہ ربط ٹوٹ جائے۔ جواب میں اس نے توقع ظاہر کی کہ وہ بھی اسے یاد رکھے گی اور کسی دن خط لکھے گی۔ خط پا کر مٹے کی حالت کچھ نیر سی ہو گئی تھی۔ اُس کا دل لبھایا۔ اس نے تردیب کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ان باتوں کو یاد کرتی ہوئی وہ مجھ سے کہنے لگی کہ تردیب کا خط اسے عین ان دنوں ملا جب کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ چکی تھی۔ ان دنوں اُس کی اپنے ایک کلاس میٹ سے منگنیں بڑھ رہی تھیں۔ وہ ایک بے ڈھب لڑکا تھا۔ مٹے سے اس نے زیادہ تعلقِ خاطر بھی نہیں رکھا اور کوئی صاف صاف بات بھی نہیں کرتا تھا۔ ان حالات میں کوئی دوستی کا ہاتھ بڑھائے

اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کو مسلسل لکھتے رہے۔ جب دونوں کو اپنی قلمی دوستی پر اعتماد ہو گیا تو انھوں نے اپنی اپنی تصویریں ایک دوسرے کو بھیجی تھیں۔

میرا خیال ہے تردیب نے اس دن گول پارک میں جو واقعہ گھڑا تھا وہ تصویر پانے کے بعد کا ہی تھا۔ دراصل میری دادی کا اندازہ تردیب کے بارے میں غلط تھا۔ وہ گول پارک کے اُن شُعدوں میں نہیں تھا جو کسی بھی نکڑ پر بیٹھ کر اپنا وقت گپیں ہانکنے میں ضائع کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے بے تعلق ہو کر وہ اکثر کہتا کہ یہ مخلوق جل پریوں کی طرح ہے جو کنارے پر کسی کو پاکر گھبرا جاتے ہیں اور غوطہ لگا کر سمندر کی تہہ میں ڈوب جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تردیب اپنی جگہ ایک خاص آدمی تھا۔ گوشہ نشین۔ میں تو بچہ تھا۔ تب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جب وہ پرانے آبائی مکان میں تنہا رہ کر آسودگی پاتا تھا۔ مجھے اسی زمانے کا تردیب بہت پسند تھا۔ وہ تردیب جو گلی کے نکڑ پر اپنا وقت گزارا کرتا اس سے ابھی تک میری شناسائی ہو نہ پائی۔

اس کی بھتیجی اِلا نے بھی تردیب کے بارے میں مجھ سے کبھی اتفاق نہ کیا۔ جب اِلا اور میں سولہویں سال میں تھے تو تردیب کے بارے میں ہم نے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ اِلا اپنے والدین کے ساتھ چھٹیاں گزارنے انڈونیشیا سے آئی تھی۔ انھیں دنوں مجھے کالج کی پڑھائی کے لیے دِلّی جانا تھا۔ جوں ہی وہ کلکتہ پہنچے ہم سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اور جب وہ کار سے اُتر رہی تھی تو میری دادی نے جس طرح لمبی سانس لی وہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس کے لمبے گھنے بال کس کر گندھے ہوئے تھے اور اُس کی چوٹی اس کے سینے پر لہرا رہی تھی۔ میری دادی جو دکھاوٹ کے بارے میں خاص طور پر اِلا اور اس کے خاندان کے بارے میں ہمیشہ نکتہ چیں ہوا کرتی تھی اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ ہماری اِلا دن بہ دن حسین ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی طرح خوبصورت ہے۔

لیکن جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے اسے ایسے کپڑوں میں دیکھا جنھیں نہ تو میں نے ہی اور نہ ہی کلکتہ والوں نے کبھی دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ ایک سفید سادہ ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ اس کا آنچل سُرخ تھا اور لگتا تھا کہ جھٹو نے کالج کی کوئی

لڑکی اپنا لکچر سننے جا رہی ہے۔

بڑوں کی گفتگو سے بہت جلد اکتا کر ہم دونوں چہل قدمی کے لیے باہر نکل پڑے۔ بے سوچے سمجھے ہم جھیل کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم جھیل کے قریب پہنچ کر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے تو ہمیں یاد آیا کہ بچپن میں ہم کس طرح مل کر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے۔ جھیل کے بیچ تیرتے ہوئے پرندوں کو دیکھتے ہوئے۔ پھر اچانک ہماری نظریں بلی پول برج کی طرف گئیں۔ ہم خاموش تھے۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میری نظریں دور دور تک ایسی جگہوں کو تلاش کر رہی تھیں جہاں کچھ نہیں تھا۔

آخر کار جب مجھے کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے پوچھا کہ کیا اُسے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے جب روبی اور وہ گرما کے موسم میں کلکتہ آیا کرتے تھے۔ اور ہم تینوں جب بھی اکتا جاتے تو تردیب کے کمرے میں گھس جاتے تھے۔ چبھتی ہوئی گرمی ہوتی۔ تردیب چٹائی پر لیٹا ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے کُشن اِدھر اُدھر پڑے ہوتے۔ جلتی ہوئی سگریٹ اُس کی انگلیوں میں ہوتی اور وہ بڑی نرم آواز میں ہم سے مخاطب ہوتا۔ وہ ہمیں مختلف سانپوں کے اقسام بتاتا یا پھر کوناک کی دیوار پر جو نقش نگار ہیں ان کے بارے میں کہتا۔ یا یہ کہ کٹامران (بیڑا) کس طرح ایجاد کیا گیا۔ میں نے یاد دلایا کہ ایک دن روبی اور میں کسی مہم پر نکلنے کے بہانے تردیب کے پاس پہنچے اور اُس سے مہم سر کرنے کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مسکرا کر کسی ریگستانی قبیلے کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ کس طرح ختنہ کراتے ہیں۔ پھر اُس نے اپنی عینک کے پیچھے سے گھورتی ہوئی آنکھوں سے ہم سے پوچھا تھا کہ اگر اتفاق سے ہم لوگ ایسے قبیلے کے ہاتھوں لگ گئے تو کیا ہم اپنے جھنجھنوں کو اسی طرح کٹوانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ یہ سن کر ہم دونوں نے اپنے اپنے چڈوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ لیکن وہ ہنسنے لگی تھی تو ہم نے اُس کا بُرا مانا تھا۔

جنسی حسد، اُس نے ہنس کر کہا۔ میں نے اپنے چہرے پر بے حسی طاری کرنے کی کوشش کی جیسے میں لڑکیوں سے اس طرح کے الفاظ سننے کا عادی ہوں لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ تب میں نے اُسے یاد دلانا چاہا کہ کس طرح ہم تردیب کو ورغلاتے تھے۔

اس سے ہم فرمائش کرتے کہ وہ ہمیں جنگ کے دوران اپنے لندن کے قیام کے بارے میں بتائے اور جب ہم اس سے پرانی تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اُن پر ٹوٹ پڑتے۔ وہ ہمیں ایک ایک تصویر کے بارے میں بتاتا۔ خاص طور پر مسز پرالس اور اُس کی گود میں مٹے والی تصویر یا الان ترساسین اور اس کا بھائی جس کا ایک ہاتھ مفلوج تھا اور اس کا شوہر اسناپ جو طرح طرح کی دوائیاں استعمال کرتا تھا۔ اعصاب کے لیے ایک ٹانک، دوسرا خون کے لیے، پھر کچھ گولیاں گردے کی تکلیف اور کمر کے درد کو دور کرنے کے لیے یا یادر اثمک پتے کی بیماری کے لیے، گلوڈین زخموں کے لیے اور منتھولیتھم نزلہ و زکام کے لیے۔ وہی اسناپ جس نے ایک بار تردیب کو ویسٹمنڈلین پر کیمسٹ کی دکان تک بھیجا تھا کہ اُس کے دانتوں کے چوکڑے کی حفاظت کے لیے ایسی دوا لائے کہ بھوں کی آواز سے وہ ڈھیلے نہ پڑیں۔

سر کو جنبش دیتے ہوئے اُس نے ہاں کہا۔ میرے اصرار پر وہ کچھ اُلجھن میں پڑ گئی۔ ہاں کچھ کچھ یاد آتا ہے لیکن وہ ٹھیک سے نہ کہہ سکی کہ اُسے کیا یاد ہے۔

تم یہ ساری باتیں کیسے بھول گئیں۔ میں جھنجھلایا تو اس نے اپنے کاندھوں کو جھٹکا دیا اور بھنویں پھیرتی ہوئی کہنے لگی۔ وہ تو عرصہ پہلے کی باتیں ہیں۔ تعجب ہے کہ تم انھیں کیسے یاد رکھ سکے۔ میرے لیے انھیں یاد رکھنے کا کوئی مطلب ہی نہ تھا۔

میں نے اُسے بتانے کی کوشش کی۔ لیکن نہ تو تب ہی نہ اُس کے بعد میں اُسے سمجھانے میں کامیاب ہو سکا کہ تردیب نے جس دُنیا کی مجھے سیر کرائی تھی اور جو بینائی اس نے میری آنکھوں کو دی اُسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ لڑکا جو کلکتہ سے باہر کبھی چند میل کا سفر نہ کر سکا اس کے لیے تردیب کے کمرے کی وسعت کیا تھی اس بات کو ایسی لڑکی ہرگز سمجھ نہ سکتی تھی جو اپنے بچپن ہی سے دنیا کا سفر کرتی آرہی تھی۔ وہ جب اپنے باپ سے میڈرڈ کے پلازا میر کے اور کز کو کی صاف ستھری ہواؤں کے بارے میں بات کرتی رہتی تو مجھے ایسا لگتا کہ میں یہ باتیں طلسمی کہانیوں میں پڑھ چکا ہوں۔ تردیب نے بھی اپنے پرانے بارتھلموس کے اٹلس میں مجھے وہ مقامات دکھائے تھے جن کا ذکر اِلا کرتی تھی۔ اِلا اور اُس کے خاندان کے لیے یہ مقامات ایسے ہی تھے جیسے میرے اور میرے دوستوں کے لیے یہ جھیل۔ شام کے وقت پارک

سے واپس ہوتے ہوئے میں اور میرے دوست زنگ آلود لوہے کے کھمبوں کی طرف منہ کرکے پیشاب کیا کرتے تھے۔

میں نے اس سے کہا کہ قاہرہ کے سیر کی تمنا ایک عرصے سے میرے دل میں ہے تاکہ ابن طلون کی وہ مسجد دیکھوں جس کی کمان دنیا کی پہلی نکیلی کمان ہے اور ان پتھروں کو چھو کر دیکھوں جو چیولپس کے پیرامڈ سے لائے گئے ہیں۔ لیکن وہ میری باتوں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات میں مگن تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیا کہنا چاہے گی میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے بڑے اطمینان سے اپنی انگلیوں کو چٹکایا اور سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔
ہاں ہاں قاہرہ۔ وہاں ڈپارچر لونج کے تھوڑے فاصلے پر ہی تو لیڈیز شاپ ہے۔

میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے لگا ہر ڈپارچر لونج کی اپنی ایک خصوصیت ہے ایک انفرادیت ہے۔ اشٹاک ہوم میں آرلانڈا کی فلش کی طرح جن کے ہینڈل کھولنے کا ایک خاص ڈھب ہے۔ اس ڈھب سے واقف نہ ہونے کی وجہ دوبارہ اعلان کے باوجود حاضر نہ پہنچ سکی تھی۔ مجھے لگا وہ اپنے خیالوں ہی میں ادیس ابابا، الجیریا اور برسبین کے ہوائی اڈوں پر اتر رہی ہے اور لیڈیز شاپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہے۔

دس سال بعد جب میں لندن میں تھا تو اِلا اکثر تفریح کی تجویز رکھتی۔ برکسٹن میں کسی فلم کے لیے یا سیرا ویل میں لگی کسی ویٹنامی کی نئی رسٹورنٹ میں جانے کے لیے۔ یہ جانے بغیر کے کہاں جانا ہے میں اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا اور کہنے لگتا۔ چلو جلد چلو۔ زمین دوز ہو کر ۔۔۔ وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتی اور کہتی تم سمجھتے ہو کہ ہم کسی ایسی مہم پر جارہے ہیں جہاں تمہیں سکون نصیب ہوگا۔

اُس کے لیے زمین دوز ہو کر چلنا صرف تبدیلیٔ مقام تھا۔ پٹری پر کھڑے ہو کر گزرتے ہوئے مجھے جوش میں دیکھ کر اُسے اُلجھن ہوتی۔ وہ پریشانی کا اظہار کرتی اگر میں دیواروں پر چسپاں اشتہاروں کی طرف دیکھنے لگ جاتا یا رنگ برنگی روشنیوں میں کھو جاتا۔ ان سے نکلتی ہوئی موسیقی کی طرف دھیان دیتا۔ کبھی مار کر وہ مجھ سے کہتی۔ چلو چلو، ٹرافک رک جائے گی۔ خدا کے لیے آگے بڑھو۔ تیسری دنیا کا ٹو بیکو اگانے والا کسان نہ بنو۔ یہ صرف زمین دوز سڑک

ہے۔ میں اس سے کہتا تم نہ سمجھو گی۔ تمہارے لیے تو قاہرہ بھی ایک پیشاب خانہ ہے۔ میں اُسے یقین نہ دلا سکا کہ جگہ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اُسے اپنے ذہن میں ڈھالنا بھی پڑتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ اُس کے دیکھے ہوئے لندن کی ہو بہو تصویر میرے ذہن میں تھی۔ زیادہ مختلف بھی نہیں۔ لیکن یہ بات اُسے کہاں سمجھ میں آتی۔ تردیب ٹھیک ہی کہا کرتا تھا کہ جن تصورات کے ساتھ وہ جیتی ہے وہ بھی اُسی کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ گو وہ کئی مقامات پر رہ چکی تھی لیکن اس نے سفر ہی نہیں کیا تھا۔

جب بھی وہ لوگ چھٹیوں میں کلکتہ آتے تو اپنے ساتھ اُن مقامات کے سوونیر لاتے جہاں وہ رہ چکے تھے۔ اس کے ماں باپ تو طرح طرح کی چیزیں لاتے۔ انڈونیشیا کے چمڑے کی گڑیاں، شمالی افریقہ کے کوہانی اونٹ جیسے کھلونے۔ لیکن جو سوونیر اِلا خاص پر میرے لیے لاتی انھیں دکھانے کے لیے وہ مجھے اپنے گھر کی چھت پر پانی کی ٹنکی کے پاس لے جاتی۔ پھر وہ ہنستی ہوئی اُن فولڈرس کو جن میں جگہ جگہ کے اسکولوں کی سالانہ تصاویر ہوتیں، میرے سامنے اُلٹتی۔ ہمیشہ اُسی طرح کے سوونیر ہوتے وہی سالنامے۔ انھیں اسکولوں کے چھپے ہوئے جہاں وہ پڑھا کرتی۔ وہ تمام تصویروں سے بھرے ہوتے۔ ایک ایک طالب علم کی تصویر ایک ایک صفحہ پر۔ پھر گروپ فوٹوز۔ پارٹیوں کی تصویریں۔ کلاسوں کے مابین ٹینس کے مقابلوں کی۔ ایک عرصے تک مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اسکولوں کی تصویریں ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ اُن کا کوئی یونیفارم نہیں ہے۔ وہ ایسے کپڑے پہنے ہوتے جو کسی طرح اسکول کے دکھائی نہ دیتے۔ کسی سرکس کے لگتے۔ ان تصویروں میں اِلا اپنے فوٹو کی نشاندہی کرتی۔ کبھی اسکرٹ اور کبھی جین پہنی ہوئی اور کبھی ایرانی لڑکی کے لباس میں۔ وہ اپنے بازو کھڑے ہوئے دوستوں کی تصویریں بتاتی اور میں اُن کے نام ازبر کر لیتا۔ تیرسا کیسوتا، مرسڈیڈ اگیلر، مارفت اشرقوی۔ یہ نام میں نے اس طرح حفظ کر لیے کہ کئی برسوں بعد میں مرسڈیڈ اگیلر کو اُس فوٹو میں بھی پہچان لیا جو کسی دوسرے براعظم میں لیا ہوا تھا۔

اِلا کے سارے دوست بہت حسین تھے۔ اسکولوں میں بڑی ذہین اور باکمال لڑکیاں۔ پکنکس اور فینسی ڈریس اور ڈانس کی وہ ساری تصویریں جن میں اِلا کی ساتھی لڑکیاں ہوتیں

وہ سب مجھے بتاتی ۔ وہ مجھ سے کہتی ہم تینوں ایک ساتھ گئے تھے ۔ ثریا، معارفت اور میں ۔ ہم لوگوں نے ساری شام باتوں میں گزاری ۔ لڑکے ہمارے اطراف چکر مار رہے تھے ۔ ثریا نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اُس شام ڈانس نہیں کریں گے ۔ بس یوں ہی ۔ یہ کہہ کر وہ ثریا اور معارفت کی تصویریں مجھے دکھاتی ۔ مسکراتی، دُبلی پتلی لڑکیاں کیمرے کے سامنے اپنے چہرے پیش کرتی ہوں ۔ الا بہت سی پارٹیوں اور ڈانس کے بارے میں کہتی ۔ لیکن اکثر تصویریں میں وہ موجود نہ ہوتی ۔

جب ہم چودہ سال کے تھے تو الا نے ایک بار مجھے ایسے لڑکے کی تصویر بتائی تھی جو بھرپور آدمی لگتا تھا ۔ اس کا چہرہ امریکہ کے فلمی اداکاروں کی طرح تھا ۔ چوکور جبڑے خندال ٹھوڑی ۔ لمبے سیاہ بال جو شانوں تک بکھرے پڑے تھے ۔ اس نے اس کا نام جمشید طبریزی بتایا اور کہا کہ وہ ریس چیمپین شپ کے مقابلے کی تیاری کر رہا ہے ۔ اُس کے باپ نے اس کی سالگرہ پر اسے بی یم وی کی ایک اسپورٹس کار دلائی ہے ۔ کم عمری کی وجہ اسے ابھی کار چلانے کی اجازت نہیں ہے ۔ اس کا شوفر ڈرائیور ایک دن وہ کار اسکول لے آیا ۔ لپ اسٹک کے رنگ کی طرح سُرخ ۔ جیسے ہی اسے لائسنس ملے گا ہم لوگ ہر اتوار کو پٹایا کے ساحل پر جایا کریں گے ۔ یہ ساحل بنک کاک سے تھوڑے ہی میل کے فاصلے پر ہے ۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اس کا بوائے فرینڈ ہے ۔

لیکن چند صفحات سے آگے اُس کی کلاس کی فوٹو میں وہ پہلی ہی قطار میں سب کے بیچ نظر آیا ۔ چوڑے شانوں کا سب سے اونچا قد لیے اپنے دونوں ہاتھ مسکراتی ہوئی حسیناؤں پر رکھے کھڑا ہے ۔ اس سے قبل کہ وہ صفحہ اُلٹتی میں نے اُچٹتی نظروں سے اس کی تصویر بھی دیکھ لی ۔ پچھلی قطار کے آخر میں سیدھا سادہ اسکرٹ زیب تن کیے وہ چپ سادھے کھڑی تھی ۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک کتاب تھی ۔ اس نے محسوس کر لیا کہ یہ تصویر میں نے دیکھ لی ہے ۔ ایک ہفتہ بعد جب دوبارہ اُسی سالنامے کو کھولا گیا تو میں نے وہ صفحہ غائب پایا ۔ میں نے اپنے گلے میں خراش محسوس کی ۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں تھی لیکن میری اپنی چھوٹی سی اخلاقی اصولوں کی پابند دنیا تھی جہاں بچوں کو اس تاکید کے ساتھ اسکول بھیجا

جاتا تھا کہ وہ نیک رہیں اور امتحان گاہ میں اپنے چال چلن ثابت کریں۔

الا کے لیے وہی اسکول سب کچھ تھے۔ دوسرے مقامات کی یادیں تو اُس کے ذہن سے ایسے محو ہو جاتیں جیسے پرانی فلموں میں اسٹوڈیو کے پردے پر دوڑتی ہوئی کاروں کی کھڑکیوں سے کوئی جھانک رہا ہو۔

ایک دن لندن میں میں نے اس کے سامنے یہ بات چھیڑی۔ روبی، وہ اور میں ایک پب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پب کا نام کیمبلس ہیڈ تھا۔ یہ لانگ ایکر کے علاقے میں تھا اور کوونیٹ گارڈن سے بہت ہی قریب۔ روبی نے جو انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس سے وابستہ تھا رخصت لے رکھی تھی تاکہ ایڈمنسٹریشن اور فیلوشپ کا چھ ماہ کا کورس پورا کر سکے۔ ہم نے وہ شام ایک ساتھ گزارنے کا طے کیا۔

جب میں نے اُن سالناموں کا ذکر کیا تو الا ہنس پڑی اور وہسکی کی ایک چسکی لیتے ہوئے اس نے کہا۔ سچ ہے کہ وہی اسکول میرے لیے بہت اہم تھے۔ کسی بھی بچے کے لیے اسکول ہی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہ فطری بات ہے۔ ایک تم ہی عجیب نکلے۔ اس چھوٹے بے کیف فلیٹ میں پڑے رہتے اور دُور دُور کے مقامات پر خواب دیکھتے ہو۔ میں نے تمہارے حق میں اچھا ہی کیا۔ کم از کم تمہیں احساس تو ہوا کہ وہ مقامات حقیقت میں موجود ہیں جنہیں تم نے صرف نقشوں میں دیکھا ہے۔ وہ کوئی پرستان تو نہیں تھے جن کی سیر تردیب نے تمہیں کرائی تھی۔

لیکن وہ کیا جانے تردیب ایک اکیلا لوجسٹ بھی تھا۔ اسے پرستانوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ جو گر وہ مجھے سکھانا چاہتا تھا وہ گُر تھا تخیل کا صحیح استعمال۔

ایک واقعہ سن لیں میں اور الا دس برس کے تھے۔ وہ چھٹیوں میں کولمبو سے اپنے خاندان کے ساتھ کلکتہ آئی ہوئی تھی۔ ایک دن تردیب اور وہ ہمارے ہاں مہمان آئے۔ اُس

کی ماں جانتی تھی کہ نئے مقامات کے ذکر سے میں خوش ہو جاتا ہوں۔ اس نے اِلا سے کہا کہ اپنے مکان سے متعلق کوئی دلچسپ کہانی مجھے سنائے۔ اُن کا مکان کولمبو کے ایسے پرُسکون علاقے میں تھا جہاں حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور ڈپلومیٹس رہا کرتے تھے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پر ہر بنگلے میں بڑے بڑے باغیچے تھے۔ سڑکوں کے دونوں طرف سُرخ گل مہر اور زرد جکارانڈا کے پھولوں سے لدے درخت۔ ان کا مکان ایک خاموش گلی کے کونے پر تھا۔ بہت بڑا مکان۔ کشادہ ورانڈے۔ چھت کے سلوپ پر کویلو کے طرز کی تعمیر۔ پیچھے باغیچہ ایسے لگتا تھا کہ گھر کے اندر سے پھیلا ہے۔ فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں کو جب کھولا جاتا تو گویا ڈرائنگ روم کی چھت سیدھے لان میں دکھائی دیتی۔ یہ باغ الگ تھلگ۔ تانبے کے چھوٹے چھوٹے کھمبے جو ایک بچّے کے قد سے اونچے تھے کونوں میں گڑھے ہوئے بڑے خوبصورت لگتے۔ بیچ میں اودے رنگ کے ٹائلس کا بنا ہوا ایک للی پانڈ تھا جس میں پنکھے جیسی دم کی سنہری رنگ کی مچھلیوں کے سپید شکم سورج کی روشنی میں چمک اٹھتے۔

صرف ایک خرابی تھی۔ اس سے لگے ہوئے باغ کے پیچھے ایک پولٹری فارم تھا۔ ان کی ماں اس سے بہت نالاں تھی۔ پولٹری کی بدبو کے علاوہ اُسے اس بات کی فکر دامن گیر تھی کہ ایسی جگہوں پر سانپ آتے ہیں جہاں مرغ ہوتے ہیں باوجود یہ کہ مکان چاروں طرف سے اونچی دیواروں سے گھرا تھا۔ اگر ہوا کا رُخ میری ہوتا تو یہاں کی ہوا کسی جاپانی باغیچہ کی طرح معطر ہوتی۔

اس مکان میں منتقل ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک صبح اِلا کی ماں اپنی آرام کرسی پر دوپہر سے پہلے کا قیلولہ کر رہی تھی کہ اُن کا باورچی رام دیال چیختا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر آیا اور ہکلا کر کہنے لگا۔

مگ ــــ گر ــــ مچھ۔ بڑی میم صاحب مجھے بچا لو۔ اس مگرمچھ سے۔ وہ ادھیڑ بلورا چھریرے بدن کا تھا لیکن اکڑ اور تکڑ والا شخص۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ہونٹ کانپتے ہوئے اودے ہو گئے تھے۔

اِلا کی ماں نے کہا۔ ایسا واقعہ میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ مگرمچھ ہمارے باغ میں میں تو ایسی

آرام کرسی سے تقریباً گر پڑی تھی۔

میری دادی ماں اور میں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ اس واقعہ کے بعد جب بھی اِلا کی ماں کا خیال آیا تو وہی منظر ہماری آنکھوں کے سامنے گھومتا۔ گول مٹول جسم جیسے کسی اسکول بیاگ میں ڈبل روٹی رکھ دی گئی ہو۔ اپنے باغ میں مگرمچھ کی موجودگی کے خیال سے آرام کرسی سے گر پڑ رہی ہے۔ ہم لوگ اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔

اس نے کہا تھا: اس مرد کی حالت تو غیر تھی۔ اُس نے ایسی چیز کبھی دیکھی نہیں تھی۔

لیکن وہ تو عورت تھی۔ اپنے منحنی ہاتھوں کو اس نے گود میں رکھ لیا۔ سر کو جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے کیا اور متانت سے کرسی پر پہلو بدلتی رہی۔ ہم سب اُس کے اس انداز سے واقف تھے۔ اسی لیے ہم نے اس کا نام کوئین وکٹوریہ رکھ دیا تھا۔

ہاں تو کوئین وکٹوریہ نے جھڑک کر کہا تھا۔ بک بک نہ کر۔ چھوکرے کی طرح۔

دیکھو، برامیم صاحب۔ اُس نے ڈوبتی آواز میں کہا تھا۔ وہ وہاں باغ میں۔

کوئین وکٹوریہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ وہ سچ مچ وہاں تھا۔ ایک بہت ہی بڑی چھپکلی کی شکل میں بھورا اور سیاہ۔ گندہ قوی ہیکل۔ نکیلا سر اور زبان جوتے کی ڈوری کی طرح۔ میرے باغ میں اس طرح گھوم پھر رہا تھا جیسے کسی جم خانے میں کوئی گورنر۔

وہ خود ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جس نے اپنا گاؤں بیس سال جب چھوڑا تھا تو وہاں سے پھٹے پرانے کپڑوں میں روانہ ہوا تھا اور ایک انتہا کو پہنچ کر انڈین سول سروس میں نائٹ ہُڈ کا خطاب پایا تھا۔ اس لیے کوئین وکٹوریہ نے بڑے اطمینان سے ساری باتیں سُنائیں تھیں۔

رام دیال مار و اسے۔ اِلامیم صاحب کے دیکھنے سے پہلے اسے پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

(کئی برسوں بعد اِلا نے مجھ سے کہا تھا کہ ماں تو ایسے کہہ رہی تھی جیسے وہ مگرمچھ نہ ہوا ایک لِنگ ہوا)

لیکن رام دیال اپنا سر دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں

تھیں اور آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔ میں لنکا کیوں آیا۔ اُس نے اپنے آپ کو کوسا۔ مجھے معلوم تھا کہ راون مجھ پر حملہ کرے گا۔

چُپ رہ رام دیال۔ کوئین وکٹوریہ نے ڈانٹا۔ پھر اُس نے پیتل کی وہ گھنٹی بجائی جو لزا کو بلانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ لزا ایک سنہالی عورت تھی جو حال ہی میں اِلا کی آیا مقرر ہوئی تھی۔

آئی مادام۔

لزا نے دروازے ہی سے آواز دی۔ وہ ایک درمیانی عمر کی عورت تھی مضبوط ذہن۔ چھوٹا سا چہرہ، صاف ستھرا لباس۔ ساڑی کندائن پہاڑی کی تھی جو اُس کا وطن تھا۔

کوئین وکٹوریہ نے یوں ہی ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لزی، دیکھو۔ اُدھر باغ کی طرف دیکھو۔

اس وقت دھوپ کھانے کے لیے وہ جانور اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا۔

لزی دیکھو۔ کتنا ہیبتناک جانور ہے۔ کوئین وکٹوریہ نے کہا۔ لزی انگریزی اچھی طرح بولتی تھی۔ اسے ہندی بھی آتی تھی لیکن کوئین وکٹوریہ نے اُس سے انگریزی میں بات کرنے کی ایک نئی زبان ایجاد کی تھی۔

لزی نے اس کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔

اسے بھالا گو یا کہتے ہیں مادام۔ یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے اور ایک بھلا مانس جانور ہے۔

کوئین وکٹوریہ نے اُس رینگنے والے جانور کو گھورا اور کہا۔

بھلا مانس کیسے ہوا۔ کمبخت تو دیکھنے میں ڈائنوسار کی طرح ہے۔ پھر اُس نے لزی کی طرف پلٹ کر کہا۔

ناممکن۔ یہ چیز۔ بس اسے مار ہی ڈالو۔

اسے مار ڈالیں۔ آپ نہیں جانتیں مادام۔ ان کی بدولت سانپ نہیں آتے۔ یہ کہہ کر لزی نیچے دوڑی۔ چند منٹوں بعد اس کے ہاتھ میں گوبھی اور دیگر ترکاریاں تھیں۔ اُس نے

اُنھیں گھاس پر پھیلا دیا۔ جانور آگے بڑھ کر انھیں کھانے لگا۔

ہائے۔ ھے۔ ھے۔ رام دیال چلّانے لگا۔ ہائے۔ ھے۔ ھے۔

لزّی کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے اب کوئین وکٹوریہ خود اُٹھی۔ کچھ ترکاریاں لے کر باغ میں پہنچی۔ جوں ہی اس نے لان میں قدم رکھا مگرمچھ اس کو دیکھنے لگا۔ وہ ہیبت میں ٹھنڈی پڑ گئی لیکن جلد ہی اپنے پر قابو پاتے ہوئے اُس نے ترکاریاں اُس کے سامنے پھینک دیں۔ کھا۔ کھا۔ ترکاری کھا۔

جانور نے اپنی دُم ہلائی اور مانوسیت کا اظہار کیا۔ اس دن کے بعد سے وہ جانور گھر کا ایک حصّہ بن گیا۔ اُس کی مانوس آوازیں پچکارنے پر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

اُس واقعہ کے بعد اُس کے واقف کار سنہالیوں نے اُس سے کہا کہ اتنے بڑے جانور کو اُس کے لان پر دیکھ کر انھیں تعجب ہوا۔ لیکن یہ بات خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ یہ جانور اپنی دُم سے مار کر بچّوں کی پنڈلیاں توڑ دیتے ہیں۔ پھر بھی اُس نے اس جانور کو اپنے لان پر گھومنے پھرنے دیا لیکن جب کبھی پارٹیوں کی دعوت ہوتی تو لزّی سے کہہ کر اسے رسّی کے ذریعے کسی درخت سے بندھوا دیتی۔

ایک دن ہوا یوں کہ پچھلی رات پارٹی ہو چکی تھی۔ جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لان میں ادھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ صبح صبح اِلا اٹھی اور جس کتاب کو اُس نے رات میں ادھورا چھوڑا تھا اُسے پورا کرنے کے لیے باغ میں آئی۔ صرف بیس صفحے باقی رہ گئے تھے۔ اگر لزّی نے لائٹ آف نہ کی ہوتی تو رات ہی میں وہ پوری کتاب پڑھ لیتی۔ وہ پانڈ کے سامنے بیٹھ کر کتاب پڑھنے میں غرق ہو گئی۔ ابھی دس صفحے ختم کیے تھے کہ اس نے پانڈ کے اندر ایک ہلکی آواز سُنی ایک ایسا تھپیڑا جیسے کسی مچھلی نے اپنی دُم سے پانی پر مارا ہو۔ اِلا نے اپنی نظریں اُٹھائیں اور پانڈ کی طرف دیکھا۔ وہ پانی پہ ایک سایے کی طرح بڑھ رہا تھا۔ ایک پیچدار بیل کی طرح۔ دیکھتے ہی دیکھتے لان کے کنارے سے کوئی چیز اس کی کرسی کے نیچے آ گئی۔ اس بار اِلا نے غور سے دیکھا تو وہ اسے گوشت پوست سے بھرا جسم نظر آیا۔ اتنا لمبا کہ ایک حصّہ پانڈ میں تھا اور دوسرا اس کی کرسی کے نیچے۔ وہ گھبرا گئی۔ کتاب

اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور کرسی سے پھسل کر اس کے جسم پر گری۔ ہٹپ کی آواز کے ساتھ اس جسم نے پھریری لی۔ اِلا نے دیکھا کہ ایک لمبا سانپ اپنا سر اُٹھائے اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ اُس نے ہِس کی ایک اونچی آواز سُنی۔ خوف و ہراس سے اس کی سانس رُک گئی۔ رگ پٹھوں میں تناؤ آگیا۔

سانپ اِلا سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنے جسم کا چٹلا بنایا ہوا تھا اور سر اُٹھا ہوا۔ اِلا کی کرسی سے اونچا۔ اِلا کانپنے لگی۔ اُس نے چیخ کر کسی کو بلانا چاہا لیکن اُس کی پوری توجہ سانپ ہی کی طرف تھی۔ اس قدر قریب جیسے کوئی ٹیلی سکوپ سے دیکھ رہا ہو۔ سانپ کا سر اُس کی آنکھیں نتھنے، نکیلا منہ، لپکتی ہوئی زبان، زہریلے دانت اور رال ٹپکتی ہوئی۔

اُسی لمحہ اِلا نے باغ کے دوسرے کونے سے ایک آواز سُنی۔ اپنا سر موڑے بغیر اُس نے دیکھا کہ درخت سے بندھا ہوا تھا لاگو یا رسّی توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سانپ نے بھی یہ آواز سُنی۔ وہ ایک لمحے کے لیے اِدھر اُدھر ہلا۔ اِلا پر نظریں جمائے وہ اپنے سر کو پیچھے کی طرف کرنے لگا۔ یہاں تک کی اُس کی گردن ایک کمان کی طرح جھک گئی اور وہ وہاں سے کھسکنے لگا۔

اب اِلا نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سنبھل نہ سکی۔ وہ گری تو اُس کے ساتھ کرسی بھی لڑھک گئی۔ سانپ کی نظر کرسی کے بازو پر پڑی جو اسٹیل کے بنے تھے۔ وہ پیچھے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِلا نے اپنے کو سنبھالنا چاہا لیکن اس کے ہاتھ پھسلے اور وہ دوبارہ گر پڑی۔ سانپ نے اپنا سر گھاس پر رکھ دیا اور بڑی تیزی سے دیوار کی طرف جانے لگا۔ مچلتے ہوئے تھا لاگو یا کی طرف اِلا نے دیکھا تو وہ رسّی کو اپنے دانتوں سے کاٹ کر آگے بڑھ رہا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ لان پار کر کے سانپ تک پہنچتا سانپ بڑی پھُرتی سے دیوار پار کر چکا تھا۔

قصّہ تمام ہوا تو کوئین وکٹوریہ نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "مُنّے بتاؤ یہ سب تمہیں کیسے لگا۔"

میری نظریں اپنے آپ تردیب کی طرف اُٹھیں۔ وہ اپنا سر اونچا کیے میری طرف دیکھ

رہا تھا۔ میں کچھ پریشان ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا جواب کیا ہوگا۔ میں اُسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری دادی اور ماں کچھ خوف اور کچھ حیرت سے کوئین وکٹوریہ سے سوال کر رہے تھے۔

سانپ کتنا بڑا تھا۔ کیا وہ زہریلا تھا۔ اِن باتوں سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ تردیب کو خوش کرنے کا موقع بھی مجھے ہاتھ آیا۔ اس کی سکھائی ہوئی باتیں مجھے اچھی طرح یاد تھیں۔ میں نے کوئین وکٹوریہ سے سوال کیا۔

کیا وہ سانپ زہریلی نسل کا تھا جنھیں لواڑے کہتے ہیں یا ابلا پڈے کی غیر زہریلی نسل سے اُس کا تعلق تھا۔

کوئین وکٹوریہ نے میری طرف آنکھیں گھما گھما کر دیکھا اور کچھ اس طرح بڑبڑائی۔ وہ کسی بڑی نسل ہی کا پٹھا لگتا تھا۔ اب میں یہ تفصیلات کیا جانوں!

وہ کہہ رہی تھی اور میں نظریں چُرا کر تردیب کو دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے ہونٹوں کو دبائے سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں چپ ہوگیا۔

جب ہم لوگ انھیں رخصت کرنے کے لیے سیڑھیاں اُتر رہے تھے اور جب اِلا اور اس کی ماں خدا حافظ کہنے لگے تو تردیب نے مجھ سے کہا۔ غور کرو تو سانپوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اگر مجھے کوئی سانپ جھیل میں نظر آ جائے تو میں کیا کروں گا۔ شاید گھر پہنچ کر یہ بات سب کو بتاؤں گا۔ لیکن چند منٹ بعد سب کچھ بھول کر اپنے ہوم ورک میں لگ جاؤں گا۔ سانپوں سے میری زندگی کا تعلق ہی کیا ہے۔

اس مشورے پر میں نے دھیان نہیں دیا کہ ہوم ورک کا میری اصل زندگی سے کیا تعلق ہے۔ بہرحال میں چپ رہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا۔ جب ہم نیچے کے فلور پر پہنچے تو اس نے پوچھا۔ کیا تم نے غور کیا کہ اِلا کے مکان کی چھت ڈھلوان ہے۔

میں نے اپنے سر ہلایا۔ یہ تفصیل میرے ذہن میں نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کا کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس نے میرے چہرے سے تاڑ لیا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا مجھے اپنی طرف کھینچا۔ پھر کہنے لگا۔ تم اندازہ کرو کہ ایک ڈھلوان چھت کے نیچے زندگی گزارنا

کیسے لگتا ہوگا۔ پتنگ اُڑانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ گوشہ نشینی کی بھی گنجائش نہیں۔ چیخ کر اپنے کسی دوست کو بلانا بھی ناممکن۔

یہ کہہ کر وہ کار میں بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے اندر سے ہاتھ نکال کر میرا سینہ ٹھونکا۔ میں مزید بھونچکا رہ گیا۔

لیکن بعد میں اُس شام اور اس کے بعد کئی اور شاموں میں اپنی دادی کے سامنے بیٹھا ہوم ورک کا بہانہ لیے تردیب کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ کولمبو میں بنے ہوئے ڈھلوان چھتوں کے بارے میں۔ وہ آسمان کے ڈھلوان کی طرح تو نہیں؟ ان پر کویلو کس طرح رکھے ہوں گے کوئی اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھے تو وہ کیسے لگتے ہوں گے۔ بہت جلد مجھے لگا کہ سانپوں اور چھپکلیوں سے زیادہ دلچسپ تو یہ چھت ہوں گے۔ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بدولت۔

تاہم میں جانتا تھا کہ تردیب کے ذہن میں اس کا نقشہ بہت تفصیلی ہوگا۔ اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ سچی لگن کے بغیر کوئی شخص کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ لگن کا مطلب لالچ ہے نہ کوئی لذت حاصل کرنے کی خواہش بلکہ ایک سچی اور بنیادی لگن جسے حاصل کرنے کے لیے آدمی کو ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جسم و جان کی تکلیف اٹھانا چاہیے۔ اپنے ذہن کو وسعت دینا چاہیے۔ اُسے بند خانوں سے نکال کر زمانوں اور مکانوں کی سیر کرانا چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنی ذات اور آئینہ میں اس کے عکس کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہ رہے۔

حیرت سے میں سنتا رہا۔ کیا میں ان باتوں سے کبھی آشنا ہو سکوں گا؟ مجھے یقین نہیں تھا؛ کہ اس طرح کی خواہش مجھ میں کبھی پیدا ہوگی۔

کیمبلس میڈ میں بیٹھی وہسکی کی چسکی لیتی ہوئی الا کو میں یہ ساری باتیں کیسے بتا سکتا تھا۔ وہ تو انھیں لمحات میں جینے کی قائل تھی جو اس کے سامنے تھے۔ کیسے یقین آتا کہ تردیب جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو دنیا کو اپنے تخیل کے روپ میں دیکھتے ہیں اور اپنے ذہن میں ان کے لیے مستقل جگہ بنا لیتے ہیں۔ الا کے ذہن میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ

ہر بات کو یاد رکھ سکتی۔ یہاں تک کہ اُس وقت بھی وہ جذبات سے عاری تھی جب وہ اپنے پچھلے عاشق کی ٹانگوں کا ذکر کر رہی تھی۔ صرف لفظ تھے۔ بھلا دیئے جانے والے لفظ بالکل اُسی طرح جس طرح وہ اپنے عاشق اور اُس کی ٹانگوں کو بھلا دیتی تھی۔

اِلا کے لیے حال ہی سب کچھ تھا۔ اس کے حال کی دنیا بھی کسی کنال میں بند ایر لاک کی طرح تھی جو فولادی سلاخوں میں مقفل پانی کے اُتار چڑھاؤ سے واقف نہیں ہو سکتا۔ نہ تو ماضی کا نہ مستقبل کا۔

میرے لندن پہنچنے کے چند دنوں بعد ایک دن وہ مجھے سیر کرانے کے لیے کوونیٹ گارڈن لے گئی۔ ہم لوگ ٹیوب اسٹیشن پر ملے اور وہ مجھے بڑے شوق سے ٹن کے بڑے چھت والے ایک پزا میں لے گئی۔ ہم لوگ پرانے کپڑوں کی دکانوں سے ہو کر ترکاری کی دکان پر آئے۔ وہ تو ان سے پہلے سے واقف تھی۔ میری اکتاہٹ کو اُس نے محسوس کر لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ میری بہت سیر کرا چکی ہے۔ اس لیے وہ چیرنگ کراس جانے والی سڑک کی طرف مڑی اور نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ اتنے میں میری نظر سائن بورڈ پر پڑی۔ میں دوڑ کر اس کا پیچھا کیا اور اُسے واپس لاکر وہ سائن بورڈ دکھایا۔

اس پر وکٹر گولانز لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ کیا مطلب؟

جواب دینے کے بجائے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے دروازے کے اندر لے گیا جہاں لکڑی کا ایک کاونٹر تھا اور دوسری طرف دیوار سے لگا ایک کیا بنٹ کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ کاونٹر کے پیچھے ایک معمر خاتون بیٹھی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنی عینک کے اوپر سے میری طرف دیکھنے لگی۔

کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ اُس نے کہا۔

میں نے پوچھا جنگ سے قبل یہاں ایک لفٹ بک کلب تھا۔ کیا یہ وہی جگہ ہے؟

پیارے شاید تم نہیں جانتے کہ ان دنوں میں یہاں نہیں تھی۔ میں ڈاکٹر کو فون کر کے پتہ لگاتی ہوں۔

میں نے اپنا سر ہلایا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اِلا کو لے کر باہر نکل گیا۔ خفا ہوتے

ہوئے اِلا نے کہا۔
یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟
باہر جب ہم فٹ پاتھ کے ایک کونے میں بیٹھ چکے تو میں نے تردیب کی کہی ہوئی باتیں اسے یاد دلانا چاہیں۔
اُس نے کہا تھا مسز براُنس کا بھائی الان تریساسن جنگ سے قبل لیفٹ بُک کلب میں کام کرتا تھا۔ یہ جگہ یہیں کہیں ہوگی۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے یہ وہی جگہ ہو سکتی ہے اس لیے کہ وہ کلب وکٹر گولانز کے اشاعتی ادارے کا ایک حصّہ تھا۔۔۔
اِلا نے کھڑکی کی طرف دوبارہ دیکھا۔ اپنے کاندھے ہلائے اور کہا۔ یہ تو جالے پڑے ہوئے قدیم آفس کی طرح ہے۔ تم نے اسے تردیب کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمہیں اس کا حال بھی اس کے ماضی ہی کی طرح لگتا ہے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اِلا کی طرف دیکھا۔ اُس کے پھیلے ہوئے چہرے اور رخساروں کی طرف۔ اُس کی گہری بھوری آنکھوں کی طرف۔ اُس کے سیاہ چمکتے ہوئے بالوں کی طرف جو اُس کے شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے میری نظروں کو بھانپ لیا اور مسکرا کر اپنی باہیں میری باہوں میں ڈال دیں پھر مجھے لے کر نیل اسٹریٹ جینیز کی طرف بڑھی جسے وہ پہلے سے جانتی تھی۔
اب میں سوچنے لگا کیا یہ وہی اِلا ہے کہ بچپن میں ہمارے بارے میں لوگ کہا کرتے کہ ہم دونوں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ ہمارے جڑواں ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اب اس نے مجھے اپنے مختلف ہونے پر اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔

ٹامی اور سوٹ میں ملبوس بینکروں اور ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی بالیاں پہنے پبلشروں کی سکریٹریوں سے جب پب بھر گیا تو میں نے اِلا اور روبی کو تردیب کے بارے میں بتانے کی کوشش کی جو آرکیالوجی میں ماہر تھا اور ایسے پرستانوں کی سیر کرا سکتا تھا جہاں

تک اِلا کبھی پہنچ نہیں سکتی تھی۔ اُسی تردیب کے بارے میں جس نے مجھے کولمبو کی سیر کرائی تھی۔ وہی تردیب جس نے کہا تھا کہ ہم جو کچھ اس دُنیا میں دیکھتے ہیں اس کی خیالی عکاسی بھی ہونی چاہیے۔ اس احساس کے بغیر ہمارا کسی چیز کو دیکھنا فضول ہے۔ اِلا نے اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ہم ایسی کوشش کیوں کریں۔ دُنیا کو اسی حالت میں کیوں نہ دیکھیں جیسی وہ نظر آتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ کوئی خیالی بلاؤ نہیں ہے۔ اگر ہم خود کوشش نہ کریں تو دوسروں کے اختراع کردہ خیالات کے اثر سے ہم کبھی آزاد نہ ہو سکیں گے۔

میں تو آزاد ہوں۔ اُس نے ہنس کر کہا۔

میں نے جواب دیا۔ تم خوش نصیب ہو۔ میں تو ایسا نہیں۔ کم از کم لندن میں رہ کر تو نہیں۔

کیوں؟ اُس نے وہسکی کا گلاس حلق میں اُتارتے ہوئے کہا۔ برٹش راج کی وجہ سے۔ میں ہنسنے لگا۔ اس لیے بھی کہ وہ بھول چکی تھی۔ میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی کہ جب ہم ابھی آٹھ سال کے تھے تو خود اُس نے میرے لیے ایک لندن ایجاد کیا تھا۔

اُن دنوں اِلا کی فیملی دُرگا پوجا کے لیے کلکتہ آئی ہوئی تھی۔ کئی برسوں بعد اُس کے دادا دادی بھی یہاں آنے والے تھے تاکہ سب مل کر ایک ساتھ تہوار منائیں۔ اِلا کے باپ کو یونین سے ہفت سالہ چھٹیاں ملی تھیں۔ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اُس نے شمالی انگلستان کی ایک یونیورسٹی میں پڑھانے کی نوکری قبول کر لی تھی۔ یہاں ڈیولپمنٹ اسٹڈیز کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ وہ خوش تھے لیکن جب وہاں پہنچے تو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جو مکان رہنے کو ملا تھا وہ ناکافی تھا۔ اس کے وہ عادی نہ تھے۔ کوئین وکٹوریہ کو اُن چھوٹے کمروں میں رہنا کسی طرح پسند نہ تھا۔ وہ دن بھر کیا کرے گی۔ ایک ایسی خشک جگہ جہاں فیکٹریوں کی بھرمار ہو اور جہاں تکلیف دہ ٹھنڈی ہوائیں۔ بہتر تو تھا کہ وہ لندن ہی میں رہتی لیکن وہ لندن میں کہاں رہے اور اِلا کس اسکول میں پڑھے۔

وہ اسی گومگو میں تھے کہ مسز پرائس وہاں آموجود ہوئی۔ اس خاندان کو لندن میں اپنا کرایہ دار بنانے کا پیش کش کیا اور کہا کہ ہفتہ کی ہر چھٹی میں وہ لوگ جا سکتے ہیں۔ انھیں اپنے

گھر میں جگہ دے کر اسے خوشی ہوگی۔ اسٹائپ کو گزرے دو سال ہو چکے تھے اور اُس وقت سے مکان بالکل خالی پڑا تھا۔ اب تو مٹے بھی وہاں سے جائے گی تو مکان بالکل خالی رہے گا۔ اسکول سے متعلق کوئی نہ کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔ وہاں قریب میں کئی اسکول تھے۔

اس طرح چھٹیوں میں کلکتہ آنے سے قبل مسز پرائس کے اُسی مکان میں جو ویسٹ ہمپٹڈ میں تھا کوئین وکٹوریہ اور اِلا رہا کرتے تھے۔ مسز پرائس نے اپنے بیٹے کے ساتھ اِلا کے اسکول جانے کا انتظام کر دیا تھا۔

وہ لوگ تہوار شروع ہونے سے چند دن قبل ہی کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ جوں ہی وہ پہنچے کوئین وکٹوریہ نے میری ماں کو فون کیا اور ہم سب کو اُن کے راسے بازار والے آبائی مکان پر مدعو کیا۔ میں، میرے ماں باپ اور دادا دادی سب ہی مدعوین میں شامل تھے۔

میری ماں بہت خوش تھی۔ وہ دُور دُور تک موٹر میں سفر کرنا پسند کرتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میرے والد کو جس ربر انڈسٹری میں وہ کام کرتے تھے ایکزیکیوٹو کی حیثیت سے کچھ ہی دنوں میں ترقی ملنے والی تھی۔ ان کے لیے اتوار کی چھٹی میں باہر جانا مشکل تھا اور ہمارے پاس کوئی کار تھی نہ اتنا پیسہ کہ ٹیکسی لیتے۔ ہم لوگ کہیں جا نہ پاتے۔ جب میری ماں اجازت لینے کے لیے میری دادی کے پاس پہنچی تو اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ میری دادی اپنی میز پر بیٹھی اسکول کی کاپیوں کی تصحیح کر رہی تھی۔ میری ناک کو اپنی چٹکی سے پکڑتے ہوئے میری ماں نے چپکے سے پکنک پکنک اس طرح کہا کہ دادی کو سنائی نہ دے۔

دادی کے کان میں یہ بات پڑی تو وہ غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ اسے جان لینا چاہیے کہ کوئین وکٹوریہ نے ہمیں اس لیے بُلایا ہے کہ اُسے اپنی بیٹی اِلا کے ساتھ کھیلنے کے لیے کوئی ساتھی مل جائے۔ ہم لوگ ایسے گئے گزرے نہیں کہ اس کی بات پر دوڑ پڑیں۔

میری ماں کی مایوسی کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ اُس کے ہاتھ کی انگلیاں میرے کاندھوں میں دھنسنے لگیں۔ وہ کہہ اُٹھی۔ موٹر میں بیٹھ کر اُن کے ساتھ جانے میں تو کوئی خرابی

نہیں ہے۔ لیکن میری دادی کی گھورتی ہوئی نظروں کو دیکھ کر وہ چپ ہوگئی۔ تب میں دادی کی میز تک گیا اور وکالت کرنے کے بجائے میں نے اسے یاد دلایا کہ کس طرح میرا باپ پچھلے سال اِلا کو میرے ساتھ چڑیا گھر لے گیا تھا اور کس طرح خود اس نے کاریہات فش مارکٹ سے لائی ہوئی مچھلیوں کے کباب بنا کر کوئین وکٹوریہ کو کھلائے تھے۔ تب وہ آمادہ ہوئی۔ میری دادی نے صرف مجھے ہی بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ میرے دادا کی بے وقت موت نے اُسے ایک اسکول ٹیچر بننے پر مجبور کر دیا تھا تاکہ میرے باپ کو وہ لکھا پڑھا سکے۔ اس نے بڑے صبر کے ساتھ اپنی دولت مند بہن کے تکبّر کو ٹھکرایا تھا اور اس کی مدد حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح میں جانتا تھا کہ وہ کسی کا احسان ہرگز قبول نہ کرے گی خاص طور پر ایسے لوگوں کا جن کے احسان کا بدلہ چکایا نہ جا سکے۔

دو دن بعد ایک صبح میں، میری دادی اور میرے ماں باپ ہم چاروں گول پارک تک چل گئے۔ وہیں پر اُن سے ملنا طے تھا۔ شیوستی پوجا سے ایک دن قبل کی بات ہے۔ اکتوبر کے دنوں کی سنہری شعاعیں گلیوں میں پھیل رہی تھیں۔ گرمی کے موسم جیسی سختی دھوپ میں نہ تھی۔ جگہ جگہ دیویوں کو بٹھانے کے لیے پنڈال ڈالے جا رہے تھے کہیں کہیں لاؤڈ اسپیکر کا شور تھا۔

رام کرشنا بلڈنگ کے ... فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ہم لوگ انتظار کرنے لگے۔ پاس میں مٹھائی کی دکان کو دھویا جا رہا تھا۔ گاریہات مارکٹ سے خرید و فروخت کرنے والوں کی آمد و رفت سے گرد اُڑتی جا رہی تھی۔ لوگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے حالانکہ تازی تازی سبزیاں اور مچھلیاں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ اتنے میں میں نے گاریہات روڈ سے ہو کر ہماری طرف آتی ہوئی اُن کی اسٹوڈ بیکر دیکھی۔ اِلا سے دوبارہ ملنے کی خواہش نے مجھے بے چین کر دیا۔ اُچھلتا کودتا ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ دیکھو وہ آ گئے ــــ اُدھر دیکھو تو ــــ

میری اُنگلی کے اشارے کی طرف دیکھتی ہوئی میری دادی نے کہا۔ "مجھے مایا دکھائی پڑتی ہے لیکن صاحب کہاں ہے؟ میری دادی اپنے جیجا جی، مایا دیبی کے شوہر کو اُس وقت سے

صاحب کہا کرتی تھی جب سے اُس نے ان کی ماں کو ایسا ہی کرتے ہوئے سُنا تھا۔ بڑے فخر سے وہ کہا کرتی تھی کہ ان کا بیٹا اس قدر یورو پین ہو گیا ہے کہ کبھی اپنے سر سے ہیٹ اُتارتا ہی نہیں۔ خود اُن سے بات کرتی ہوئی بھی وہ انھیں صاحب ہی کہتی۔ یہ میرے باپ کو ذرا بھی بُرا نہ لگتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہی بڑی احتیاط سے اپنے دوستوں میں اپنے ساڑھو کے بارے میں کہتے کہ وہ اُن کے میشو موشھای ہیں۔ ہز ایکسیلینسی صوفیہ ہیں متعین انڈین کونسل جنرل (یا وہ جہاں بھی متعین ہوتے) شری ہا گھشو شیکھر دتّا چودھری۔

وہ رہے وہاں —— میری دادی نے کہا۔ پچھلی سیٹ پر ٹیک لگائے پائپ پیتے ہوئے جیسے مملکت کے کسی کام پر آئے ہوں —— انھوں نے آج کون سا یونیفارم پہنا ہوگا۔

میری دادی کا خیال تھا کہ ان کا وارڈ روب کئی حصّوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصّے پر لیبل لگا دیا گیا ہے۔ کلکتہ زمیندار، ہندوستانی ڈپلومیٹ —— انگریز جنٹلمین —— ہونے والا نہرو، سوسائٹی کلب ٹینس کھلاڑی، غیر جانبدار اسٹیٹس مین وغیرہ وغیرہ۔ یہ سچ ہے کہ صاحب اپنے لباس اور اپنی وضع قطع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کی دھوتی کا پر دکڑک اور سیدھا ہوتا قمیض کا بٹن اس طرح کھلا ہوتا کہ کاجے کا کلا مثلث شکل اختیار کرتا۔ لوگاز میں ان کے سفاری سوٹ کے پاکٹ ذرا بھی بھونڈے نہ ہوتے۔ وہ سوٹ اس طرح پہنتے جیسے اُن کے جسم پر مولڈ کر دیا گیا ہو۔ وہ جو بھی پہنتے لگتا کہ کہیں پریڈ میں حصّہ لینے جا رہے ہوں۔ وہ کسی دکان میں نمائش کے لیے لگائے گڈّے کی طرح لباس پہنتے۔ اسی لیے میری دادی کہا کرتی۔ کیا تعجب ہر شخص انھیں کو دیکھ رہا ہو۔

یہ کوئی انصاف کی بات تو نہ تھی۔ لوگ شاید ان کی طرف اس لیے دیکھتے کہ ان کے دکھاوے میں ایک انداز اور ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ قد آور اور چھریرا بدن، لمبا چہرہ، متوازن ناک، گہری چمکتی آنکھیں، گھنی زلفیں جو بازوؤں سے ایسے سفید لگ رہی ہوتیں جیسے دھند میں سفید چمکتی دھات۔ وہ جہاں بھی جاتے لوگ مُڑ مُڑ کر اُن کی طرف دیکھتے جیسے وہ کوئی ماڈل ہوں۔

دیکھو دیکھو، کالا کوٹ پاتھ کے قریب آتے دیکھ کر میری دادی نے سرگوشی کی۔ آج یہ

کوئی نئی لے آیا ہے۔ جب کار قریب آئی تو ہم نے دیکھا کہ وہ ایک سبز رنگ کے کا ڈرا کا جیاکٹ پہنے ہوئے ہیں اور اس پر سلک کا گلوبند باندھا ہے۔

کار جوں ہی رکی مایا دیبی کو د پڑی۔ میری دادی اور وہ دونوں ہنستے ہوئے اور ڈھاکہ کی قدیم بولی بولتے ہوئے جو ہماری سمجھ میں نہ آتی تھی ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور گلے ملے۔ میں نے مایا دیبی کے پاؤں چھو کر دیکھا تو ان دونوں کے ہاتھ میرے سر پر تھے۔ وہ کسی اسکول کی لڑکیوں کی طرح مسکرا رہی تھیں۔ ہونٹ بھینچے ہوئے دونوں مسرت سے سرشار تھیں اور دیکھنے میں اتنی مشابہ لگتی تھیں جیسے درمیان میں آئینہ رکھ دیا گیا ہو۔

روبی نے اپنی بیئر کی گلاس میز پر سرکاتے ہوئے کہا۔ وہ تو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ایک جیسے تو کبھی نہیں لگے۔ اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ میری طرف دیکھا۔ دادی کی کوئی جھلک اسے مجھ میں نظر نہ آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے بیئر کی گلاس سے کف نکال کر میری طرف پھینکا۔

اس نے کہا۔ دادی کی مشابہت تو تم سے زیادہ مجھ میں ہے۔

میں بحث کیا کرتا۔ میری دادی بھی اکثر کہا کرتی تھی —— وہ اپنی انگلی روبی کی مضبوط ٹھوڑی پر رکھ کر کہتی۔ یہ تم کو مجھ سے ملی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مایا دیبی کے تین بیٹوں میں وہ اسی کو چاہتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی اور سراہتی کہ کس طرح وہ اپنی عمر کے بچوں میں سب سے زیادہ قد آور ہے۔ اس کے رگ پٹھوں کی تعریف کرتی۔ اس کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں سے مَس کر کہتی کہ نو سال کی عمر میں وہ کتنی مضبوط ہیں۔ اس لیے کہ وہ سارے گیمس کھیلتا ہے۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہتی۔ روبی کی طرف دیکھو۔ وہ کتنا طاقتور ہے وہ تم عام آدمیوں کی طرح نہیں۔

ایک دفعہ جب کہ روبی کی عمر ابھی بارہ سال نہیں ہوئی تھی میری دادی کو مایا دیبی سے ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ روبی کچھ مشکل میں پھنس گیا ہے۔ شمالی ہند کے جس بورڈنگ اسکول میں اسے حال حال میں رکھا گیا تھا وہاں کچھ مسئلہ درپیش ہوا اور مایا دیبی چاہتی ہے کہ روبی کو وہاں سے واپس بلا لے۔ میری دادی کو اتنی فکر ہوئی کہ اس نے فوراً تر دیب کو

اطلاع کروائی۔ اُسے فلیٹ پر بلوالیا۔ تاکہ اُس سے معلوم ہو سکے کہ روبی کو کیا ہوا ہے۔
ایک ہفتہ بعد جب تردیب ہمارے فلیٹ پر آیا تو اُس نے صرف اپنے شانے ہلائے اور کہا کہ روبی کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ روبی نے ایک غنڈے طالب علم کی پٹائی کی تھی۔ وہ غنڈہ روبی کا تو کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا لیکن اُس نے روبی کے اس کمزور دوست کو جو ایک پاؤں سے معذور تھا اتنا مارا پیٹا کہ اسے دو دن تک دوخانے میں رہنا پڑا۔
دادی نے پوچھا تھا تب تو استادوں کو فکر ہو گئی ہوگی۔ انھوں نے مایا دیبی کو لکھا ہوگا۔
تردیب ہنسا اور کہنے لگا۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ استاد پوری طرح سے ناخوش نہیں تھے۔ انھوں نے مایا دیبی کو اطلاع بھی نہیں کی تھی۔ جہاں تک طلباء کا تعلق تھا ان کے لیے تو روبی راتوں رات ہیرو بن گیا۔ چونکہ مایا دیبی کو یہ سب جاننا تھا اس لیے اُس نے بڑی کھلبلی مچائی۔
میری دادی نے حیرت سے پوچھا۔ کیوں؟ وہ کس لیے فکر مند تھی۔
تردیب نے کہا۔ اس لیے کہ روبی اُس سے لڑنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اس میں تبدیلی آگئی ہوگی۔ اس لڑکے کی طرح ہوگیا ہوگا جسے اس نے پیٹا تھا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ خود اس قدر طاقتور ہے کہ اپنی آپ مدافعت کر سکتا ہے۔
میری دادی نے اپنے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ روبی کو اُس سے لڑنا ہی چاہیے اس نے ہونٹوں پر سے انگلیوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ مایا کو چاہیے کہ اس پر ناز کرے مجھے تو اُس پر ناز ہے۔ وہ تو مایا کی طرح ہے بھی نہیں۔ مجھ پر گیا ہے۔
وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ رہی۔ اپنے ہاتھوں کو گود میں سمیٹے کرسی پر لیٹ گئی پھر کھوئی ہوئی نظروں سے دیوار کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ میرے لیے حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مایا تو اُس وقت بھی بے وقوف لگتی تھی جب ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے
تب اُس نے اپنی یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے ہم لوگوں سے اُس لڑکے کے بارے میں کہا جو کالج میں اس کے ساتھ تھا۔ یہ اس صدی کے دوسرے دہے کا ابتدائی زمانہ تھا وہ خاموش اور شرمیلا لڑکا تھا۔ چھدری ڈاڑھی، ان ہی کے پڑوس کی گلی میں جوڑھاکہ

پوتیالولہ میں واقع تھی، وہ رہتا تھا۔ کلاس روم میں وہ ہمیشہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھتا اور کبھی کچھ نہ بولتا۔ اس لیے کسی نے اُس پر توجہ بھی نہ کی۔

ایک صبح جب لکچر آدھا ہو چکا تھا ایک انگریز آفیسر کی سرکردگی میں پولیس کی ایک پارٹی آئی۔ انھوں نے لکچر روم کو گھیرے میں لے لیا۔ اُن کے لکچرر نے احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن ایک پولیس مین نے اسے خاموش کرا دیا۔ دوسرے اس طرح چپکے چپکے باتیں کرتے رہے کہ لوگ ان کی طرف توجہ نہ کریں۔

میں نے پوچھا۔ آپ کو خوف نہیں ہوا۔

تھوڑا تھوڑا سا۔ اُس نے گلے میں ہمیشہ پہنی جانے والی سونے کی باریک چین کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ بہت زیادہ نہیں۔ ہم لوگ پولیس کے دھاؤں کے عادی ہو چکے تھے۔ اُن دنوں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں دھاوے ہونا آئے دن کی بات تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے میں نے سوچا وہ مزاق کر رہی ہو گی۔ میں نے پوچھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ آپ لوگوں نے کیا کیا تھا۔

اب وہ اپنی آنکھوں کو گھمانے لگی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کرے۔ تردیب ان باتوں کو غور سے سن رہا تھا۔ اُس نے مجھے اس زمانے کی بنگال کی دہشت پسند قومی تحریکوں کے بارے میں بتایا تھا۔ پہلے اور دوسرے دہے کی خفیہ قومی تحریکیں۔ انوشیلان۔ جوگنتر اور ان کی مختلف شاخیں۔ اُن کے چوری چھپے منصوبے۔ گھر یلو بموں کے بارے میں جن کی مدد سے انگریز افیسروں اور پولیس والوں کو مار ڈالنے کی ترکیبیں سوچی جاتی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ کس طرح پولیس انھیں پکڑتی، ملک بدر کرتی اور سولی پر چڑھاتی۔ وہ جب تک یہ واقعات سناتا رہا میری دادی اپنی کرسی پر جھولتی ہوئی حیرت سے میری طرف تکتی رہی کہ میں کس طرح اُس تاریخی دور میں اُس کے وجود کو متعین کر رہا تھا۔ جب تردیب نے اپنی بات ختم کی تو اُس نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔

لکچرر کو باہر بھیج دینے کے بعد انگریز افیسر نے اپنا پستول نکالا اور کمرے میں چاروں

طرف دیکھنے لگا۔ پھر ان تمام چہروں کا مقابلہ جو اُس کے سامنے تھے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر سے کرنے لگا۔ وہ بہت آہستہ سے اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک کی طرف بڑھتا جاتا اور طلباء اُس کی نگاہوں سے پریشان پسینے میں شرابور ہوتے رہتے تھے اور اپنی اپنی جگہ دم سادھے بیٹھے تھے۔ کافی دیر کے بعد جب اس کی نظریں پیچھے بیٹھے لڑکے پر پڑیں تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سبھوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ساتھ ان کے سانسوں کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ وہی ڈاڑھی والا اسٹر میلارڈ کا تھا۔ وہ اب کھڑا ہو گیا۔ یکدم سیدھا۔ چہرہ جذبات سے عاری۔ نظریں پولیس مین پر گڑی ہوئی۔ واضح راست اور چیلنج کرتی ہوئی۔ وہ ذرا بھی متاثر نہ لگا۔ بلکہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے اپنا ہاتھ کو لبے کی طرف کیا تو دادی نے خیال کیا کہ وہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ اس قدر کہ شاید وہ بھی کبھی اتنا نہ گھبرائے گی۔ لیکن نہ تو اُس لمحہ اور نہ اُس کے بعد جب کہ ہتھکڑی پہنا کر اسے باہر لے جایا گیا اس کے چہرے پر کوئی خوف کے آثار تھے۔ اُس کی نظریں پولیس آفیسر کے چہرے پر سے ہٹتی نہ تھیں۔

دادی نے میرے سر کو پیار سے سہلایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی پلکوں کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

پھر جب میں نے روبی کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔ روبی اگر وہاں ہوتا تو وہ بھی اسی دلیری کا مظاہرہ کرتا۔ اپنے سر کو اونچا رکھتا اور ذرا بھی نہ گھبراتا۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔ لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ یقین سے کہہ نہیں سکتی۔

تہذیب جاننا چاہتا تھا کہ اُس لڑکے کے ساتھ کیا ہوا۔ اُس نے پوچھا۔ وہ لڑکا؟ اس کا کیا ہوا؟

اُس کے بعد انھوں نے پتہ چلایا کہ وہ اپنی چودہ سال کی عمر ہی سے چند خفیہ تنظیموں کا ممبر ہے۔ اس نے جسمانی تربیت پانے کے علاوہ پستول چلانا اور بم کا استعمال کرنا بھی سیکھا ہے۔ ایک دوسرے تک خبریں پہنچانے کا کام بھی کیا ہے۔ اپنے پکڑے جانے سے چند ماہ قبل ہی وہ کسی خفیہ تنظیم کا باقاعدہ ممبر بنا تھا۔ کھلنہ ضلع کے انگریز مجسٹریٹ

کو قتل کرنے کا کام پہلے اُسی کے سپرد تھا۔ تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ ہفتہ کی چھٹیوں میں وہ وہاں جانے والا تھا لیکن پولیس نے معلوم کر لیا۔ اُن کے خفیہ محکمے کی بھی بڑی شہرت تھی۔ اُس لڑکے پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی جیل کی سزا بھگتنے کے لیے اُسے انڈومان بھیج دیا گیا۔

اُس دن کے بعد جب بھی مایا دیبی اور میری دادی اُس گلی سے گزرتے جہاں وہ لڑکا رہتا تھا تو میری دادی اُس کی طرف اشارہ کرتی اور وہ واقعہ سناتی۔ تم جانتی ہو — اُس نے ہنس کر کہا اور مایا دیبی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اُس گلی سے تیزی سے نکلنے کی کوشش کی۔

تردیب نے کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے کیا سوچا؟

دھیمی آواز میں اُس نے جواب دیا۔ میں تو اُس کے خواب دیکھتی رہی۔ کئی برسوں تک اپنے بستر پر پڑی پڑی میں اُس کے چہرے کو یاد کرتی رہی۔ چھدری چھدری ڈاڑھی والے اُس چہرے کو۔

اُس واقعے سے پہلے بھی دہشت گردی کے ایسے واقعات سُن کر وہ لطف اندوز ہوئی تھی۔ کھودی رام بوس کے دلیرانہ واقعات۔ بھاگا جاتن کی موت جس کا بوری بالام ندی تک پیچھا کیا گیا تھا اور انگریزوں کے ہاتھ بکے ہوئے دغاباز گاؤں والے۔ جب سے اُس نے ایسے واقعات سُنے تھے وہ خود بھی اپنی بساط کے مطابق ان دہشت پسندوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اُن کی عظمت میں خود کو بھی شامل کرنا چاہتی تھی۔ ان کے لیے خبریں پہنچانا انھیں کھانا پکا کر دینا اور ان کے کپڑے دھونا۔ کچھ بھی۔ لیکن وہ لوگ تو چھپ کر کام کرتے تھے۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ اُن سے کس طرح ربط پیدا کیا جائے۔ اگر وہ ربط پیدا کر بھی لیتی تو وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔ ایک عورت کا ان کے لیے کام کرنا دشوار مسئلہ تھا۔ اُس نے اپنے واقف کاروں کے بارے میں بارہا سوچا تھا۔ شاید وہ لڑکا ان میں سے ایک تھا۔ کیا میں پوچھوں۔ شاید کوئی اشارہ ملے۔ کہیں وہ پلٹ کر پولیس والوں کا جاسوس بن گیا تو۔ لیکن جب وہ اُسے نظر آیا تو دادی نے اُسے پہچانا بھی نہیں۔ اُسے خیال تھا کہ وہ ایک قوی ہیکل انسان ہوگا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے ٹپک رہے ہوں گے۔ چہرے پر شیر و ببر جیسی ڈاڑھی ہو گی۔ وہ

وہاں تھا کلاس میں سب سے پیچھے شرمیلے پن میں بیٹھا ہوا۔ بڑی آسانی سے وہ اُس سے بات کر سکتی تھی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ اپنی ڈاڑھی منڈھا لے تو وہ بڑا خوبصورت لگے گا۔ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہوئی سوچتی۔ کاش وہ واقف ہو سکتی۔ اگر وہ اس کے ساتھ کام کرتی ہوتی تو کسی طرح اُسے آگاہ کر دیتی۔ وہ اسے بچا لیتی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ گھلنے جاتی اور اُس کے پہلو بہ پہلو ہوتی۔ ہاتھ میں پستول لیے انگریز مجسٹریٹ کے انتظار میں...

غیر یقینی کے ساتھ میں اس کے نازک چہرے کی طرف دیکھتا رہا جس پر بڑھاپے کی جھریاں پھیل چکی تھیں۔ اس کے سکڑے ہوئے گال اور اُس کے سفید چمکتے بالوں کی طرف میں دیکھتا ہی رہا۔

میں نے کہا۔ سچ مچ تھا نا۔ کیا آپ اسے مار ہی ڈالتیں؟

اُس نے اپنے ہاتھ میرے کاندھے پر رکھے اور مجھے اپنے روبرو کیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، پلک جھپکائے بغیر وہ دیر تک میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

میں خوف ضرور کھاتی لیکن خدا سے دُعا کرتی کہ وہ مجھے طاقت عطا فرمائے — ہاں پھر میں اُسے مار ڈالتی۔ ہماری آزادی کے لیے۔ اپنی آزادی کے لیے میں کچھ بھی کر گزرتی۔

روبی اور میں اپنا اپنا قد ناپتے رہتے۔ وہ اپنے لمبے پتلون میں اسٹوڈ بیکر سے لگا اطمینان سے کھڑا رہا اور میں اپنے پاؤں کے ٹھگنے پن سے آگاہ اپنے مقام پر۔ اُس شاندار اودے رنگ کی گاڑی سے صاحب اُتر کر مُسکرایا اور جھک کر بڑے احترام سے میری دادی کو سلام کیا۔ میری دادی نے سر کو جنبش دے کر اُس کا جواب دیا۔ پھر وہ سوں سوں کرتی ہوئی مایا دیبی کی طرف پلٹ کر اور ایڑیوں کے بل کھڑی ہو کر اُس سے مخاطب ہوئی۔ صاحب نے بہانا کیا کہ اُس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ہے لیکن بعد میں میرا باپ دادی پر خفا ہوا۔ سب لوگوں کے سامنے دادی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا وہ سمجھتی ہے کہ صاحب نے بھانپ نہیں لیا۔ وہ سونگھ کر یہ جاننا چاہتی ہے کہ اُس نے پی رکھی ہے یا نہیں۔ وہ جان چکا تھا اور دادی کو

اس طرح سونگھتا اور اپنی ایڑیوں پر کھڑا ہوتا دیکھ کر اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

کیا تعجب کہ میری دادی نے اُسے سختی سے کہا ہوگا کیونکہ وہ بہر حال پیتا رہا تھا۔ صبح نو بجے بھی اس کی سانس سے ٹرپانٹائن کی بھاپیں نکل رہی تھیں۔

لیکن میں نے ایسی کوئی بو محسوس نہیں کی۔ میری ماں نے کہا۔

اس دن صاحب نے میری ماں کا دل جیت لیا تھا۔ چند دن قبل میری ماں نے صاحب کی ایک تصویر اخباروں میں دیکھی تھی۔ فارن منسٹر غیر ملکی ارباب اقتدار سے باتیں کر رہا تھا اور اُس کی کرسی کے پیچھے صاحب کھڑا تھا۔ وہ اس بات پر یقین کرنے لگی تھی کہ اس نرم و نازک اور بانکے آدمی کا دماغ ہر وقت ملک کے مسائل میں اُلجھا رہتا ہوگا۔ ماں نے یہی سوچا تھا وہ خود تو ان پیچیدگیوں سے نابلد تھی اور دل ہی دل میں مسرور تھی کہ ایسے اہم آدمی سے گفت و شنید کا اسے موقع ملا ہے۔ اُس نے صاحب کے پیر چھو لیے کیونکہ یہ آگے بڑھ چکے تھے۔ صاحب نے بڑی اہم شخصیتوں کی طرح اپنا گلا صاف کیا۔ ماں گھبرائی ہوئی تھی اور کسی عالمی پیچیدہ سیاسی مسئلہ پر کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ صاحب نے اس کی پیٹھ کو تھپکا۔ پھر وہسکی اور پائپ کے ملے ہوئے دھوئیں میں ڈوبی ہوئی گمبھیر آواز میں اس نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ آج کل مارکٹ سے انڈے خریدنے میں تمہیں کوئی دشواری تو ہوتی نہ ہوگی۔

ماں نے ٹھیک ٹھیک جواب دینے کی کوشش کی۔ صاحب نے پھر سوال کیا کہ کہیں ترکاریوں کے دام بڑھ تو نہیں گئے اور یہ کہ پچھلی بار جب وہ کلکتہ آیا تھا تو مٹی کا تیل نایاب تھا۔ ایسی مشکل ان دنوں تو نہیں تھی۔

میری ماں بہت متاثر ہوئی کہ اس قدر اہم اور باوقار آدمی نے ایسی معمولی معمولی باتوں پر دھیان دیا ہے۔ ساتھ ہی اسے حیرانی بھی اس بات پر ہوئی کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر صاحب کی توجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملاقات سے اس کا دن رات کا سابقہ ہے۔ ماں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ کس طرح بڑے بڑے منسٹر جن کے ساتھ صاحب کا سارا وقت صرف ہوتا ہے، بھاجی، ترکاری، انڈے اور مٹی کے تیل کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوں گے۔ میرا باپ تو اسی خیال میں کھو گیا کہ اس کی بیوی اور صاحب میں بڑی دلچسپ

باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ تو صاحب کا اس حد تک مداح تھا کہ اکثر اس کی خوشامد بھی کر لیتا۔ اس کا سبب کچھ یہ بھی تھا کہ خاندان میں صرف صاحب ہی ایک اہم آدمی تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ربر جیسی اہم انڈسٹری میں ایک بڑا عہدہ میرے باپ کو بغیر کسی محنت کے صاحب سے رشتے کی وجہ مل گیا تھا۔ وہاں تو انڈوں اور ترکاریوں جیسے موضوع کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔

یہ راز تو جب کھلا جب میرے باپ کو اپنے بزنس کے سلسلے میں افریقہ جانا پڑا تھا۔ وہاں مایا دیبی اور صاحب کے ساتھ باپ کو چند دن گزارنے پڑے تھے۔ ایمبسی کے ایک ڈنر پر صاحب کی گفتگو سننے کا اُسے موقع ملا تھا۔ وہاں بھی دو تہائی مہمان تھرڈ سکریٹریز کی بیویوں سے باری باری مل کر صاحب نے ایسی ہی گفتگو کی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انڈوں کی جگہ گوشت موضوع بنا ہوا تھا۔

گھر لوٹتے ہوئے صاحب نے میرے باپ سے کہا کہ تھرڈ سکریٹریز کی بیویوں سے ایسے ہی موضوعات پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ لوگ نئے نئے ان عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اُن کی ہمتیں ان باتوں سے بڑھتی ہیں کہ ہز اکسیلنسی کس طرح اُن کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ افریقہ کے دورے سے واپس ہو کر میرے باپ نے میری ماں کو یہ بات بتائی تھی اور کہا تھا کہ صاحب نے اس دن رائے بازار والے مکان میں اسے تھرڈ سکریٹری کے برابر قرار دیا تھا۔

دراصل کوناکری کے دورے کے زمانے میں میرے باپ کی تجارت عروج پر تھی۔ یہ صاحب کے لیے مسئلہ بن گئی۔ خود صاحب اپنی ترقی کے لیے فکرمند تھا۔ ابتدا میں اس نے جو باتیں کہیں وہ بے ربط تھیں لیکن ایک شام جب میرے باپ نے حکومت کی درآمد پالیسی پر سوالات کیے تو صاحب نے میرے باپ کو درجے اوّل کے سکریٹری (کامرس) کے برابر قرار دیا۔

میری ماں نے صاحب سے جب تک بات ختم نہیں کی میں بے چین رہا۔ بات ختم ہوئی تو میں نے اُس کی ساڑی کا پلّو کھینچا اور چلّایا کہ بتاؤ الا کہاں ہے۔ کیا اس نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ بھی آئے گی۔ ماں نے مجبوری ظاہر کی تو میں الا کے باپ کی طرف بھاگا اور پوچھا کہ الا کیوں نہیں آئی۔ اُس نے میرے بازوؤں کو مضبوطی سے تھاما۔ سر کو نفی میں ہلا کر کہنے لگا۔ اسے

افسوس ہے کہ وہ نہیں آئے گی۔ اُسے تو لندن ہی میں چھوڑ آئے ہیں۔

میں دیکھ چکا تھا کہ اُس نے میرے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری تھی۔ لیکن میں تو مایوسی سے گونگا ہو چلا تھا۔ اس عمر کے لوگوں سے کوئی بھی حرکت عمل میں آسکتی ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ مایا دیبی نے بھی اُسے سن لیا تھا۔ محسوس بھی کر لیا تھا کہ شاید میں رو پڑوں گا۔ وہ مجھے بازو لے گئی اور میری ڈھارس بندھاتے ہوئے اس نے کہا کہ ایک منٹ میں میں اِلا کو دیکھ پاؤں گا۔ وہ دوسری کار میں آرہی ہے۔ مایا دیبی کی ماں اور تردیب بھی آرہے ہیں۔ لزی مستی بھی اور اُن کا خاندانی باورچی نتیا نندا بھی۔

وہ کہہ رہی تھی اور اُسی سمے خاکستری رنگ کی ایمبسڈر کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ کار صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے خریدی تھی۔ کار کے دروازے میں سے اِلا جھانک رہی تھی۔ اُس کے لمبے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اُس سے دوبارہ ملنے کے خیال سے گھبرا کر میں اپنی ماں کی ساڑی میں چھپ گیا۔

میری دادی نے کہا۔ نادان بچّے۔ دیکھتے نہیں وہی تو اِلا ہے۔ تم اُسی کا تو انتظار کر رہے تھے۔

تردیب نے ڈرامائی انداز میں کار کو روکا تو لوگ آہستہ آہستہ باہر نکل آئے۔ کوئین وکٹوریہ کی تمکنت سے متاثر ہو کر ہم لوگوں کی سانسوں کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ تردیب خود اپنے مخصوص انداز میں سلام مار کر سگریٹ لینے کے لیے غائب ہو گیا۔ وہ لزی مستی جو مالکین کی غیر موجودگی میں کلکتے کے مکان کی دیکھ بھال کرتی تھی اور وہ نیتا نند باورچی جو صاحب اور مایا دیبی کے ساتھ گزشتہ پندرہ سال سے رہ رہا تھا۔ ملٹری کی تربیت کے مطابق جو اس نے حاصل کی تھی فاصلے ہی سے ہم سب کو سلام کیا۔

اِلا کار ہی میں بیٹھی رہی۔ گول پارک کے سنٹر میں استادہ اُس مجسمے کی طرف نظریں جمائے تھی جس پر پرندوں نے غلاظت کی تھی۔

یکلخت وہاں موجود ہر شخص نے اُسے یاد کیا۔

مایا دیبی نے کہا۔ مجھے اِلا نظر نہیں آرہی ہے۔

روبی نے کہا۔ شاید روٹھ گئی ہو۔

میری ماں نے کہا۔ میرے خدا اب تو وہ بڑی ہو گئی ہو گی۔

کوئین وکٹوریہ نے کہا۔ زیادہ بڑی بھی نہیں۔ میری بچی وہ تو کچھ کھاتی ہی نہیں۔

اس کے باپ نے کہا۔ اتنی بڑی ضرور ہے کہ اُسے آٹو میٹک گھڑی کی ضرورت ہے۔ آٹھویں سالگرہ پر میں نے اسے سونے کی چین والی اومیگا کی گھڑی دلائی تھی۔

لیکن وہ ہے کہاں؟ مایا دیبی نے پوچھا۔

واہ کیا بات ہے۔ کوئین وکٹوریہ نے پکارا۔ لزّی مسّی الا کو یہاں لے آؤ ـــــ وہ کہاں ہے؟

لزّی مسّی کار کی طرف گئی۔ پھر ہم نے اس کی نرم نرم ڈانٹ سنی۔ ساتھ ہی الا کار سے اُتری اور اس سے الگ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے وہ اپنی مٹھیوں سے آنکھوں کو مسلتی رہی۔ پھر جب اس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو ہم دونوں کی نظریں مل گئیں۔ خاندان کے ان بہت سے افراد کے سامنے کھڑے کھڑے ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

اس نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے کہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ انگریزی لباس۔ سفید رنگ کا انگرکھا۔ اوپری حصّے میں زراقے کی طرح کام کیا ہوا۔ بیچ میں گوٹ لگے ہوئے اور گردن پر کالر ٹھوڑی کو چھوتا ہوا۔

ہم لوگ جوں ہی لانگ ایکر روڈ پر سوہو کی روشنیوں کی طرف چل پڑے۔ الا نے کہا۔ یہ تو ویسا نہیں ہے۔ اس کی آواز دونوں طرف دکانوں کی کھڑکیوں میں گونج رہی تھی۔ وہ ہنسی اور اپنے خوابوں پر زور دے کر کہنے لگی۔ نہیں یہ ویسا نہیں ہو سکتا۔ بہت دیر بعد پتہ چلا جب روبی نے اس کی بنیاد تھپکی اور مجھے یاد دلایا کہ طرح طرح کے لباسوں سے اس کا صندوق بھرا پڑا ہے۔ ہزاروں میں سے وہ ایک لباس ہو سکتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ لزّی مسّی نے اسے کس طرح کڑک دار بنایا تھا۔ آئینے میں اُن سکتا ہوں۔ استری کی کریز دیکھ سکتا ہوں۔ کپڑے کی بنت محسوس کر سکتا ہوں۔ لزّی مسّی نے جو بے بی "ٹالکم پاوڈر" اس کے جسم پر چھڑکا ہے اس کی دودھ جیسی خوشبو

میں سونگھ سکتا ہوں۔ میں یہ بھی دیکھ سکتا ہوں کہ کس طرح سے اس کا پسینہ ندی کی طرح اس کے گردن کا پاوڈر بہالے گیا ہے اور وہاں ایک سفید دھبہ بھی بن گیا ہے۔

اُسے تم اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ جاؤ اور اُس سے بات کرو۔ میری ماں نے کہا۔

میں اور بھی جھینپا۔

میری ماں شکایت کرنے لگی۔

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا۔ کئی دنوں سے اُسے اس لڑکی کا انتظار تھا۔ ہر رات اس لڑکی کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا کہ اِلا کہاں ہے؟ وہ کب آرہی ہے؟ اس وقت تک سو نہیں جاتا جب تک میں یہ نہ بتاتی کہ وہ جلدی ہی آنے والی ہے تم فکر نہ کرو...

کوئین وکٹوریہ نے میری طرف شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لو، اب سنو کیا پیارا ننھا آدمی ہے۔ کیا تم سن رہی ہو اِلا۔ وہ ہر روز تمہارے بارے میں پوچھتا رہا ہے۔

اِلا نے مسکرا کر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ اُس نے میرے بارے میں اتنا نہیں پوچھا جتنا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اُس لمحہ میری ماں پر مجھے بہت غصّہ آیا۔ پہلی بار اس نے مجھ سے دغا کی تھی۔ اس نے میرا راز فاش کر دیا تھا۔ اُس نے اِلا کو اُس کے تکبّر کا احساس دلایا تھا اور اس کے سامنے مجھے ننگا کر دیا تھا۔ میری مدافعت چھین لی تھی۔ ایک ایسی حقیقت کے مقابلے میں جو بڑوں تک محدود تھی۔ وہ ضرورت متعدی نہیں تھی۔ کسی کو کسی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خود اُس کی ضرورت کسی کو نہیں ہوتی۔

انھیں مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے میں بھاگا اور کود کر کار میں گھس گیا۔

تم تردیب کا کو اور نبیتیا نندا کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہو۔ میں سو جاؤں گی۔ اِلا نے کہا۔

کار ریل گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر نبیتیا نندا اور تردیب کے بیچ بیٹھا رہا۔ اِلا اُس کی ماں اور رلزی مستی پچھلی سیٹ پر اونگھتے رہے۔ شہر سے گزرنے میں کافی وقت لگا۔ اُس زمانے میں تہوار کی بدولت سڑکیں بھری ہوتیں۔ کار میں بیٹھنا کوئی اعزاز تو نہیں تھا۔

گاڑیوں کے علاقے میں تو ایک ایک انچ کے لیے راستہ بنانا پڑا۔ نیتیا نندا اور تردیب دروازے میں سے جھانک کر دکانداروں سے راستہ دینے کی خواہش کرتے رہے۔ سیلدھا کا موڑ پار کرنے میں آدھا گھنٹہ لگا کیونکہ وہاں جو پنڈال تھا وہ فٹ پاتھ سے بیچ سڑک تک پھیلا ہوا تھا۔ کار کا انجن گرم ہوتا گیا اور اُس کے ساتھ تردیب کی چیخ و پکار بھی بڑھتی گئی۔ غصّے اور چڑچڑے پن سے اُس کا چہرہ سکڑتا گیا۔ دھوپ اور پسینے سے اس کی عینک ناک پر سے پھسلتی رہی۔ دکھشنیشور پر پہنچ کر کار کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پل تک پہنچنے کے لیے ہم کو تقریبا رینگ کر جانا پڑا۔ جب ہم نے نیچے کی طرف نگاہ ڈالی تو ایک دھچکا سا لگا کیونکہ لوگوں کا ہجوم مندر کے احاطے میں اس طرح پھیرے لے رہا تھا جیسے کسی باغ میں پانی کی دھار بہتی ہے۔ لیکن جب ہم پل پار کر چکے تو ٹرافک میں کمی ہوتی گئی۔ اور بہت جلد ہم گرانڈ ٹرنک روڈ پر پہنچ گئے۔ تب تردیب نے آرام کی سانس لی اور پیچھے کی طرف ٹیکا لیا۔ اُس کے پاس سے ہمیشہ کی طرح تازہ سگریٹ اور صابن کی بو آنے لگی۔ میں نے اُس سے چند سوال کیے لیکن اُس نے دلچسپی نہیں لی اور زیادہ بولنا پسند نہیں کیا۔ مجھے بھی نیند آگئی۔

جب میں جاگا تو محسوس کیا نیتیا نندا میرا بازو جھنجھوڑ رہا ہے۔ اُٹھو اُٹھو۔ وہ دیکھو — گھر آگیا — وہ دیکھو دیکھو کی رٹ لگاتا رہا۔

موٹر کے شیشے میں سے میں نے اچانک دیکھا کہ میدان کے اوپر سے ایک ٹیلہ نظر آرہا ہے۔ چند ہی منٹ میں ہم لوگ ایک دراز گیٹ کے اندر داخل ہوگئے۔ دونوں طرف نوکروں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ کار کی رفتار آہستہ ہوئی تو گرد نے پیچھے سے آلیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں بازوؤں کے کمروں سے بچے دوڑتے ہوئے چیختے چلاتے کار کے پیچھے ہو گئے۔ ٹیلے پہ جنگل کے پھیلنے کی وجہ مکان عقب میں ہو گیا تھا۔ تناور درخت اور جھاڑیاں پردے کا کام کر رہی تھیں۔ تردیب نے مجھ سے کہا کہ اس ماحول کو اچھی طرح دیکھ لوں کہ ایسے درخت دوبارہ مشکل ہی سے دیکھنے کو ملیں گے۔ اس کے دادا بارش کے جنگلوں والے گرم علاقے میں رہنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے برازیل اور کانگو سے یہ درخت درآمد کیے تھے۔

نیتیا نندا نے میرے کہنی مار کر بائیں جانب اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بہت

سے بندر درختوں پر لٹک رہے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے قلابازیاں مارنے لگے۔
کار نے آخری چڑھائی چڑھتے ہوئے ایک موڑ لیا تو اچانک گھر کی عمارت ہمارے سامنے
تھی۔ اسے حال ہی میں پلاسٹرنگ اور آہک پاشی کرائی گئی تھی۔ صبح کے چڑھتے ہوئے
سورج کی روشنی میں عمارت سنہری لگ رہی تھی۔ چھت پر سکھائی ہوئی ساڑیاں کسی
سہرے میں گندھے ہوئے پھولوں کی طرح تھیں اور پورٹیکو میں خوشی سے پھیلے ہوئے
دہن سفید دانتوں کی نمائش کر رہے تھے۔
کار کی آواز کے ساتھ ہی عمارت کے سامنے ٹرلیس کے پاس لوگوں کا جمگھٹا ہو چکا تھا۔
دربانوں نے دونوں طرف آگ سلگائی تھی جس میں سے باریک دھوئیں کی لکیریں آسمان
کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دربانوں کی بیویاں پورٹیکو کے سامنے کھڑی تھیں۔ بازو بہت
سی ترکاریاں نیتیا نندا کا انتظار کر رہی تھیں۔ ٹرلیس میں پیتل کے گھڑے قرینے سے
رکھے ہوئے تھے۔
کار سے اترتے ہی ہمیں گھیر لیا گیا۔ چونکہ الا اکیلی ہی اس گھر کی پوتی تھی اُسے ہاتھوں
ہاتھ لیا گیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ان سے لگی رہی لیکن جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو آزاد
کر لیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹرلیس سے آگے لے جانے لگی —— چلو جلدی سے ہم کہیں چھپ جائیں۔
اس نے سرگوشی کی۔
میں نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر چلایا۔ وہ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ اب
ہم کیا کریں؟
اُس نے کہا۔ بس میرے ساتھ چلو۔ ایک ہی جست میں ہم لوگ پورٹیکو پار کر کے ایک بڑے
فرسودہ ہال میں پہنچ گئے۔ نیم اُجالے نیم اندھیرے میں لڑکھڑاتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے
ہوئے ہم لوگ سرد سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر لڑھک گئے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے آخری
سیڑھی تلاش کی۔ لیکن چند منٹ تک ہی دیکھ سکا۔ آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے
دربانوں اور بچّوں کو صحن میں دوڑتے اور ایک دوسرے کی طرف چیختے ہوئے سنا۔
میں نے الا کے کان میں کہا۔ ادھر تو اندھیرا ہے۔ ہم لوگ کہاں چھپیں۔ وہ لوگ آ گئے ہیں۔

اُس نے جلدی سے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہال کے چاروں طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے راستہ بھول چکی ہو۔ میں اسے ڈھکیلتا رہا۔ پیٹ کے بل رینگتے اور لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے آنکھ مچولی کھیلنے کی مسرت جاگ اُٹھی تھی۔

چُپ رہو۔ پیچھے ڈھکیلتے ہوئے اس نے تنبیہہ کی۔ میری نظریں تھوڑے فاصلے پر دروازے پر پڑیں اور میں ہلکے سے آجانے کو پار کرکے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ وہ چیخی۔ ادھر آؤ۔ مجھے یاد آگیا ہے۔ سیڑھیوں کی طرف اس نے راستہ تلاش کرلیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ہوگیا۔ ہم ایک چھوٹے سے لکڑی کے دروازے پر پہنچے جو سیڑھیوں کی تہہ میں تھا۔ اُس نے دروازے کا ناب پکڑا اور گھمایا۔ دروازے میں کریک کی آواز ہوئی لیکن وہ کُھل نہ سکا۔

سانس کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ خوب زور لگاؤ۔ کیا تم کسی کام کے نہیں۔

اب پورٹیکو پر پاؤں مارنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے ناب کو سنبھالا اور ہم دونوں نے اپنی ساری طاقت لگائی۔ دروازہ کھلنے لگا اور ساتھ ہی گندی ہوا ہمارے چہروں کو مس کرنے لگی۔ ہم نے مزید زور آزمائی کی۔ دروازہ صرف اس قدر کُھلا کہ ہم دونوں گھس کر اندر داخل ہو سکے۔ پھر دروازہ بند ہوگیا۔ ایک لمحہ بعد ہی ہم لوگوں نے ہال میں آتے ہوئے اُن لوگوں کی آواز سُنی۔

ہم دونوں نے لُڑھکتے ہوئے مزید چند سیڑھیاں پار کیں اور وہاں پتھر کے فرش پر ہانپتے پڑے رہے۔ ہال میں لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ سیڑھیوں کی طرف اور کچھ ہال کے چاروں طرف کونوں میں ایک دوسرے پر چیختے چلاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ الانے خوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ اس نے کہا کسی کو یہاں پر ڈھونڈنے کا خیال تک نہ آئے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک ہلکی سبز روشنی کھڑکی سے چھن کر آرہی ہے۔ اونچائی تنی تھی کہ مجھے لگا یہ آسمان سے آرہی ہے۔

ایک مستطیل نما کانچ کا ٹکڑا اوپر جڑا ہوا تھا اور اس پر گھاس اور کائی اُگ آئے تھے۔ میں نے الا سے کہا دیکھو وہاں گھاس اُگ رہی ہے۔

ہاں۔ اس نے جواب دیا۔ اگر تم زمین کی طرف کی کھڑکیوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے پیٹ کے بل لیٹنا ہوگا۔

میں نے تعجب سے کہا۔ پھر تو یہ کمرہ زمین دوز ہوگا۔

بالکل صحیح ہے۔ اُس نے کہا۔ تم کتنے بے وقوف ہو کہ اتنا بھی نہیں جانتے۔

میں حیران تھا۔ پہلے کبھی زمین کے اندر کی طرف نہیں گیا تھا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں زمین کے اندر ہی پاتال ہوتا ہے۔

کمرہ بہت ہی بے ڈھنگا لگا۔ اس ہلکی سبز روشنی میں مَیں نے چاروں طرف دیکھا تو پانی کے اندر پتھروں میں مچھلیوں کے لیے بنی ہوئی پناہ گاہیں جن کی تصویر تردیب نے میرے سامنے کھینچی تھی نظر آئیں۔ ہم لوگ لڑکی مستی کی آواز سن رہے تھے۔ وہ ہال میں کھڑی الا کو بلا رہی تھی۔

میں نے کہا چلو ہم واپس چلیں۔ بہت دیر ہو چکی۔

الا نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھا اور ناراض ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔ چپ رہو۔ تم اب نہیں جا سکتے۔ میں تمہیں اب یہاں لے آئی ہوں۔

کوئین وکٹوریہ بھی چیخ رہی تھی اور لڑکی مستی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ آخر تم نے دوڑ کر جانے کیوں دیا۔ تردیب سمجھ نے لگا کہ جانے بھی دو۔ وہ کہیں کھیل رہے ہوں گے۔۔۔ ان کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ پھر ہم لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ ٹریس کی طرف جا چکے ہیں۔

میں نے چپکے سے الا سے کہا۔ مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔ میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔

ڈرپوک۔۔ اُس نے کہا۔ کیا تم مرد نہیں ہو۔ میری طرف دیکھو میں ذرا بھی نہیں ڈرتی — وہ تو پرانا فرنیچر ہے۔ جس پر کپڑا ڈھانکا گیا ہے۔ صرف اتنی بات۔

میں نے کہا۔ لیکن ہم یہاں کیا کرنے والے ہیں۔ یہاں اس قدر اندھیرا ہے۔۔۔

میں جانتی ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ہم لوگ کوئی کھیل کھیل سکتے ہیں۔

کیسا کھیل۔ اندھیرا چیرتی ہوئی سبز روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ایسے مقام

پر کس طرح کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔

میں تمہیں بتاتی ہوں۔ بہت اچھا کھیل ہے۔ بہت سے لڑکے اسے پسند کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

لیکن یہاں جگہ ہی نہیں ہے۔ میں دور تک دیکھ ہی نہیں سکتا۔ میں نے احتجاج کیا۔

وہ پھدک کر آگے بڑھی اور کہنے لگی میں جانتی ہوں کہ ہم کس جگہ کھیل سکتے ہیں — بس وہ مقام۔ وہاں۔

اس بے ڈھنگے کمرے میں وہ جدھر بھی آگے بڑھتی رہی میں اس کے پیچھے پیچھے ہوتا گیا۔ لڑکھڑاتے، گرد اُڑاتے۔ وہ مجھے آخر کار ایک کونے میں لے گئی جہاں اندھیرا اس قدر تھا کہ میں دیکھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے فاتحانہ آواز دی اور ایک گٹھڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ابھی تک یہیں پر ہے۔ اس کپڑے کو کھینچنے میں میری مدد کرو۔ یہاں آؤ۔

میں نے کپڑے کا ایک سرا پکڑا اور اس نے دوسرا۔ دونوں نے مل کر ایک ساتھ اُسے جھٹکا دیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے ریزہ ریزہ ہو کر گرد بن کر اڑ گیا۔

میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں کہ وہ کس طرح گرد کے مرغولے میں تبدیل ہو رہا ہے کسی جادوگر کے خرگوش کی طرح۔ الا نے ہٹہ مارا۔

روبی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ نہیں اتنا آسان تو نہیں۔ گھر میں بھرے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر جیسے کوئی قلعہ۔

لیکن میں اپنی یادداشت میں دیکھ رہا ہوں کہ اس گرد کے طوفان میں وہ ایسے اُبھر رہا ہے جیسے کسی ریگستان میں سطح مرتفع۔

وہ ایک میز تھی۔ اتنی بڑی میز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ پھیلتی گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کہیں یہ بچپن کا ایسا واہمہ تو نہیں کہ بڑے ہونے پر جب ہم ایسی باتوں کو یاد کرتے ہیں تو ان کی بڑائی اور اہمیت مسلسل اُبھرتی ہی جاتی ہے اور وہ اپنی حیثیت سے ہمیشہ بڑی ہی نظر آتی ہیں۔ لیکن اس واقعہ کے تین سال بعد جب منے کو جو مکمل چوبیس سال کی عورت تھی اس کمرے میں لے جا کر وہ میز دکھایا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔

اُس نے کہا تھا — میرے خدا۔ اتنا بڑا — اسے کس غرض کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔
ترد یپ نے ایک دن مجھے سب کچھ بتایا تھا میرے نانا نے جب وہ پہلی بار لندن گئے تھے تو وہاں سے خریدا تھا۔ شاید ۱۸۹۰ء کی بات ہے۔ اُس نے کرسٹل پیلس کی نمائش میں اسے دیکھا تھا۔ پھر اس سے رہا نہ گیا۔ پانی کے جہاز کے ذریعہ اسے اقساط میں کلکتہ لایا گیا۔ لیکن یہاں پہنچنے پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا استعمال کس طرح ہو۔ پھر اُسے بھلا دیا گیا تھا۔ لیکن اب تم نے اسے کھوج نکالا ہے۔
منّی بے چینی سے اُس کے اطراف گھومتی رہی پھر اس کے وزنی کوروں پر اپنا ہاتھ پھیرتی ہوئی کہنے لگی۔ نہ جانے اس کے لیے کتنے دام ادا کیے گئے ہوں گے پھر اونچی آواز میں کہنے لگی۔ حیرت ہوتی ہے کہ پانی کے جہاز سے منتقل کرنے میں اس پر کس قدر خرچہ نہ بیٹھا ہوگا۔ اُس کی آواز نیم اندھیرے کمرے میں گونج رہی تھی۔ اور وہ کہے جا رہی تھی۔ اتنے خرچے پر ان جھونپڑوں کے جن سے ہم گزر کر ابھی آئے ہیں نہ جانے کتنے چھت بنائے جا سکتے تھے۔
اس کی جھلائی ہوئی آواز جیسے مجھ پر تیر چلا رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔
یہ میں نہیں جانتا۔
لکڑی کو اپنی انگلیوں سے دھپ دھپ مارتے ہوئے وہ پھر چیخی۔ خدا کے لیے کوئی بتائے کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا۔ انگلستان کا یہ ناکارہ پلندہ۔ اتنی فضول چیز کیوں؟
بے چینی میں وہ سر ہلاتی اور ہونٹ چباتی جا رہی تھی۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ میز کی لاگت اور اس کے استعمال کے بارے میں کسی بھی دوسری شئے سے مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے کوئی اور شئے اتنی فضول نہیں لگتی۔ گرد کی تہوں میں اٹا ہوا۔ اسی کمرے میں۔
اِلا نے کہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہم اُس کے نیچے گھسیں گے۔
ہاں نہیں۔ اس کے نیچے۔ اس کے نیچے ہم کون سا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ میں نے اُس کے انگرکھے کو پیچھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔
اُس نے کہا۔ چلو — اور پھر وہ اپنے گھٹنوں کے بل گرد کی طرف کھسکتی گئی۔ چلو میں تمہیں بتاتی ہوں۔ یہ وہ کھیل ہے جسے میں نِک کے ساتھ کھیلا کرتی ہوں۔
نِک کے نام سے میں چونکا۔ یہ نِک، کون ہے۔

تم نِک کو نہیں جانتے۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا مسز پرائس کا بیٹا نک۔ منے کا بھائی۔
ہم لندن میں انھیں کے مکان میں رہتے ہیں۔ وہ اور میں ہر روز صبح ایک ساتھ اسکول جاتے ہیں
اور دوپہر کو ایک ساتھ گھر لوٹتے ہیں۔ پھر ہر شام ہم لوگ کھیلنے کے لیے تہہ خانے میں جاتے ہیں۔
اُس نے میرا ہاتھ ٹٹولا اور اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔ چلو۔ میں تمہیں
بتاؤں گی۔ اس کھیل کو ہوزس کہتے ہیں۔
نہیں۔ انکار سے سر ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔ اُن اندیشوں سے میں گھبرایا ہوا تھا جو میرے سر
میں کھجلا رہے ہیں۔
یہ نِک۔ کتنا بڑا ہے یہ میں نے سوال کیا۔
اوہ — وہ بڑا ہے۔ پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ تم سے بہت بڑا ہے۔ تم
سے بہت طاقتور۔ وہ ہم لوگوں سے بارہ تیرہ سال بڑا ہے۔
گرد بھرے فرش پر کچھ سوچتا ہوا میں اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر پوچھنے لگا۔ وہ دیکھنے میں
کیسا لگتا ہے؟
اُس نے اپنے ذہن پر بار ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے بال زرد ہیں۔ اکثر اُس کی پیشانی
اور آنکھوں پر بکھر جاتے ہیں۔
کیوں؟ وہ کنگھی نہیں کرتا؟ میں نے کہا۔
وہ کنگھی کرتا ہے۔ پھر بھی وہ اُس کی آنکھوں پر بکھرتے رہتے ہیں۔
لڑکیوں کی طرح لمبے ہوں گے؟
نہیں۔ لڑکیوں جتنے تو نہیں۔
پھر وہ کیوں کر بکھرتے ہیں۔
اُس نے کہا وہ زیادہ لمبے نہیں۔ وہ بالکل سیدھے ہیں۔ وہ جب بھاگتا ہے یا سر کو
تیزی سے حرکت میں لاتا ہے تو وہ اُس کی آنکھوں تک پھیلتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ انھیں اپنی
زبان سے چھو لیتا ہے۔
میں نے کراہیت محسوس کی اور فرش پر تھوکا۔

ہم نے دیکھا کہ تھوک گرد میں مل کر کف آلودہ ہو گیا ہے۔ اس کے بالوں کو اپنے منہ میں محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ بڑا ہی گندہ ہوگا۔

الاکھیا نے ین سے کہنے لگی۔ تم اس سے حسد کرنے لگے۔ تمہارے بال تو بہت چھوٹے ہیں۔ ہر شخص کہتا ہے کہ جب ٹک کی پیشانی پر بال بکھر جاتے ہیں تو وہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔

ٹک جسے میں نے پہلے کبھی دیکھا نہ دیکھنے کی کوئی امید ہے اُس دن کے بعد سے میرے وجود پر چھایا رہا۔ اسے میں اپنے ساتھ آئینے میں دیکھتا رہا۔ میری عمر کے ساتھ وہ خود بھی بڑھتا رہتا۔ لیکن مجھ سے برتر اور ایک طرح سے مقبول بھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ صرف اس لیے کہ الا نے ایسا محسوس کیا تھا۔ لہٰذا وہی سچ تھا۔ آئینے میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ موجود ہوتا۔ وہ تیزی سے قد میں مجھ سے بڑھتا ہوا نظر آتا۔ اُس کے شانوں اور سینے پر بال بکھرے ہوتے۔ یہی بال میرے سر پر بہت ہی چھوٹے ہوتے۔ اس کے علاوہ اگر میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا تو وہاں مجھے نہ اُس کی ناک نظر آتی، نہ دانت نہ ہی کان۔ اس کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا لیکن مجھے صرف بھورے رنگ کے وہ بال ہی نظر آتے جو اس کی نیلی چمکیلی آنکھوں تک پھیلے ہوتے۔ الا نے جس دن پہلی بار مجھ سے اس کے بارے میں کہا تھا اس دن سے تین سال کے عرصے میں جب کہ میں منے کو لے کر اس تہہ خانے والے کمرے میں گیا تھا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کرتا تھا اور اس کی باتوں کا انداز کیا تھا۔ صرف ایک، اچھا سا واقعہ انگلستان کے تجارتی سفر سے واپس ہو کر میرے باپ نے ہم لوگوں کو سنایا تھا۔

لندن پہنچ کر میرے باپ نے مسز پرائس کو فون کیا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ الا اور کوئین وکٹوریہ وہیں پر ہیں کہ نہیں۔ پتہ چلا کہ وہ بہت پہلے ہی لندن سے جا چکے ہیں لیکن مسز پرائس نے میرے باپ کو بڑے اصرار کے ساتھ چائے پر بلایا۔ جب وہ وہاں گیا اور جب مسز پرائس اُسے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی تو ٹک، وہاں موجود تھا۔ اسکول کے یونیفارم میں۔ لیکن ٹامی اُس کی گردن میں ڈھیلی لٹک رہی تھی۔ اُس نے میرے باپ سے مصافحہ کیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرا باپ، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے اس سے پہلے کسی تیرہ سال کے لڑکے میں اس قدر خود اعتمادی نہیں دیکھی تھی۔

میرا باپ اور مسز پرائس تھوڑی دیر تک مایا دیبی، صاحب اور مٹے کے بارے میں باتیں کرتے رہے (ان دنوں صاحب اور مایا دیبی رومانیہ میں تھے اور مسز پرائس کو وہاں مدعو کیا تھا) مٹے بیروت کے ایک فسیٹول میں گئی تھی۔ مسز پرائس نے یاد دلایا کہ ایک زمانے میں تردیب نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ایر ریڈ وارڈن بنے گا۔ تب میرے باپ نے نِک سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ وہ صرف اتنا ہی بتادے کہ بڑا ہو کر وہ کیا کرے گا۔

نِک نے سر کو جنبش دی اور کچھ مسکرا دیا۔ اُس سے کوئی اس طرح سوال کر سکتا ہے؟ پھر اُس نے کہا۔ ہاں، برسوں سے اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے دادا جیسا بنے۔ دادا ترلیسا سن جس کی تصویر وہاں انگیٹھی کے اوپر آویزاں تھی۔

وہ میری مایوسی کی انتہا تھی کہ میرے باپ نے نِک کے دادا کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا کہ تصویر میں اس کا چہرہ چوکور ہے، بال سفید ہیں اور سمندری گھوڑے جیسی مونچھیں۔

جیسا کہ اکثر ہوتا رہا ہے۔ یہ معلومات بھی مجھے تردیب ہی سے حاصل ہوئیں۔ ایک شام گول پارک میں گھاس پر بیٹھے اس نے مجھے مسز پرائس کے باپ کے بارے میں بتایا۔ لیونل ترلیسا سن جنوبی کارن وال کے گاؤں مایے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے گاؤں کا فارم چھوڑ کر قریب کے قصبے میں ٹن کی ایک کان میں نوکری کر لی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ وہاں سے نکلا تعلیم تو اس نے زیادہ نہیں پائی تھی لیکن وہ بڑا حاضر جواب تھا اور اس کے ہاتھ محنت کے عادی تھے۔ وہ بڑا ہی اُمنگوں والا آدمی تھا۔ وہاں سے وہ ملیشیا گیا اور ٹن کی ایک کان میں اوورسیر بنا۔ وہاں سے نکل کر اس نے پوری دنیا کی سیر کی۔ فیجی بولویا۔ گیانا گوسٹ، سیلون۔ وہ مختلف منڈیوں، کانوں اور باغات میں کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی جو بھی کام مل جاتا وہ اس میں لگ جاتا۔ آخر میں وہ کسی طرح کلکتہ پہنچا۔ ایک کمپنی کا ایجنٹ بنا اور ایک دوسری اسٹیل ٹیوب کی کمپنی میں بھی اس نے ایجنٹ کی حیثیت سے اپنی روزی تلاش کی۔ اس کے بعد پھر اُس نے اپنی قسمت آزماتے ہوئے برکپور میں ایک فیکٹری قائم کی۔ تب تک وہ درمیانی عمر کو پہنچ چکا تھا اور اس وقت اس نے اپنا بیاہ رچایا۔ اس کی بیوی ولش مشنری کے ایک ڈاکٹر کی بیوہ تھی۔ اُس سے اُس کے دو بچے ہوئے۔ ایلز بیتھ اور الان۔ جب ایلز بیتھ بارہ

سال کی ہوئی اور اَلان دس سال کا تو اس کی بیوی نے فیکٹری بکوا دی اور یہ خاندان انگلستان منتقل ہوگیا تاکہ وہاں بچّوں کو مناسب تعلیم دی جا سکے۔ اس طرح وہ انگلستان واپس ہو کر بکھنگم شائر کے ایک پُرسکون گاؤں میں آباد ہو گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ لیونل ٹریسا سن کو ان ہی باتوں تک محدود رکھنا مناسب نہ ہوگا۔ بچپن ہی سے اس کا ذہن ایجادات کی طرف مائل تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو پتہ چلا کہ ملیشیا میں رہائش کے دوران اس نے کوئی پچیس پیٹنٹ ایجاد کیے تھے۔ چھوٹے چھوٹے آلے، میکانیکل ہارن سے لے کر ایسے پمپ بھی اُس میں شامل تھے جن کی مدد سے بڑی بڑی کانوں میں سے پانی کا اخراج کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں اس نے بیزار ہو کر اپنی ایجادات اس لیے بند کر دیں کہ صنعت کاروں نے کچھ اور ہی طرح کی مصنوعات بنانی شروع کر دی تھیں۔

اس کے علاوہ لیونل ترلیسا سن کا وہ دور بھی آیا جب وہ اپنی درمیانی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اور اُس نے کلکتے کے قریب گاؤں میں ایک ہومیو پیتھک دواخانہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر جب وہ ضعیف العمری کو پہنچا تو اس نے روحانیات میں دلچسپی لینی شروع کی اور کلکتے میں تھیوسفیکل سوسائٹی کی میٹنگوں میں جانا شروع کیا۔ یہاں اُس نے کئی قوم پرستوں سے ملاقات کی اور اُن کا اعتماد حاصل کیا۔ اُس کے اس عمل سے برطانوی قوم ناراض ہو گئی تھی۔ اُسے اور اُس کی بیوی کو برطانوی حلقوں میں تضحیک برداشت کرنی پڑتی۔ کلبوں اور چائے کی دعوتوں میں ان لوگوں سے گریز کیا جانے لگا۔ لیکن لیونل ترلیسا سن کا کچھ بگڑنے والا نہ تھا۔ یوں بھی وہ برطانوی سوسائٹی سے پہلے بھی خوش نہ تھا۔ وہ ایک روسی خاتون کی حاضرات کی مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ روسی خاتون اونچی پوری عورت تھی اور اُس نے ایک اطالوی سے شادی کی تھی۔ وہ چورنگی میں ایک رسٹورانٹ چلاتی تھی۔ ان ہی حاضرات کی محفلوں میں اس کی ملاقات تردیپ کے دادا مسٹر جسٹس چندر شیکھر دتا چودھری سے ہوئی تھی جو خود بھی ہائی کورٹ کی تعطیلات میں ان حاضرات کی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کی ملاقاتیں انھیں محفلوں تک محدود رہیں۔ ایسے وقت میں جب دونوں ہی اس اونچی پوری روسی خاتون کا انتظار کر رہے ہوتے تاکہ وہ پہنچے تو ایوان دی ٹری بل کو جو اس کی

پسندیدہ روح تھی بلا سکے۔

اُس شام ترویب کی باتیں سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ نِک نے جب میرے باپ سے اپنے دادا کی طرح بننے کی بات کی تھی تو اس کے ذہن میں شاید یہ ساری باتیں رہی ہوں گی۔ وہ اپنے دادا لیونل تریساسن کی طرح عالمی سفر کا خواہشمند رہا ہوگا۔ دور دور مقامات کے سفر کرنا چاہتا ہوگا۔ لاپاز اور قاہرہ کی گلیوں سے گزرنے کی اس کی تمنا رہی ہوگی۔

دھندلی شام کا وہ وقت اور گول پارک میں بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ لندن میں تارے کیسا منظر پیش کرتے ہوں گے۔ آخر کار میں نے اس تڑپتی ہوئی روح کو پالیا ہے ایسی روح جو مجھے کسی اور دوست میں نہ مل سکی تھی۔

جب میں اُس تاریخی میز سے لگا کھڑا مسٹر گوالا کے پاؤں کے نشان دکھا رہا تھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ نِک کیا بلا ہے۔ کیا سچ مچ اس کے بال زرد ہیں۔ کیا وہ اُس کی پیشانی اور آنکھوں پر بکھر جاتے ہیں

پھر میں نے دریافت کیا کہ وہ کس طرح کا لڑکا ہے۔ اسے اسکول جانا پسند ہے کہ نہیں اور یہ کہ مستقبل کے لیے اُس کا کیا ارادہ ہے۔

مٹے نے وہاں پڑی ہوئی کرسی کو سیدھا کیا۔ اس پر بیٹھ کر وہ کہنے لگی۔ اوہ۔ وہ کافی بڑا لڑکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسکول کی تعلیم کے بعد اسے کیا کرنا ہے

وہ چارٹرڈ اکونٹنٹ کا کورس پورا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے بعد اسے بڑی تنخواہ پر کوئی معقول ملازمت ملے گی۔ پھر وہ انگلستان سے باہر جانا ترجیح دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انگلستان میں معاشی انحطاط آچکا ہے۔ یہاں سوائے وظیفہ یابوں کے دوسروں کو مناسب تنخواہیں نہیں ملتیں۔

میں نے کہا چارٹرڈ اکونٹنٹ کیا ہوتا ہے۔

وہ مسکرائی۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اس کے گال پر کالا دھبّہ پڑ گیا۔ پھر وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔ میں نہیں جانتی، میرا خیال ہے کہ ان کے پاس بڑے بڑے رجسٹر ہوتے ہیں جن میں حساب لکھا ہوتا ہے اور اُن پر سُرخ پنسل کے نشان لگانے جاتے ہیں۔

میں نے اُس کی کرسی کے قریب جا کر کہا۔ مٹے کیا اسے سفر پسند ہے، تمہارے دادا کی طرح...
اوہ سفر ہر شخص کے لیے ایک ہی مفہوم نہیں رکھتا۔ وہ سوالیہ انداز سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگی۔ میں نہیں جانتی کہ تم اُسے پسند بھی کرو گے۔

میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ میں تو پہلے ہی سے اُسے پسند کرتا ہوں۔

اُس نے جواب دیا۔ تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہماری طرح کا نہیں ہے۔

ہماری طرح سے کیا مطلب؟ ــــ میں نے پوچھا۔

اُس نے کہا۔ میری طرح نہیں ــــ نہ ہی ہمارے ماں باپ کی طرح۔ یا تردیب اور تمہاری یا کسی اور کی طرح نہیں۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کرتے کو جھٹک کر سانس کھینچتی ہوئی یقین کے ساتھ کہنے لگی۔ جو بھی ہو وہ ایک پیارا لڑکا ہے۔

میں نے کہا۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن میں اُس سے مل سکوں گا۔

مسکرا کر اُس نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور ملو گے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم اُس سے مل کر کیا بات کرو گے۔

تین سال بعد میری اُس سے لندن میں ملاقات ہوئی۔

ایک دن قبل روبی کو بوسٹن جانا تھا۔ ہم دونوں کو مسز پرائس سے ملنے کا انتظام اِلا نے کر دیا تھا۔ میں مسرور تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد سے اُس سے ملنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چار ہفتے گزر گئے تھے۔ اکیلے جا کر اس سے ملنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

بلومس بری طلباء کے ہاسٹل میں اِلا اور روبی مجھ سے ملے۔ میں وہاں عارضی طور پر ٹھہرا تھا۔ سہ پہر میں میں ڈائننگ ہال میں بیٹھا دم کے آلو اور پوری کھا رہا تھا۔ اور الٰہ آباد سے آئے ہوئے ایک ڈاڑھی والے لڑکے سے بات کر رہا تھا۔ یہ لڑکا ہاسٹل یونین کی صدارت کے انتخابات لڑ رہا تھا۔

ایسے وقت اِلا اور روبی دونوں وہاں داخل ہوئے۔

اِلا کی چمکتی آنکھوں اور بند ہونٹوں کو دیکھ مجھے خیال ہوا کہ وہ کوئی راز مجھ سے چھپا رہی ہے اور جب گوڈا اسٹریٹ کے ٹیوب اسٹیشن سے گزرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا کہ آخر وہ کیا راز ہے تو

وہ بڑی تیزی سے ہم دونوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

جب مارننگٹن کریسنٹ کا ٹیوب اسٹیشن ہماری نظروں سے دور ہو گیا تو اِلا نے اُس راز کا انکشاف اس طرح سے کیا۔ اُس سے سوال کیا۔ کیا تم جانتے ہو کہ ریسٹورنٹ پر کون ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

ممّی۔ روبی نے کہا۔

اِلا نے جواب دیا۔ نہیں، ممّی نہیں۔ ممّی تو اپنے آرکسٹرا کے ساتھیوں کے ساتھ گشت پر گئی ہوئی ہے۔

پھر وہ کون ہے۔ تمہیں بتاؤ۔

نِک۔ چمکیلی آنکھوں سے اُس نے کہا۔ نِک پرائس۔ اِدھر میں نے اُسے کوئی دس سال سے دیکھا نہیں ہے۔ تب وہ صرف انیس ۱۹ سال کا جوان تھا اور اس کے چہرے پر مہاسے تھے۔ اُن دنوں میرے دودھ کے دانت جھڑ رہے تھے اور منہ پوپلا تھا۔

روبی نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کویت میں چارٹرڈ اکونٹنٹ ہوگا۔ یا کچھ اور طرح سے خوب مالدار ہوگا۔

اِلا نے کہا۔ وہ وہاں ضرور تھا۔ بہت دنوں تک وہ باہر رہا لیکن چند ہفتے قبل ہی غیر متوقع طور پر وہ گھر واپس آگیا ہے۔ اس کا سبب میں نہیں جانتی مسز پرائس نے بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔

وہ اپنے آپ مسکراتی ہوئی سُرنگ کی سیاہ دیواروں کو دیکھتی رہی پھر کہنے لگی مسز پرائس کے پاس سے واپس ہونے کے بعد میں تم دونوں کو اپنی پسندیدہ ہندوستانی ریسٹورنٹ میں ڈنر کھلاؤں گی۔ مکایاپ ہام میں یہ ایک چھوٹی سی بنگلہ دیشی جگہ ہے۔ تم پسند کرو گے۔ ہم نِک کو بھی مدعو کریں گے۔ شاید وہ بھی آنا پسند کرے گا۔

میں نے دور ہی سے دیکھ کر اُسے پہچان لیا۔ دور تک جانے والے راستے کا جو نشان تھا اُس کے پاس وہ کھڑا تھا۔ اودے رنگ کے سوٹ میں ملبوس لکیروں والی ٹائی باندھے وہ اوپر سے سیاہ رنگ کا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جیسا کہ میں نے اس کے بارے میں سوچا تھا پہلے تو وہ مجھے بہت لمبا چوڑا لگا لیکن جب روبی اور میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ

کیا تو میرا خیال غلط نکلا۔ ایک عرصے سے ذہن میں بنے ہوئے تصوّر کی وجہ اور پلاٹ فارم کی سیدھی لکیروں کی وجہ میری آنکھوں نے دھوکہ دیا تھا۔ اُس کا چوڑا پن اس کے اُوور کوٹ کے دبیز ہونے کا سبب تھا اور اُس کا سر روبی کے کاندھوں سے اونچا نہ تھا اور یہی تو میرا قد بھی تھا۔

جب وہ اِلا سے ہاتھ ملانے کے لیے مڑا تو مجھے تعجب ہوا کہ وہ اپنی عمر سے بڑا لگ رہا ہے۔ اُس کا چہرہ ریگستانی سورج کی تمازت سے ماند پڑ چکا تھا لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ جب اس نے بات کی تو اُس کی سکڑتی ہوئی آنکھیں اور اس کے نیچے کی لکیریں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ ایک ایسا بینکر ہے جو دیوالیہ ہو چکا ہے اور جس کو دیا ہوا قرض ناقابلِ وصول ہے۔

اُس کے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر اِلا ہنسنے لگی۔ پنجوں کے بل کھڑی ہو کر اُس نے اپنے دونوں بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے اور اس کے ہونٹوں کا بڑے اشتیاق سے پیار لیا۔ خون کی تیز روانی سے اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی بے تکے پن سے ہنسنے لگا۔ چہرے کی رگیں ڈھیلی پڑیں تو اُس نے بھی اپنی باہیں پھیلا دیں اور اِلا کو اپنے سینے بھینچ لیا۔ جب وہ اُسے پیار کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بال اُس کی آنکھوں پر اسی طرح بکھر گئے ہیں جس کا نقشہ ایک عرصہ قبل اکتوبر کی ایک صبح اِلا نے میرے سامنے کھینچا تھا۔

اپنے بھورے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھا کرتے ہوئے میری طرف بڑھ کر اُس نے مجھ سے کہا ـــ تم سے مل کر کتنا اچھا لگا۔ ماں، منے اور کئی دوسرے لوگوں سے تمہارے بارے میں اس قدر سن چکا ہوں...

میں کیا کہوں۔ میں نے جواب دیا۔ میں تم سے پہلی بار نہیں مل رہا ہوں میں تو تمہارے ساتھ ہی پلا بڑھا ہوں۔

وہ حیرت میں پڑ گیا۔ پھر بڑی سادگی سے اس نے کہا۔ اس کے لیے تو تم نے کچھ کیا ہوگا۔ میں تو یہیں اس پرانے ویسٹ ہمپسٹڈ میں پلا بڑھا۔ اسی اُکتا دینے والے مضافاتی ماحول میں۔ پھر میں اپنی بڑائی جتانے لگا۔

جب ہم ٹیوب اسٹیشن سے باہر نکل آئے تو میں نے انھیں رکنے کے لیے کہا اور سڑک

کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا چونکہ یہ ویسٹ اینڈ لین ہے اس لیے وہ دوسری والی سوماترا نام کی سڑک ہے۔ یہی تو وہ جگہ ہوسکتی ہے جہاں ہوائی حملوں سے پناہ لی گئی ہوگی۔ اسی جگہ تمہاری ماں، روبی کی ماں اور تمہارے چچا آلان مل لین سے واپس ہوتے ہوئے اس کونے ہی کے آس پاس میں پناہ لیتے رہے ہوں گے۔ اسی زمانے میں سولنٹ روڈ پر ایک بڑا طاقتور بم پھٹا تھا۔ اور اُدھر وہ مکان سڑک کی بغل میں لمنگٹن روڈ کے کونے میں۔ یہی تو نام ہے اُس روڈ کا مینشن۔ یہیں پر تو وہ آگ پھیلانے والا بم گرایا گیا تھا اور ایک ساتھ دو منزلیں جل گئی تھیں۔ وہ پہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء کا دن تھا۔ دو دن قبل تمہارے چچا کا انتقال ہوچکا تھا۔

بک پرائس نے میری طرف شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔ پھر الا کو لے کر مجھے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

روبی ایک قدم آگے بڑھا۔ میری پسلیوں میں گھونسا مارتے ہوئے اُس نے کہا کیسی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہو۔ کیا میں نہیں جانتا کہ جرمنوں نے جنگ ختم ہونے کے کئی دن بعد تک کوئی طاقتور بم نہیں بنایا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں تو اُن کے پاس کوئی بھی ایسا بم نہیں تھا جو کسی گلی کو بھی تباہ کر سکتا۔

میں نے کہا۔ لیکن وہی تو ہوا تھا۔

روبی نے جواب دیا۔ تم کیسے جانتے ہو۔

ترد یب نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

وہ کس طرح جان سکتا۔ وہ تو نو سال کا ایک لونڈا تھا۔ کوئی بھی چھوٹا بم آتے ایک زلزلے کی طرح محسوس ہوا ہوگا۔

سنو۔ وہی تو ہوا تھا۔ میں نے اپنا جواب دہرایا۔

روبی نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ تمہیں اس قدر یقین ہے تو چلو چل کر دیکھ لیں کہ تمہاری وہ روڈ اب کیسی نظر آتی ہوگی۔

مناسب میں نے کہا۔ الا اور بک کو بتایا کہ ہم سولینٹ روڈ کو دیکھنے جا رہے ہیں جہاں بم گرا تھا۔

لالانے اپنا منہ بناتے ہوئے کہا ــــ تم اور تمہارا احمق بم۔ ہمیں دیر ہو چکی۔ اب جلدی کرو۔ ہم اُس کونے پر تم لوگوں کا انتظار کرتے ہیں۔

نِک نے ہنستے ہوئے کہا۔ سولینٹ روڈ تو ادھر رہی۔ تم ہمیں بتاؤ کہ کیا وہ ساری کی ساری تباہ ہو گئی۔

مجھے بتانے کی آسے ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کیونکہ اس کا نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ سوماتر روڈ کی طرف، سیدھی جانب، چوتھا موڑ۔

جب ہم وہاں پہنچے تو روبی نے کہا۔ لو ہم آگئے۔ یہی وہ تمہاری بم سے تباہ شدہ روڈ ہے۔ یہ بہت چھوٹی سڑک تھی۔ دونوں جانب باڑ اور درخت تھے۔ درختوں کا رنگ ہلکا سبز تھا جیسے انگلستان کا سبزہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی نزاکت بھرا۔ یہ دوپہر کی دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سڑک دونوں جانب سُرخ اینٹ کے مکانات ایک ہی طرح کے تھے۔ نیلی چھتیں، سفید دروازے اور کھڑکیاں۔ باڑ کے پیچھے سے باغیچہ نظر آتا ہوا۔ قطاروں میں کھڑی ہوئی دونوں جانب موٹر کاریں تھیں۔ ہماری داہنی جانب ایک اُودی سیٹریان کار تھی جس کے شیشوں پر ایک اشتہار چسپاں تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ وہیلز کو بچاؤ۔ پچھلی سیٹ پر بے ڈھنگی شکل کی چند بوتلیں تھیں۔ ان کے بازو پلاسٹک بکیٹ جیسی کوئی چیز سیٹ سے لگی تھی۔

کار میں رکھی ہوئی اُن تمام چیزوں سے میری دلچسپی بڑھی اور میں نے روبی سے پوچھا۔ کیا یہ شراب کی بوتلیں ہیں۔

اُس نے ہنس کر کہا۔ تم احمق ہو۔ وہ منرل واٹر کی بوتلیں ہیں۔

اور ــــ وہ ــــ وہ کیا ہے۔ پلاسٹک بکیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں پوچھا۔

وہ بچوں کے بٹھانے کی سیٹ ہے۔ کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اس میں بیٹھ کر کار میں بچے محفوظ رہتے ہیں۔

میری نظریں سیٹریان کار پر جمی رہیں۔ اس نے بغیر کسی توقف کہا۔

بس بھی کرو... اب کار کی بات۔ روبی نے جھلاہٹ میں کہا۔ تم اپنی بم سے تباہ شدہ سولنٹ روڈ کی طرف تو نظر ڈالو۔

میں نے روڈ کی طرف دیکھا جو پُر سکون تھی ۔ دونوں طرف خوبصورت مکانات ۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ پھر ہم دونوں ہنس پڑے ۔

میں نے اُس وقت کچھ نہ کہا ۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلطی کر رہا تھا ۔

مجھے اُن تمام چیزوں کے دیکھنے کی توقع نہ تھی جنھیں ترِدیب نے دیکھا تھا ۔ بالکل ہی نہیں ۔ کسی پہاڑی سے کٹ کر درخت کے پیڑ جس طرح زمین پر گرتے ہیں اسی طرح جلتے ہوئے مکانات سے اینٹ کے ڈھیلے گرتے ہوئے دیکھنے کی مجھے توقع نہ تھی ۔ جب کہ نہانے کا ٹب جوں کا توں محفوظ ہے ۔ مجھے اس بات کی بھی توقع نہ تھی کہ سڑک پر امدادی کام جاری ہے اور ملبے میں سے کسی آخری کمزور و ناتواں آدمی کو نکالا جا رہا ہے ۔ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ میں وہاں جڑوں سے اُکھڑے ہوئے پیڑوں کو دیکھ نہ پاؤں گا ۔ نہ تو وہاں ٹوٹی پھوٹی کھڑکیاں ہوں گی اور نہ بکھرے ہوئے گارے ۔ میں نے کسی ایسی چیز کی توقع ہی نہیں کی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ گذشتہ چالیس برسوں میں سب کچھ ملیامیٹ ہو جائے گا ۔

اس کے باوجود میں نے جو کچھ وہاں دیکھا میری آنکھوں پر مجھے یقین نہیں آتا تھا ۔ ہرے ہرے درخت ۔ کمر سے جھک کر چلتی ہوئی ایک بڑھیا ۔ اپنے گھروں سے نکل کر سڑک کے کونے میں پوسٹ آفس کی طرف بھاگتے ہوئے بچے اور ان کا شور و غل جیسے بہار کے موسم میں بکھرتے ہوئے گوگھرو ۔ میں یہ سب کچھ دیکھ سکا میری اپنی آنکھوں سے ۔ پھر بھی مجھے لگا کہ عرصہ قبل ترِدیب نے مجھے کلکتے میں سولینٹ روڈ کے بارے یا سچ ہی بتایا تھا ۔ اگر میں اس سڑک کے کسی کونے میں کھڑا سب کچھ دیکھنا چاہتا جو مجھے ترِدیب نے دکھایا تھا تو میں کبھی نہ دیکھ پاتا ۔ کوئی شخص کسی بڑھتے ہوئے درخت کو مہینوں دیکھتا رہے لیکن ٹھیک ، پھول کھلنے کے موسم میں موجود نہ رہے تو پھر وہ کچھ بھی دیکھ نہ پائے گا ۔

میں انگلستان کو جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا اپنی نظروں سے نہیں بلکہ اس کی اپنی خصوصیات کی بنا پر جو جنگ کے دوران غیر اتفاقی طور پر کھل کر سامنے آئی تھیں ۔

نِک اور اِلا اسی جگہ ہمارا انتظار کرتے رہے جہاں ہم انھیں پیچھے چھوڑ آئے تھے ۔ یہ ویسٹ اینڈ لین کی گلی تھی ۔ اسی میں ہمارا روڈ آ کر مل جاتی تھی ۔ نِک باتیں کر رہا تھا ۔ اُس نے

ہیں دیکھا نہیں تھا۔
وہ کہہ رہا تھا۔ کوئی بھی شخص کویت کو پسند نہیں کرے گا۔ وہاں پینے پلانے اور وڈیو فلم دیکھنے کے سوائے کچھ اور نہیں ہے۔ وہاں سے لوٹ کر میں بہت چین سے ہوں۔
الانے پوچھا۔ تو کیا تمہیں نئی نوکری مل گئی ہے۔
اس نے پوچھا۔ بہت جلد میں تلاش میں نکلوں گا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے کافی تجربہ ہے۔
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ بالوں پر سے ہٹا لیے۔
اس نے پھر کہا۔ چاہو تو کویت کے بارے میں کچھ بھی کہہ لو۔ پیسہ تو وہیں سے کمایا جا سکتا ہے۔ پیسہ ہی پیسہ۔ مڈ لینڈ میں کیا ہے۔ کسی معمولی کمپنی میں کام کرو اور چار پیسے کماؤ۔ جب اس کی نظر ہم لوگوں پر پڑی تو اس نے خوش ہو کر کہا۔
اوہ۔ تم آ گئے۔ تو تم نے بم شدہ روڈ کو اچھی طرح دیکھ لیا۔
روبی نے کہا۔ اس نے ٹھیک ہی پایا۔ لیکن جنگ کے ان تباہ شدہ ملبے کی جگہ اس نے ایک ایسی بڑھیا کو دیکھا جو کمر سے جھک کر چل رہی تھی۔
نک نے کہا۔ تم لوگوں کو راستہ تو ملا۔ کیا اب تم لوگ ۴۴ ہولمنگٹن روڈ کا راستہ تلاش کر سکتے ہو۔
میں نے کہا۔ میں کوشش کروں گا۔
تب تو آگے بڑھو۔
میرے باپ نے اے ٹو زیڈ کا جو اسٹریٹ اٹلس مجھے دیا تھا اس کی مدد سے میں اس روڈ کو تلاش کر سکتا تھا۔ مجھے صفحہ ۴۳ اسکیور ۲ لیف زبانی یاد تھا۔ وہیں ہو کر ہم آئے تھے۔ اس کی دائیں جانب لمنگٹن روڈ ہونا چاہیے۔ اس کی جگہ پر پہنچ کر مجھے زیادہ یقین آنا چاہیے تھا لیکن فوراً میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہمارے روبرو جو روڈ تھی اس پر تو دور دور تک قطاروں میں سرخ کویلو نما مکان تھے۔ میں نے جیسے سوچا تھا ویسے زاویہ نما مکانات ہی تھے اور نہ اونچے اونچے۔

تاہم جہاں تک میرا خیال تھا میں نے اشارے سے کہا کہ یہی تولنگٹن روڈ ہے۔
ہاں۔ نِک نے کہا۔ اچھے لڑکے۔ پہلی ہی کوشش میں کامیاب رہے۔
زیبرا کراسنگ کے پاس ہم لوگوں نے ویسٹ اینڈ لین کو چھوڑا اور دوسرے راستے پر چل پڑے۔ ہم لوگ دروازوں کے نقش و نگار۔ باغیچوں میں کھلتی ہوئی کھڑکیوں کے زاویئے اور لوہے کی بنی ہوئی طرح طرح کی پھاٹکوں کو دیکھنے میں محو تھے کہ میری نظر تھوڑے فاصلے پر کرکٹ کے میدان پر پڑی اور میں نے نمبر ۴۴ کو پالیا۔ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔ مجھے اس قدر جوش اور ولولے میں دیکھ کر میرے ساتھی مسکرانے لگے اور جب وہ میرے قریب پہنچے تو نِک قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔
اس نے میری انگلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بے شک تم مشرق کے ایک صوفی ہو۔
گھر کے قریب پہنچنے اور نِک کے پھاٹک کھولنے تک میں اوپر سے جھانک کر باغیچے کا مظاہرہ کرتا رہا۔ چیری کا درخت میری توقع سے زیادہ اونچا تھا۔
ہم لوگ پھاٹک میں داخل ہو کر باغیچے کا آدھا راستہ طے کر پائے تھے کہ سامنے کا دروازہ کھلا۔ مسز پرائس نے ہم لوگوں کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ دروازے پر کھڑی رہی۔ وہ لوٹے قد کی دبلی پتلی خاتون تھی اور عمر کی وجہ جھک گئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی چھوٹا تھا۔ لیکن آنکھیں مے کی آنکھوں کی طرح بڑی اور نمایاں تھیں۔ اُسے کم نظر آتا تھا۔ کچھ فکر مند لگتی تھی اور اس کی پیشانی پر رگیں تنی ہوئی تھیں۔ وہ ملٹری کے رنگ کی اسکرٹ، سفید بلوز اور بھورے رنگ کا جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔
میں نے اس کی بہت سی تصویریں دیکھی تھیں لیکن اُس کے صاف و شفاف رنگ کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ مجھے دور سے بھی اُس کی جلد کے اندر کی باریک رگیں نظر آرہی تھیں۔ وہ بے حد خوش تھی۔ کہنے لگی آخر کار ہم لوگوں کی ملاقات ہوگئی۔ افسوس کہ مے موجود نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ملنے کی بڑی آرزو مند تھی۔ اس نے کئی بار اس میزبانی کا ذکر کیا جو کلکتے میں ہمارے خاندان والوں نے اُن سے کیا تھا۔
نِک نے بڑی مسرت کے ساتھ کہا کہ میں نے گھر ہی کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کے گھر میں چیری کا درخت ہے۔

میں نے کھسیانا پن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ میں تو اس کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔

مسز برائس نے مسکرا کر کہا۔ تو پھر تمہیں گائڈ کا نقشہ دیا جائے گا لیکن پہلے ایک گلاس شری تو پی لو۔ یہ کہہ کر پہلے وہ ہمیں ایک ہال میں لے گئی پھر کوٹ لٹکانے کی جگہ بتاتے ہوئے آگے ایک بڑے روشن دان میں داخل ہو کر کہنے لگی۔

چلئے اب یہاں آیئے۔

میز پر ایک کشتی، کئی گلاس اور ایک ڈی کیانٹر رکھا ہوا تھا۔ ڈی کیانٹر کا ڈھکنا کھولتے ہوئے اُس نے خواہش کی۔

بتایئے۔ اب آپ لوگ کیا پئیں گے۔ میں تو کمرے کا جائزہ لینے میں محو تھا۔ اس نے اپنی بات دہرائی۔

ترد یب نے کبھی اس کمرے کی تصاویر مجھے دکھائی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں جب وہ اور اس کے ماں باپ ۴۲ لیمنگٹن روڈ پر قیام کیے ہوئے تھے۔ مسز برائس نے اس کے بھائی الان اور اُن تین دوستوں کو جو برک لین میں اس کے ساتھ رہتے تھے چائے پر بلایا تھا۔ صاحب کا ستارہ اُن دنوں عروج پر تھا۔ مہینہ ستمبر۔ آپ کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اس نے حال ہی میں ایک کیمرہ خریدا تھا اور اس دوپہر بہت سی تصاویر لی تھیں۔

اس دور کے تصاویر کی الگ صفت تھی۔ نہ عمر پہچانی جاتی نہ رنگ و روپ۔ تردیب جب ہم لوگوں کو اوپر اپنے کمرے میں لے گیا اور اپنا پرانا البم دکھانے لگا تو مجھے اپنے ماں باپ کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ایسا نہیں ہے کہ وقت کے ساتھ یہ تصویریں دھندلی پڑ گئی ہوں۔ ان دنوں کیمرہ پر اس کا انحصار تھا کہ اس کی آنکھ انسانوں کو کس طرح دیکھتی ہے۔

جدید دور کے کیمرے کی خصوصیت ہی الگ ہے۔ اُس کا رویّہ تو بڑا دوستانہ ہے۔ اور وہ ایسے ہی وقت میں تصویریں کھینچتا ہے جب لوگ بن سنور کر اس طرح پوز دیتے ہیں کہ وہ فطری لگیں۔ لیکن اس دور کا کیمرہ تو اپنی آنکھ رکھتا تھا۔ لوگوں کو اپنا چہرہ بنانا پڑتا، کاندھے سیدھے کرتے ہوئے اور کچھ اس طرح سے اکڑے رہنا پڑتا تاکہ ان کی ایک اچھی خاصی تصویر نکل آئے۔

مثال کے طور پر وہ تصویر لے لیں جس میں ایک بڑا گڑھا کھُدا نظر آتا ہے۔ استائپ اپنے پائیں باغ میں دو ہفتوں سے اُس گڑھے کو کھود رہا ہے۔ انڈرسین ہوائی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ گڑھا کھودا جا رہا ہے۔ جرمنوں کی بمباری سے بچنے کے لیے یہ مقام محفوظ ہوگا۔ لہٰذا اس گڑھے کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن تصویر میں یہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے۔ پھیلی ہوئی پھولوں کی کیاری کی طرح۔ شاید یہ کوئی مزاق ہی تھا کہ ان لوگوں نے اُس گڑھے کے دہانے پر کھڑے ہو کر تصویر کھچوائی تھی۔ یہ ترلیا سن کے کسی دوست کی تجویز رہی ہوگی اور شاید تصویر کھچوانے سے ذرا قبل وہ لوگ اس گڑھے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے کہ یہ ان کی پناہ گاہ ہوگا۔ لیکن جب کیمرے نے تصویر کھینچی تو صرف ایک ہی شخص مسکرا رہا تھا جیسے کیمرہ کی حدول حکمی کر رہا ہو۔ باقی تمام کے چہرے بڑے سنجیدہ تھے۔

بائیں جانب گروپ کے بالکل آخر میں استائپ ٹھہرا ہے۔ جیکٹ پر جگہ جگہ شکنیں پڑی ہیں اور گلے سے اُونی ٹائی ٹیڑھی میڑھی لٹک رہی ہے۔ وہ کوئی بڑی عمر کا آدمی نہیں اُس کے کاندھے جسم کی مناسبت سے بڑے ہیں۔ وہ کسی قدر خمیدہ بھی ہے۔ سر کیمرے کی طرف جھکا ہوا جس کے سبب روشنی اُس کے گنجے پن کو ظاہر کر رہی ہے۔ تصویروں میں وہی سب سے زیادہ عمر رسیدہ لگتا ہے۔ وہ ہے تو عمر رسیدہ لیکن اتنا نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک کُدال پکڑے ہوئے ہے۔ شاید اُس کی کوشش ہے کہ وہ بھی اس حکایت کا ایک حصّہ بن جائے جس کے لیے یہ تصویر کھچوائی گئی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ میں کُدال مضحکہ خیز ہے۔ جس طرح سے یہ اُسے پکڑے ہوئے ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اُس کا عادی نہیں ہے۔ کُدال کو اُس نے ایسے پکڑا ہے جیسے گود میں کوئی بچّہ لیے ہو۔ یقیناً وہ ایک اکیڈمک ہے۔ ہمپسٹڈ کالج میں انگریزی

کا لکچرار ۔ لیکن یہ نوکری اس نے عارضی طور پر چھوڑ رکھی ہے اور اب سے اغذیہ کی منسٹری میں کام سونپا گیا ہے۔

اسنا ئپ کے دائیں جانب ایک لمبا دُبلا پتلا آدمی کھڑا ہے ۔ اُس کا چہرہ بھی پتلا ہے ۔ اور وہ اپنی عینک کے موٹے عدسوں سے کیمرہ کی طرف ترچھا دیکھ رہا ہے ۔ جسم پر پھیکے رنگ کا سوٹر ہے اور ایک طویل اسکارف اُس کی گردن سے لپٹا ہے ۔ ایک موڑا ہوا اخبار اس کے جیکٹ کی جیب میں رکھا ہے ۔

مسز پرائس نے جب ڈان کا تعارف تردیب سے کروایا تو سب سے پہلے جس چیز پر اس کی نظر پڑی وہ اخبار ہی تھا اور جب ڈان کا تعارف مایا دیبی سے ہونے لگا تو اس نے اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر ڈان نے اخبار کھینچنا چاہا ۔ مایا دیبی نے اسے دیکھ لیا اور تردیب پر برس پڑیں ۔ ڈان نے جب دیکھا تو اس کا پھیکا چہرہ سُرخ ہو گیا اور بڑے تکلّف کے ساتھ اُس نے کچھ اس طرح کہا ۔

کوئی بات نہیں ۔ یہ تو صرف کاغذ ہے ۔ اسے لے لو ۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے اخبار نکالا اور تردیب کے ہاتھ میں تھما دیا ۔

تردیب نے دیر تک اُسے غور سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا یہ نیوز کرانیکل ہے ۔ ڈان نے حیرت میں اپنا سر ہلایا ۔ اس کا چہرہ مزید سُرخ ہو گیا تھا ۔ تردیب نے کہا کہ اگر وہ نیوز کرانیکل نہیں ہے تو پھر کیا ہے ۔

تردیب اکثر ولیسٹ اینڈ لین تک اپنے باپ کے لیے اخبار خریدنے جاتا تھا ۔ اسی لیے وہ اُن تمام اخباروں سے واقف تھا جنھیں اُس نے اخبار فروش کی دُکان پر دیکھا تھا ۔ اس کے پسندیدہ جرائد اسفیر اور پکچر پوسٹ تھے ۔ وہ نیوز کرانیکل کو بھی پسند کرتا تھا ۔ خاص طور پر اس میں چھپی ہوئی تصاویر کو ۔

یہ ڈیلی ورکر ہے ڈان نے کہا تو تردیب کی دلچسپی جاتی رہی اور اس نے اخبار لوٹا دیا ۔ اُس نے اس نام کا کوئی اخبار دیکھا تھا نہ سُنا تھا ۔ اُس نے ڈان سے پوچھا کہ وہ اسفیر کیوں پڑھتا ہے ۔ ڈان نے کہا کہ وہ اسے پسند ہے ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی وہ اسے ضرور پڑھتا ہے ۔

جہاں تک ڈیلی ورکر کا تعلق ہے وہ اسے بالکل نہیں پڑھتا ہے۔ وہ اس اخبار کے لیے کام کرتا ہے۔
تردیب اس بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے اس اخبار کے بارے میں کبھی سُنا لیکن بہر حال اس کی طباعت بھی دوسرے اخبارات ہی کی طرح تھی۔ اُس میں چند تصاویر بھی تھیں۔ وہ ذرا پیچھے کی طرف ہٹا اور ڈان کی طرف اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہوا پوچھنے لگا۔ کیا سچ مچ وہ اس اخبار کے لیے لکھتا ہے۔ پھر کہنے لگا کہ آج تک اُس کی ملاقات کسی اخبار میں لکھنے والے سے نہیں ہوئی۔

ہاں۔ ڈان نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

تردیب کھوج کرنے لگا کہ وہ کن موضوعات پر لکھتا ہے۔ اب ڈان بغلیں جھانکنے لگا۔ منہ لٹکائے کہنے لگا کہ وہ ٹریڈ یونینوں اور اسی طرح کی دوسری باتوں پر لکھتا ہے۔

تردیب کی حیرانی بڑھنے لگی۔ اس شام سے پہلے اسے ایسی بہت سی باتوں کا علم نہ تھا۔ اس کی جستجو بڑھتی گئی اور آخر کار وہ پوچھ بیٹھا کہ ٹریڈ یونین کیا ہے؟

ڈان الکت پلکت مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر تردیب کے سر کے برابر ہو گیا۔ اس نے دیر تک غور و خوض کیا لیکن اس سے قبل کے ڈان کوئی جواب دیتا مسز پرائس نے تردیب کو پرے لے جاکر اُس کے ہاتھ میں ایک کیک تھما دیا۔ اُس کے بعد اس نے مسز پرائس اور ڈان کو آپس میں کانا پھوسی کرتے سنا کہ تردیب تو اس طرح کے پیچیدہ سوالات کرتا رہتا ہے۔ اس شام تردیب اپنی بڑائی پر اتراتا رہا کہ اُس نے ایک اخبار کے کام نگار سے ایسا سوال کیا کہ وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔

اُس کے ایک عرصہ بعد تردیب کو پتہ چلا کہ ڈان نے کسی زمانے میں ٹراٹسکائٹ لفٹ کا ساتھ دے کر بڑا نام کمایا تھا۔ وہ کیمبرج کے ایک ایسے کیمسٹ کا بیٹا تھا جس کے پاس کیمسٹری کا ڈگری تھی۔ اُس کے بعد اُس نے لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھائی کی تھی۔ پھر اس نے قلیل عرصے کے لیے صحیفہ نگار کی حیثیت سے بائیں بازو کے اخباروں میں کام کیا تھا۔ اس کے بعد بہت جلد وہاں سے اس نے اسپین کی خانہ جنگی میں حصّہ لیا تھا۔ وہاں زخمی ہو کر اس نے بہت نام کمایا۔ وہاں سے انگلستان واپس ہو کر اس نے ایسے ورقیوں کی تحریروں میں مدد کی تھی جو نازی ازم سے متعلق تھے۔ اب تردیب کے لیے کسی شک کی گنجائش نہیں تھی

کہ ڈان سیاست کے میدان میں ترلیاسن کا رہنما تھا

ان تصاویر میں ایک تصویر ایسی بھی تھی جس میں ایک نوجوان ان کے پیروں سے لگا لیٹا تھا۔ سر کو ہاتھ کا ٹیکا لگائے کیمرے کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ گول مٹول تھا۔ گال بھرے ہوئے، بال گنگھریالے۔ چہرے کی ساخت اس کے گول اور گٹھیلے جسم سے میل کھاتی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی کہنی ٹریاسن کے جوتے پر ٹکی ہوئی تھی۔ ٹرلیاسن بے نیاز نظر آرہا تھا۔ نوجوان کوئی اور نہیں وہ مائیک تھا۔

جب وہ وہاں پہنچے تو مائیک نشے میں دھت تھا۔ کچھ اکھڑا سا لیکن طبعیت کا اچھا آدمی تھا۔ آنکھیں چندھائی ہوئی اور گالوں پر ہلکی سرخی فنچلے روڈ پر جو پب ہوا کرتے اور جہاں سے ڈراٹ بیئر دستیاب ہوتی تھی اسی بیئر کی بو تردیب نے محسوس کی۔ موٹے کپڑے کی ایک ٹوپی اس کے سر پر تھی اور وہ برساتی کوٹ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس نے جب بات کی تو تردیب کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ بعد میں مسز پرائس نے وضاحت کی کہ اس کا سبب مائیک پر آئرش لہجے کا حاوی ہونا تھا۔

مائیک کو شروع ہی سے صاحب پسند نہیں تھا۔ جب اُن کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا تو اس نے صاحب کی لکیروں والی ٹائی اور لوٹیٹ کے جیکٹ کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا پھر مچل کر پنجوں کے بل کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے۔

صاحب اپنی ٹائی سیدھی کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ میں ہندوستانی ہوں۔

مائیک نے اپنی ایک آنکھ میچ لی اور انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے تو آپ ہندوستانی نہیں معلوم ہوتے۔ کیا ابھی تک کسی انگریز کو مار نہیں ڈالا ہے۔

صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گھبرا کر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے اور تردیب کھس کھس ہنسنے لگا۔

تب آپ ہندوستانی کیسے ہوئے۔ مائیک نے ایک قدم آگے بڑھ کر سوال کیا۔ ترلیاسن اُن دونوں کے درمیان آگیا اور مائیک کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

خود ترلیاسن کی تصویر بیچ میں ہے۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا ہے۔ چونکہ وہ سب سے اونچا

ہے اس لیے وہ سب میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا چہرہ لمبا ہے اور آنکھیں گہری اور راست۔ اس کی آنکھوں کے کونوں اور اس کے ہونٹوں کے بیچ چند واضح شکنیں ہیں۔ یوں تو وہ صرف اٹھائیس سال کا ہے لیکن تصویر میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ جوانی اور ادھیڑ عمر کے درمیان کھڑا ہے۔ اس کے جیکٹ کے سیدھے ہاتھ کا آستین اس طرح سے لٹک رہا ہے کہ کوئی یہ مشکل ہی سے کہہ سکتا ہے کہ اس کے بازو میں کوئی نقص ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں ہڈیوں کی جگہ دھات کی سلاخیں ہیں اور وہ اپنے ہاتھ کو ٹھیک سے استعمال نہیں کرسکتا۔ اس کا سبب اس نے یہی بتایا کہ وہ کسی موٹر سائیکل کے حادثے میں زخمی ہوگیا تھا۔ لیکن مسز پرائس نے اس کو کبھی نہیں مانا۔ وہ ہمیشہ کہتی کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر ہے۔

پہلی بار اسے حادثے کے بارے میں اس وقت علم ہوا جب اسے فرانس سے ایک خط ملا تھا۔ لکھا تھا اسے ایک حادثہ ہوگیا ہے اور اس کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زخمی ہوگیا ہے اور یہ کہ وہ وردن کے دواخانے میں شریک ہے۔ تاہم اسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ فرانسکا پالوسے کے اس پر دستخط تھے اور سات کے ہندسے کا نشان اس کے ایک کونے میں تاریخ کے ساتھ بنا دیا گیا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے تھا اسے سمجھ میں نہ آیا۔ وہ شاید اسٹڈ گارٹ میں انگریزی پڑھاتا ہوگا اس نے سوچا۔ لیکن اس نے پڑھا تھا کہ وہاں پر وہ لوگ کچھ مصائب میں گھرے ہیں اور اب تو وہ یہاں سرحد کی دوسری طرف تھا اور ایک ایسے قصبے میں جو اس زمانے میں خطرات سے پر تھا۔ اور وہ وہاں ایک دواخانے میں پڑا ہوا تھا اور ایک ایسی خاتون اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی جو بہ یک وقت یہودن اور جرمنی لگتی تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ خود وہاں پہنچنے والی ہے تو اس کے کرسپانڈنٹ نے جواب میں فوراً لکھا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خود سے الان کی دیکھ بھال کر رہی ہے اور یہ کہ بہت جلد وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

لیکن ایک ماہ بعد جب وہ لندن واپس ہوا تو اس کی حالت غیر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ الان اس کے ساتھ کچھ دن ہمپسٹڈ میں ٹھہرا رہے تاکہ وہ اس کی نرسنگ کرسکے لیکن برک لین منتقل ہونے سے قبل صرف وہ ایک ہفتہ وہاں ٹھہرا رہا۔ اس نے حادثے کے

بارے میں اُلان سے دریافت بھی کیا لیکن اس نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ بات کو ٹالتے ہوئے اُس نے صرف اتنا کہا کہ رات کے وقت اُس کی موٹر سائیکل سڑک پر سے اُتر گئی تھی۔ مسز پرائس اپنے کو خطاوار سمجھتی رہی کہ اُس نے فرانس نہ جا کر غلطی کی ہے۔ اسی لیے اب اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ حادثے کا اصل سبب جاننے کے لیے اصرار کرے۔

تاہم اُسے اس بات کا اطمینان ہوا کہ جب وہ اُلان سے ملی تو وہ ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے مسز پرائس کو بتایا کہ اس کے دوستوں نے اسے ایک شخص وِکٹر گِلانکسن نامی پبلشر سے ملایا تھا جو لفٹ بک کے نام سے ایک کلب چلاتا تھا۔ اس شخص نے اُلان کو ایڈیٹنگ میں مدد دینے کے کام پر لگایا تھا۔

جب وہ تصویر لی گئی تھی تو اُس وقت اُلان لفٹ بک کلب ہی میں کام کرتا تھا۔ وہ آفس کانونیٹ گارڈن سے پرے ہنریٹا اسٹریٹ واقع تھا۔ لیکن جب جنگ چھڑ گئی اور کلب آفس برک شائر منتقل ہوگیا تو وہ استعفیٰ دے کر لندن ہی میں ٹھہرا رہا اور دوسرے جرائد ٹریبون اور ابزرور میں کبھی کبھی لکھ کر اپنی کمائی کرتا رہا اور ساتھ میں ہال بارن کے قریب برائڈس اسٹریٹ پر سوشلسٹ بک شاپ کے کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔

ڈان اور ترلیاسن کے درمیان فرانسکا ہالوے کھڑی ہے۔ چھریرے بدن کی طویل قامت، سیاہ زلفوں والی، چہرہ لمبوترہ اور کچھ غمزدہ۔ اس کا ایک ہاتھ ڈان کے کاندھوں پر ہے اور دوسرا اس کے سر پر کمان کی شکل میں جیسے وہ ڈانس کر رہی ہو۔ وہ ایک لمبی سیاہ اسکرٹ پہنی ہوئی ہے۔ اور اوپر سے کمر تک ایک تنگ جیکٹ۔ مایا دیبی اور مسز پرائس سب سے آخر میں کھڑے اس کے بانکپن سے متاثر اسے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مسز پرائس نے مایادیبی سے اکثر فرانسکا کا ذکر کیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ برک لین کے جس مکان میں فرانسکا رہتی ہے اس کے ساتھ دوسرے تین مرد رہتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ ٹھیک سے نہیں جانتی کہ فرانسکا کا حقیقی تعلق کس مرد سے ہے۔ اس کا حق تو اُلان پر ہے۔ یہی وہ سوچتی ہے۔ اس لیے کہ فرانسکا کو جرمنی سے نکالتے ہوئے اُلان زخمی ہوگیا تھا۔ لیکن مائیک کے ساتھ بھی فرانسکا بہت بے تکلف نظر آتی ہے۔ مسز پرائس نے دیکھا کہ فرانسکا نے

سب کے سامنے مائیک کا شرٹ اُس کی پتلون میں ٹکا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسز پرائس فرانسسکا کو پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کی اپنی کوشش کے باوجود، وہ یکدم خوش وضع ہے۔ بانکی بھی اور دنیا دار بھی۔ اسے امید ہے کہ اس کا بھائی کبھی ایسا نہیں ... ہے نا ...

اس کی ایک اور تصویر ڈرائنگ روم میں لی ہوئی ہے۔ یہ تردیب کی پسندیدہ تصویر ہے۔ اس پر سایہ پڑ رہا ہے۔ شام کی دھندلی روشنی میں کیمرے کے لینس کو پھیلا کر یہ تصویر لی گئی ہے۔ ایک بڑی آرام کرسی سے سب کے سب لگے ہیں۔ ڈرائنگ روم کا کچھ حصہ نظر آرہا ہے۔ کمرہ کشادہ اور بہت بڑا لگتا ہے۔ فرنیچر بہت کم ہے اور دیواریں خالی خالی۔ دوسری جانب جو دروازہ ہے وہ پائیں باغ میں کھلتا ہے۔ لیکن وہ ایک سیاہ دھبّے کی طرح نظر آرہا ہے جس پر وزنی پردہ پڑا ہے۔

فرانسسکا کرسی میں دھنس کر بیٹھی ہے۔ مائیک اور ڈان کرسی کے دونوں ہاتھوں پر ٹکے ہیں۔ تینوں آگے کی طرف جھکے ہوئے۔ چہرے دھندلے دھندلے۔ تینوں کے تینوں ہنس رہے ہیں۔ شاید صاحب نے فوٹو لیتے ہوئے اصرار کیا ہے۔ مسز پرائس اور مایا دیبی کرسی کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان آلان تریسا سن ہے۔ ان سب میں اونچا۔ مسز پرائس کی گود میں منّے ایک سفید گٹھڑے کی طرح ہے۔ اس کے سر پر بال بکری کی دُم کی طرح گندھے ہیں۔ وہ فخر سے مسکراتی ہوئی اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی ہے۔

اونچے قد کا تریسا سن جھک کر مایا دیبی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں بڑی نرمی ہے لیکن وہ پریشان حال دکھائی دیتا ہے۔

اس تصویر کے لینے سے چند منٹ قبل تریسا سن اور مایا دیبی نے پہلی بار ایک دوسرے سے بات کی۔ ساری شام اُن لوگوں نے آپس میں ایک بھی لفظ کا تبادلہ نہیں کیا تھا اس لیے ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے وہ عجیب محسوس کر رہے تھے۔ آخر کار تریسا سن نے اپنے حلق کو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ آپ نے انگلینڈ آنے کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے ہیں اور اب آپ یقیناً اپنے گھر کے بارے میں فکر مند ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟

مایا دیبی نے کہا۔ ہاں میں فکر مند ہوں۔ لیکن کیا کرتی۔ میرے بیٹے اور شوہر کا معاملہ تھا۔ اس میں میری پسند کا دخل نہیں تھا۔ اگر مجھے خود سے فیصلہ کرنا ہوتا تب بھی کسی مناسب وقت کا انتخاب نہ کر پاتی۔

وہ چونک پڑا۔ کیوں؟

مایا دیبی نے ہنس کر جواب دیا کہ چند مہینے جو اُس نے لندن میں گزارے ہیں وہ بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ اب تو گذشتہ چند ہفتوں سے یہاں کی فضا ڈرامائی طور پر بدل گئی ہے گلیوں اور بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کے دوست بنتے جا رہے ہیں۔ یہی تو محسوس ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنائیت کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ اور تردیب جب بھی باہر نکلتے ہیں تو لوگ تردیب کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور بات کرنے کے لیے رک جاتے ہیں۔ دُکاندار پوچھتے ہیں کہ وہ اور اُس کا شوہر پچھلے دنوں کہاں رہے۔ شوہر کا آپریشن کب ہونے والا ہے۔ یہ معاملہ صرف اسی کے ساتھ نہیں ہے۔ ہر شخص ہر دوسرے شخص کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کر رہا ہے۔ یہی کیا اس کی بہن الزبیتھ نے بتایا کہ مسز ڈبنار جو سڑک سے ذرا پرے رہتی ہیں۔ وہ بھی زندگی میں پہلی بار مہربان نظر آئی۔

ترلیاسن نے کہا۔ سچ ہے۔ ساری فضا شگفتہ ہوگئی ہے۔

ہاں تم نے ٹھیک لفظ استعمال کیا ہے۔ مایا دیبی نے کہا ــ شگفتہ ــ میں بڑی خوش قسمت رہی۔ زندگی میں یہاں پہنچ کر انگلینڈ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اگر میں یہاں نہ آئی ہوتی تو یہ سب کچھ دیکھ نہ پاتی۔

ترلیاسن ہنس کر کہنے لگا۔ لوگ مجھ پر یقین نہیں کرتے۔ یہی معاملہ جرمنی کا بھی ہے بلکہ وہ زیادہ عجیب ہے۔ یہاں واپس آنے کی ضرورت ہی تھی۔ شیشہ کے پار اُس طرف دیکھنے کے برابر ہے۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ صاحب نے کیمرہ کا بٹن دبا دیا۔ مایا دیبی شرماتی، مسکراتی ترلیاسن کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ساڑی کا پلّو اُس کے سر سے ڈھلک گیا ہے۔ اگرچہ کہ وہ عمر میں ترلیاسن کے برابر ہے لیکن دیکھنے میں اُس کی آدھی عمر کی لگتی ہے۔ چمکتی آنکھیں، معصوم اور دمکتا چہرہ۔

یہ تردیب کی پسندیدہ تصویر ہے۔ ترلیاسن کا چہرہ کچھ پریشان سا اور کھویا ہوا لگتا ہے۔ وہ خوش ہے کہ مایا دیبی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ تردیب جب بھی اپنے اس ہیرو کے بارے میں کہانیاں گھڑتا تو کہانی کا اختتام اسی بات پر ہوتا کہ ترلیاسن اور مایا دیبی ایک دوسرے کو کس شوق سے دیکھ رہے ہیں۔

تردیب کی اُس حرکت کا واقعہ میرے ذہن میں آیا جو اُس شام اس نے کی تھی۔ وہ کھڑکی سے لگا کھڑا رہے اور ترلیاسن کو اپنے دوستوں کے ساتھ لیمنگٹن روڈ سے گزر کر برک لین واپس ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ دیر ہو گئی ہے۔ گرما کے موسم کی شام کی شفق تاریکی میں بدل رہی ہے۔ جوں ہی وہ گھر سے نکل رہے ہیں سڑک کی بتیاں روشن ہو رہی ہیں۔ اچانک مائیک مشاق گھونسے باز کی طرح ترلیاسن کو گھونسے مارنے لگا۔ ترلیاسن بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ مائیک اپنا توازن کھو رہا ہے۔ تب ترلیاسن نے آگے بڑھ کر مائیک کو اس کی کمر سے پکڑ کر اٹھا لیا ہے۔ مائیک ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اب وہ سب اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے کاندھوں پر ڈالے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہیں اور اس طرح زور زور سے گاتے ہوئے گلی سے گزر رہے ہیں کہ مسز براٹس کے پڑوسی کھڑکیوں سے پردے ہٹا ہٹا کر انھیں دیکھ رہے ہیں۔

برسوں بعد بھی اُبھرتے ہوئے اندھیرے کے باوجود ہاتھ میں ہاتھ ملائے اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے منظر کو تاکہ تردیب کی آنکھوں میں جوں کا توں تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس کی وہ بچکانہ معصومیت تھی۔ ایک ایسا واہمہ جس پر یادداشت کی گہری پرچھائیں پڑی تھیں۔ انھیں یادوں کی بدولت وہ جانتا تھا کہ وہ برک لین کی طرف گھر جا رہے تھے اور ویسٹ معبد کے رخ پر لیمنگٹن روڈ کے اختتام پر انھیں بائیں جانب مڑنا تھا۔ لیکن برک لین والے مکان کے جس ماحول میں اسے رہنا تھا وہاں کی پیچیدگیوں سے وہ واقف نہ تھا۔ ان لوگوں کی نفسیات ان کا اتحاد اور ساتھ ہی ان کی سازشیں اور ان کا حسد۔ اُس کے ذہن کے ایک کونے میں اُس مکان کی پاکیزگی اور بڑائی کا احساس تھا۔ یہ اس کا یقین تھا۔ لیکن ذہن کے دوسرے کونے میں ایک اور احساس بھی تھا کہ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے بے سازشوں کا سامنا کرنا بھی ضروری

ہے۔ اس کی اس پریشانی کا سبب کیا تھا۔ یہ گندگی اُسے کہاں سے حاصل ہوئی۔ کیا یہ حمام کے اُن
ٹبس میں تھی جن کی صفائی نہیں ہوئی ہے یا یہ کہ اُس ہفتے کی چینی کے پیسے کون ادا کرے گا
یا پھر وہ جھگڑا کہ سونے کے کمرے میں کون کس کا شریک ہوگا؟ جو کچھ ہو اس لمحہ ہاتھوں میں
ہاتھ ڈالے لیمنگٹن روڈ سے گزر کر انھیں ایک ہفتے کا انتظار کرنا تھا جس کے بعد نازی سوویت
معاہدے کی وجہ اُن کے گھر کا پہلا سا نقشہ باقی رہنے والا نہ تھا۔

کون سی بات زیادہ ٹھوس اور حقیقی تھی۔ باتھ رومس کے غلیظ ٹبس، سونے کے کمرے،
یا ایک ہفتہ کا انتظار۔ ان سب سے زیادہ پریشان کن بات اس کے لیے یہ تھی کہ وہ نہیں
جانتا تھا کہ اُسے کسی حقیقت کا سامنا کرنا پڑے گا اور سب سے زیادہ خوفناک حقیقت
تو یہ تھی کہ وہ سال کے اندر اندر اُن چاروں میں کا ایک شخص مرچکا ہوگا۔ بم اور تارپیڈوز
کی وہ حقیقت کہ موت یوں ارزاں ہو جائے گی۔ معمولی سے وہ واقعات جنھیں ہزاروں
فلموں میں پیش کیا گیا۔ اور جن کی ہزاروں تصویریں لی گئیں اور جنھیں مزاحیہ کتابوں اور
رسالوں میں چھاپا گیا۔ کیا اس حقیقت کی اہمیت نہیں تھی جو زیادہ اٹل تھی۔ یہ حقیقت کہ
اس شام گلی سے گزرتے ہوئے اس بات کا علم رکھنا کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے تفصیلات
نہ سہی، وقت کا تعین نہ سہی، لیکن وہ جانتے تھے۔ وہ چاروں ہی جانتے تھے کہ ان کی دُنیا
کیا ہے۔ شاید وہ چاروں ہی جنگ کی تباہی سے بچ نہ سکیں گے۔ اُس احساس کو کیا نام دیا
جائے کوئی نہیں جانتا۔ کبھی کوئی جان بھی نہ پائے گا۔ کسی کی یادداشت میں بھی کچھ نہ ہوگا کیونکہ
تاریخ میں بھی کچھ ایسے لمحے آتے ہیں جنھیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔ کبھی کوئی یہ نہیں بتا سکتا
کہ ۱۹۳۹ء کے گرما کے اس موسم میں لندن یا برلن کے نوجوانوں کے ذہنوں پر کیسا کچھ
نہ گزرا ہوگا۔

اور اب تو وہ وہاں ہیں۔ گرم ہواؤں کے جھونکے کھاتے۔ ہنستے گاتے وہ برک لین کی طرف
لوٹ رہے ہیں۔

مس پرائس مجھے جس کمرے کے اندر لے گئیں وہ بڑا روشن اور ہوادار تھا۔ موزوں فرنیچر سے آراستہ۔ خوبصورت صوفے، نازک کرسیاں، نقش و نگار والی آرام کرسیاں، ایک بڑی چوبی میز، چھوٹے چھوٹے ٹیبل جن کے مکڑی نما پاؤں۔ کمرے کی کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ ایک طرف قرینے سے رکھے بڑے بڑے اودے چینی گلدان۔ کہیں دیواروں پر پورسلین کی گلکاری کی ہوئی پلیٹیں جن کے حاشیوں پر سنہری لکیریں۔ کہیں گلاب کی پنکھڑیوں سے بھرے ہوئے مرتبان۔ دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی گھڑیاں اور چاندی کے فریموں میں لٹکے ہوئے فوٹوگراف۔ دیوار میں واٹر کلر سے رنگی ہوئی، اُن پر طرح طرح کے پھول پتوں کے نقش و نگار۔ میں نے حیرانی میں چاروں طرف دیکھا تو مسز پرائس نے ایسے کہا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہو۔ اُس نے کہا کہ اُسے گرجا گھروں کی پرانی اشیا خریدنے کا شوق تھا اور یہ کہ جو کچھ اس کمرے میں موجود ہے، وہ اسی دیوانگی کا نتیجہ ہے۔

الا نے کہا۔ چلو کم از کم کمرہ تو بہت خوب تھا۔ تھا نا؟

ہاں میں نے کہا۔ بہت ہی خوب تھا۔ تب نک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں گھر کے محل وقوع سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح گلیوں سے۔

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی اور دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔ میں غلطی کر جاؤں تو درست کرنا۔ اگر میں اس دروازے سے گزروں اور دائیں جانب مڑ کر چند قدم سیدھا چلوں تو یہ راستہ رسوئی گھر جاتا ہے۔ سچ سچ کیا ایسا نہیں ہے؟ اور اگر رسوئی گھر پہنچنے سے قبل میں پھر دائیں جانب مڑوں اور آگے جانا چاہوں تو کیا میں ان سیڑھیوں تک نہیں پہنچوں گا جو سیلر میں داخل ہوتی ہیں؟

الا نے سر کو جنبش دے کر لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ حیرت ہے تمہیں یہ سب کیسے یاد رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ آمی نے گھر کے یہ سارے راستے مجھے بتائے تھے۔

آمی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میز کے اندر کھینچا تھا اور جب میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اُس نے گردن پر اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ اب یاد رکھو۔ باہر وہ روڈ رہی۔ اُس سے آگے لوگ

وہاں کرکٹ کھیلتے ہیں۔

پھر اُس نے اپنے ہاتھ سے گرد کو جھاڑا اور کہا۔ وہ دیکھو باغیچہ اور وہاں رہا گیلاس کا درخت اور وہ سامنے کا دروازہ وہیں سے تم گھنٹی بجا کر پائدان پر اپنا جوتا صاف کرنے کے بعد اندر جا سکتے ہو۔

اس کے بعد اُس نے ایک تنگ مستطیل بنایا۔ اُس کے اندر کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ ہال ہے۔ پھر ایک چوکور کھینچا اور کہا یہ ڈرائنگ روم ہے۔ یہاں سے تم باغیچے کو دیکھ سکتے ہو۔ اُن بڑی کھڑکیوں سے جھانک کر ۔۔۔ اس طرح پھر تم دروازے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو سکتے ہو۔ اسی سے لگا ہوا ترکاری کا باغیچہ ہے۔

گرد کے اوپر بنائے ہوئے ان نقشوں کو میں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے رینگ کر میری جانب جگہ کاٹا اور وہاں ایک دوسرے ہی کمرے کا نقشہ بنایا۔ اس بار ایک چھوٹا نقشہ۔ پھر کہا۔

یہ سونے کا کمرہ ہے۔ یہاں میں اور ماں رہتے ہیں۔ یہ ہال کی دائیں جانب ہے۔ پھر اُس نے مزید چند لکیریں کھینچیں اور کہا۔ یہ سیلر ہے اور یہ سیڑھیاں۔ یہاں پر میں اور بنک کبھی کبھی ہوزس کھیلتے ہیں۔

تم وہاں کیوں کھیلتی ہو۔ یہاں اس طرح میز کے نیچے کیوں نہیں کھیلیں۔ میں نے کہا۔

یہ تو ویسا ہی ہے۔ یہ میز سیلر جیسا ہی ہے۔ اس نے جواب دیا۔

کیا لوگوں کو علم نہیں کہ تم وہاں جاتی ہو۔ کیا وہ تمہیں روکتے نہیں۔ میں نے پھر سوال کیا۔

کیوں نہیں، وہ جانتے ہیں۔ وہ کیوں روکیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم لوگ کھیلتے ہی تو ہیں۔ اُس نے کہا۔

تم یہاں ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں کھیلتے۔ یا اُس باغیچے میں کیوں نہیں یا پھر وہاں کرکٹ کھیلنے کی جگہ۔

ہم ہر گھروندے بنانے کا کھیل نہیں کھیل سکتے۔ اس نے کہا۔ اس لیے کہ اس کے لیے نوکری تیار کیا ۔ اور پُراسرار جگہ چاہیئے ۔۔۔

پھر اس نے رینگ کر ایک اور جگہ میرے اطراف ہال۔ ہال اور ڈرائنگ روم سے گزرتے

ہوئے۔ اب کی دفعہ اس نے ایک تنگ مستطیل نقشہ ڈرائنگ روم کی دیوار سے لگا کر بنایا اور کہا — وہ سیڑھیاں ہیں۔ اس پر چڑھ کر تم سونے کے کمروں میں جاؤ گے۔

اس نے پھر چند اور لکیریں سیڑھیوں سے لگا کر کھینچیں اور کہا۔ وہ الزبیتھ آنٹی کا بڈروم ہے۔ ٹھیک ڈرائنگ روم کے اوپر۔ تم ان کھڑکیوں میں دیکھو تو کرکٹ کا میدان نظر آئے گا۔

میں نے یکلخت اپنے سر کو جنبش دی۔ یہ لکیریں میرا دماغ خراب کر رہی تھیں۔

میں نے جھلا کر کہا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ وہ سیڑھیاں نہیں ہو سکتیں۔ مسطح نہیں ہو سکتیں اور وہ اوپر کا کمرہ نہیں ہو سکتا۔ اوپر کے کمرے کو اوپر ہی ہونا چاہیے۔ وہ تو اوپر نہیں ہے۔ وہ تو ڈرائنگ روم سے متصل ہے۔

اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دھکا دیا۔ وہ طاقتور تو نہیں تھی لیکن مجھے پنجوں کے بل پیچھے ڈھکیلنے میں کامیاب ہوگئی۔ تم بے وقوف ہو۔ اس نے کہا۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔ اگر ہم سوچ لیں کہ یہ گھر ہے تو یہی گھر ہوگا۔ ہم ہر جگہ اپنا گھر بنا سکتے ہیں۔

نہیں۔ میں چیخا۔ یہ حقیقی گھر نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں۔

کیوں نہیں؟ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے گرد پر بنے ہوئے نقشوں کو میں نے حیرانی سے دیکھا۔

آخر کار میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ یہ حقیقی مکان نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ [illegible] کوئی برآمدہ نہیں ہے۔

اس نے دانتوں میں انگلیاں رکھ لیں اور حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ [illegible] چبھتی ہوئی نظروں سے لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

اس نے کہا۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ برآمدہ کو وہاں نہیں لا سکتے۔ میں نے اپنے نقشوں کو قریب کرتے اور کولہوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ کیوں نہیں۔

اس نے جواب دیا۔ اس لیے کہ وہ تو گڈا کا کمرہ ہوگا۔

گڈا۔ میں نے سوال کیا۔ مگر گڈا تو یہاں نہیں ہے۔

مگدا نام تھا الا کی گڑیا کا۔ میں نے ایک بار اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑی گڑیا تھی - الا جتنی بڑی۔ گلابی ہونٹ اور برف جیسے سفید بازو۔ سنہری بال اور نیلی آنکھیں جو اُسے چھوتے ہی کھل جاتی تھیں۔ یہ آنکھیں میرے لیے ایک معمہ تھیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ حقیقی ہیں کہ نہیں۔ لیکن جب میں نے انھیں چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو الا نے میری انگلیوں پر مارا اور چیخ کر کہا۔ تم مگدا کو نہیں چھوؤ گے۔

تب میں نے احتیاط برتی اور الا کو جواب دیا۔ ایک گڑیا کے لیے کمرے کی کیا ضرورت ہے۔

الا روہانسی ہو کر کہنے لگی۔ مگدا وہ گڑیا نہیں۔ میں حقیقی مگدا کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ ہماری بچی ۔۔ کسی بھی گھر میں ایک بچے کا ہونا ضروری ہے۔

دیکھنے میں مگدا کیسی لگتی ہے۔

اُس کے خوبصورت سنہری بال ہیں - الا نے جھلا کر کہا۔ وہ جیسے یاد کر رہی تھی - اُس کی نیلی آنکھیں ہیں اور وہ روزانہ اسکول جاتی ہے۔

کنڈر گارٹن ؟ میں نے سوال کیا۔

نہیں بالکل نہیں ۔۔ وہ باقاعدہ اسکول جاتی ہے۔

تب میں نے فخریہ کہا۔ تو پھر وہ بچی نہیں ہو سکتی۔ اسے ہماری عمر کی ہونا چاہیے۔

الا نے کہا۔ بے وقوف کہیں کے۔ ہم لوگ اب بڑے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کس عمر کی ہے۔ پھر اس نے جمائی لیتے ہوئے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور بیان جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ پہلے تو تمہیں بستر سے اُٹھنا اور کپڑے بدلنا چاہیے۔ پھر تمہیں اپنے کام پر جانا ہوگا۔ تمہارے جانے کے بعد میں مگدا کو لے کر اسکول جاؤں گی۔

اُس نے اپنے لباس کا دامن اُٹھایا اور سر اور کاندھوں پر پھیلا لیا پھر اپنے سینے کو کھولتی ہوئی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی اور کہا دیکھا۔ میں کتنی بدل گئی ہوں۔

اب اُس کا سینہ کھلا ہوا تھا۔ بالکل عریاں۔ صرف اودے رنگ کا ایک زیر جامہ تھا۔ وہ دبلی پتلی لگی۔ نیم اندھیرے میں اُس کے جسم پر سائے سے اُبھر رہے تھے۔ اس کے کاندھے ستوان تھے۔ جلد کے اندر سے ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ اس کی چوبی جیسی ہڈیوں کو دیکھ کر

مجھے کچھ سجھائی نہ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اپنی انگلیوں کو اس کی ننھی پسلیوں پر پھیرنے لگا۔ کبھی اُس کے کاندھوں کے اوپر تک اور کبھی اس کی بغل کے موڑ تک اور پھر اس کے پتلے پتلے بازوؤں سے گزر کر کہنی تک۔ کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی طرف۔ اس نے اپنی سخت کلائی سے اپنے سینے کو دبائے رکھا تھا۔ اُس کے نپّل کے اوپر ایک چھوٹا سا دھبّہ تھا۔ ایک گانٹھ۔

یہ کیا ہے۔ اسے میں نے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اُس گانٹھ کو اس کی جلد کی تہہ میں اوپر نیچے ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہوں جیسے کوئی مٹر کا دانا یا سرسوں کا بیج ہو۔ اندر دھنسا ہوا۔ میں نے یہ سوچ کر اُسے نوچا کہ وہ پھٹ پڑے گا۔ وہ کپکپانے لگی۔ میں بھی حیران و پریشان کپکپانے لگا۔

اُس نے چلّا کر کہا۔ رُک جاؤ۔ لیکن میں رُک نہ سکا۔

گانٹھ پر ہی میرا پورا دھیان تھا۔ اوپر مخملی غلاف اور اندر سختی۔ میں حیران تھا کہ اُس کا کوئی ذائقہ بھی ہوگا۔ چاہتا تھا کہ اپنی زبان سے چکھ کر محسوس کروں۔

رُک جاؤ۔ اس نے پھر کہا۔ اب تمہیں کام پر جانا ہے۔ ہم سوچ لیں گے کہ ہم مختلف ہیں۔

گھبرا کر جلدی سے میں نے اُس نیم اُجالے کمرے میں نظریں دوڑائیں اور پوچھا مجھے کام پر کس جگہ جانا ہے۔

وہاں — اُس نے بے ترتیب پڑے ہوئے چند میزوں کی طرف اشارہ کیا۔ نکلو یہاں سے۔ جب تک میں تمہیں آنے کے لیے نہ کہوں تم واپس نہ آنا۔ پلٹ کر اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھنا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔

میں اُن میزوں کی طرف بھاگا اور اپنی آنکھیں بند کیے وہاں کھڑا رہا۔ اونچی آواز میں گنتی کرتا ہوا جیسا کہ ہم آنکھ مچولی کھیلتے وقت اکثر کرتے ہیں۔ صرف پانچ منٹ ہوئے ہوں گے لیکن ایک عمر کے گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ میں نے سوئی کی گنتی صرف دو بار کی تھی۔ تب اِلا نے مجھے بُلایا۔ ٹھیک ہے۔ اب تم آسکتے ہو۔

وہ باغیچے میں گیلاس کے درخت پر جھکی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔ لیمنگٹن روڈ پر

کھیلنے والی بدبخت گیٹ تک پہنچنے سے قبل وہ چلا اٹھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ آج نگدا کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟

نگدا کو کیا ہوا۔ اس کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

کچھ کہنے سے قبل وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی اور وہاں بٹھا دیا۔

نگدا کے نئے اسکول میں اس جیسی لڑکی کو کسی بچّے نے دیکھا نہ تھا۔ اسکول کا پہلا دن اس کے لیے بڑا تکلیف دہ گزرا۔ وہ اُسے مسلسل اس وقت تک گھورتے رہے جب تک کہ مسز تولینڈ نے انھیں ٹوکا نہیں۔ مسز تولینڈ سے خوف کرتے رہنے کے باوجود وہ اپنی کتابیں اور پنسلیں ادھر اُدھر پھینک دیتے اور انھیں اُٹھانے کے بہانے نگدا کو دیکھ لیتے۔ پورے دو ہفتے گزر جانے کے باوجود آج بھی وہ اُسے گھورے جا رہے تھے۔

لڑکے ہوں کہ لڑکیاں۔ یہاں تک کہ ٹیچرس بھی۔ در اصل نگدا جیسی حسین لڑکی کو اس سے پہلے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ سونے کی طرح چمکتے ہوئے بال، سمندر کی طرح گہری نیلی آنکھیں اور تازہ سیب جیسے گلابی گال۔ ایسی حسین صاف ستھری لڑکیاں تو تمہیں آکسفورڈ اسٹریٹ کی دکانوں کے شوکیس ہی میں نظر آسکتی ہیں۔ کسی اسکول کے یونیفارم میں نہیں۔ اور وہ۔ جو بیگ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی تمام بیگوں سے نفیس اور عمدہ تھا۔ یہ خوبصورت بیگ تو اس کے باپ نے فلارنس میں خریدا تھا۔ دوسرے بچّوں کے چمڑے کے بدنما بیگوں سے تو اس کا مقابلہ ہی نہ تھا۔

اُن کے گھورنے پر تو تم بُرا نہیں مان سکتے۔ انھوں نے تو نگدا جیسی حسین لڑکی کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ وہ انھیں پسند تھی۔ سب ہی اس سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ لڑکے، لڑکیاں، ٹیچرس سب ہی۔ کھیل کے میدان میں بھی وہ اس کے قریب جا جا کر اس کے کان میں کہتے رہے کہ میں تمہاری قریب ترین ساتھی بننا چاہتی ہوں۔ لیکن صرف ایک لڑکی ایسی تھی جو پہلے ہی دن سے نگدا کے خلاف تھی۔ اُس کا نام تھا ڈینائز۔

ڈینائز بدصورت لڑکی تھی۔ اس کے سر پہ لٹکتے ہوئے تیل سے اٹے پٹے بال۔ اُس کے بالوں کو دھونے کے لیے اُس کی ماں نہیں تھی۔ وہ اُسے چھوڑ کر آسٹریلیا بھاگ گئی تھی۔ اس

کی جلد بد رنگ۔ کالے دھبے، گدلی آسکریم کی طرح تھی اس کی جلد۔ ٹیچرس بھی اسے تنفّر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

لیکن ہاں ڈینائز بڑی قوی ہیکل تھی۔ کلاس کے کسی مرد لڑکے کے مقابلے میں بھی قوی۔ ایک بار تو اُس نے گھونسے مار کر ایک لڑکے کے دانت توڑ دیئے تھے۔ اسی لیے سب اُس سے ڈرتے تھے۔ اُس سے دوستی کا بہانہ بھی کرتے تھے۔ اس بات کا فیصلہ بھی وہی کرتی تھی کہ کون کس کا دوست بنے گا۔ اُسی نے سب کو تاکید کی تھی کہ نگدا سے کوئی بات نہ کرے۔ لیکن ایک بار لڑکیوں کے درمیان نگدا پہنچ جاتی تو پھر ڈینائز کے بس میں کچھ نہ ہوتا۔ ہر شخص نگدا سے بات کرنے کا خواہش مند ہوتا۔ ڈینائز کے روکنے کا اثر کچھ نہ ہوتا۔ سے غیر حاضر پاکر موقع ملتے ہی لوگ نگدا سے باتیں کرتے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے ڈینائز کی نفرت نگدا کے لیے بڑھتی گئی۔ اور آج یوں ہوا۔ مسز تولینڈ نے ڈینائز سے بلیک بورڈ پر کچھ لکھنے کے لیے کہا۔ جب وہ لکھ چکی تو کلاس والوں نے پڑھا۔

John cot The Ball.

ساری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

تب مسز تولینڈ نے نگدا سے کہا کہ وہ اس جملے کو لکھے۔ نگدا واقف تھی۔ اس نے خوبصورت الفاظ میں لکھا۔

John caught the Ball.

مسز تولینڈ نے اسے شاباشی دی۔ اور ڈینائز کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ڈینائز تمھیں چاہیے کہ نگدا سے تم انگریزی سیکھو۔ حالانکہ یہ اُس کی نہیں تمہاری زبان ہے۔

تمام لڑکیوں نے ڈینائز کی طرف پلٹ کر دیکھا اور قہقہے پر قہقہہ لگاتے رہے۔ ڈینائز کو چپ رہنے اور سُننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب نگدا اپنی میز کی طرف جانے لگی تو اس نے ڈینائز کو کہتے سُنا۔ چھوٹے واگ میں تجھے باہر دیکھ لوں گی۔ اُس کے سُرخ چہرے کو دیکھ کر نگدا گھبرا گئی۔

آج اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس راستے سے واپس نہیں ہو گی جو اُس کا ہمیشہ کا راستہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہل فیلڈ روڈ سے ہو کر پارک پر سے گزرتی تھی۔ لیکن آج اس نے راستہ بدل دیا۔ اس نے سوچا کہ پارک سے پرے جو دوسری سڑک ہے اس پر سے وہ تیزی سے نکل جائے گی۔ اسکول کے بعد وہ چپکے سے اس طرح نکل پڑی کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ لیکن جوں ہی وہ پارک کے کونے پر مڑی تو اُس نے ایک آواز سنی۔ چھوٹے واگ۔ ننگ ناگ۔

اس نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس نے ڈینائز کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے اپنی چال بڑھا دی لیکن آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔ بھاگنا مت۔ چھوٹے واگ۔ ننگ ناگ۔

نگدا نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر وہ سیدھی سڑک پر بھاگتی رہی۔ یہی تو کہا گیا تھا۔ اب وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنا بیگ چھوڑ دیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بیگ کے کھونے پر بابا خفا ہوں گے۔ مُڑ کنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ناک کی سیدھ وہ مقدور بھر بھاگتی رہی۔ ڈینائز اپنے چار ساتھیوں کو لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ نگدا انھیں قریب آتے دیکھ کر اور تیز بھاگنے لگی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ پیچھا کرنے والوں میں بعض نے ہمت ہار دی ہے۔ اب تو اُسے صرف دو قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ ٹھپ ٹھپ پیچھے فٹ پاتھ پر آواز آ رہی تھی۔

اُس کے دونوں کانوں کے بیچ ایک مار پڑی اور وہ فٹ پاتھ پر گر گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو ڈینائز کھڑی تھی اور گالیاں بک رہی تھی۔ بلڈی واگ۔ ننگ ناگ۔

ایک بھرپور ہاتھ نگدا کے چہرے پر پڑا۔ اُس کا گال فٹ پاتھ سے جا لگا۔ اُس نے اپنے خون کو گرد میں لپٹا ہوا پایا۔ ڈینائز اس کے سینے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اس قدر قریب تھا کہ گلدا نے اس کی سانسوں کی گرمی محسوس کی۔

ننگ ناگ۔ اس نے کہا۔ ننگ ناگ۔ گندی پوٹّی۔ اس نے ایک گھونسہ نگدا کے منہ پر مارا پھر اپنا ہاتھ اونچا اُٹھایا۔ نگدا نے اپنی آنکھیں بیچ لیں۔ چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر وہ منتظر رہی۔ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ڈینائز اس کے مقابلے میں بڑی طاقتور تھی۔

شدید درد کی کیفیت میں اُس نے محسوس کیا کہ کوئی ڈینائز کو کھینچ کر اُوپر اُٹھا رہا

ہے۔ پہلے تو اُسے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب اس نے دیکھا تو وہ وہاں تھا۔ اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھے وہ اُس کے اوپر کھڑا تھا۔

بھاگ اب۔ نکل یہاں سے نِک پرائس ڈینائز سے کہہ رہا تھا۔

ڈینائز کا چہرہ پھول گیا اور وہ وہاں سے پنجوں کے بل بھاگ کھڑی ہوئی۔ جب وہ جا چکی تو نِک پرائس اپنے گھٹنوں پر مگدا کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اپنے کرتے کی آستین سے اُس نے مگدا کا چہرہ صاف کیا۔ پھر ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور اس کے منہ میں چاکلیٹ دیتے ہوئے کہا۔ چلو اب میں تمہیں گھر لے چلوں۔

میز کے نیچے نِک پرائس کے اسی انداز کو میں نے دیکھا تھا۔ نیکر پہنا ہوا۔ میری طرح کا لڑکا لیکن مجھ سے بہت بڑا۔ ایک بے بس لڑکی کو اذیت پہنچانے والے سے جھگڑا تے وقت اس کا چہرہ کس قدر غضبناک رہا ہوگا۔

لیکن تب ہی پتہ نہیں کیا ہو گیا کہ الارو پڑی۔

تین سال بعد جب میں نے اسی کمرے میں مئے کو وہ واقعہ سنایا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ چلو نا، یہاں سے باہر چلیں۔ یہاں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔

میں نے اسے پورٹیکو میں چمکتے سورج کی روشنی میں لے جانا چاہا تو وہ ایک ایسی سیڑھی پر گر پڑی جو نیچے صحن کی طرف جاتی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

اُس نے بڑی نرمی سے کہا۔ یہی تو ہوا تھا نا — تم جانتے ہو — کیا یہ صحیح نہیں ہے؟

میں نے اپنا سر ہلا دیا۔

اُس نے کہا۔ میں اس دن اتفاق سے گھر پر تھی اور جانتی تھی کہ الاکی مدد کرنے کے لیے نِک رُکا نہیں تھا۔ واپسی میں وہ بھاگتا رہا تھا۔ اُن دِنوں اسکول سے گھر لوٹتے ہوئے وہ بھاگتا ہی تھا۔

کیوں؟

مئے نے پیپل کا وہ پتہ توڑا جو سیڑھی اور اینٹ کے بیچ اُگ رہا تھا۔ اُس نے اُسے اپنے بالوں میں لگایا۔

میں ٹھیک سے نہیں جانتی اُس نے کہا لیکن میرا خیال ہے کہ نِک نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ اسکول میں اِلا کا کوئی دوست ہی نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اسکول جانے لگی تھی نِک گھر لوٹ کر جلد آنے لگا تھا۔ اُس دن اِلا کی کلاس میں کوئی ایسی ہی بات ہوگئی تھی جسے نِک نے شاید سن لیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی جلد گھر لوٹ آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ممی نے سبب پوچھا لیکن اس نے کبھی نہ کہا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد جب ہم لوگ اِلا کے بارے میں فکرمند ہوئے تو تب ہی کسی پولیس والے نے اُسے گھر پہنچایا۔ اُس کا جسم کچھ سوجا ہوا تھا کوئی اور بات نہ تھی۔ اس نے ہم لوگوں کو کبھی کچھ نہیں بتایا لیکن اس دن کے بعد سے پھر وہ اسکول نہیں گئی۔ اُس واقعے کے بعد ہی وہ لوگ وہاں سے منتقل ہو گئے تھے۔

تب میں نے اِلا کے بارے میں سوچا کہ وہ اسکول سے ہوکر ویسٹ ہمپسٹڈ کی گلیوں سے گزر رہی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ چل رہی ہے۔ ایک بیگ اس کے کاندھوں پر جھول رہا ہے۔ اُس کی چال تیز ہونے لگی ہے یہاں تک کہ وہ بھاگنے لگی۔ زور سے قہقہے مارتی ہوئی تاکہ لوگ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ کبھی کبھی خود میں نے دیکھا تھا۔ اِلا اپنے آپ مسکراتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اُس کے گال کے گڑھے میں ارتعاش پیدا ہو رہا ہے۔ نیلے آسمان کے نیچے سرد فضا میں وہ اکیلی چلی جا رہی ہے۔ اِلا جو کلکتے میں چاروں طرف سے رشتہ داروں میں گھری ہوئی ہے۔ نوکر چاکر اطراف کھڑے ہیں۔ کئی کاریں اس کے لیے موجود ہیں۔ کہیں اسے چل کر جانے کی ضرورت نہیں۔ اور وہ بھی اکیلے ہیں؛ ہم سب کس لیے تھے۔ میں، اس کے رشتہ دار، اُس کے دوست۔ ہم سب اُس کے ساتھ چلنے کے منتظر ہیں۔ اِلا۔ آن بان والی اِلا۔ جو دُور دُور ملکوں میں بسنے والے لڑکے لڑکیوں کے مزے دار قصے ہمیں سناتی ہے۔ اُن ممالک کے قصے جنھیں ہم نے اطلس میں دیکھا ہے۔ وہی اِلا تنہا جا رہی تھی۔ اس لیے کہ نِک پرائس کو کسی ہندوستانی لڑکی کے ساتھ چلتے ہوئے شرم آتی تھی۔

تمھیں اس کے بارے میں اس قدر غلط نہیں سوچنا چاہیے۔ میٹ نے کہا۔ اسے اصرار تھا کہ اُس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس عمر میں بچے اپنی ہی طرح کے بچوں کو چُنتے ہیں۔

کئی سال بعد ایک شام جب میں اپنی دادی کے بسترِ علالت سے لگا بیٹھا تھا اُس سے باتیں کر رہا تھا تو میں نے وہ تمام باتیں اُسے سُنا دیں جو اِلا نے مجھے بتائی تھیں۔ اور وہ باتیں بھی جنھیں میں نے ان میں شامل کر دیا تھا۔ دادی کی یہ آخری بیماری تھی۔ اس کے بعد پھر وہ اٹھ نہ پائی۔

حالانکہ اس شام دادی کے اطراف آکسیجن سلنڈرس، گلوکوس کی بوتلیں، انجکشن کی ایسی سوئیاں جو استعمال کے بعد پھینک دی جاتی ہیں اور علاج کی بہت ساری چیزیں رکھی تھیں اس کے باوجود وہ ایسی خوش تھی کہ اس سے پہلے بہت کم اُسے اس طرح دیکھا گیا تھا۔ جب وہ میری باتیں سُن چکی تو کہنے لگی۔ اس میں لڑکے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو اِلا کی غلطی تھی، مایا کی غلطی تھی، اُس ماں کی غلطی تھی جو بہت کم جانتی تھی۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ اُسے وہاں رہنے کا حق نہیں تھا۔ وہ اس مقام کے لیے موزوں نہیں تھی۔

اُس نے اپنا سر تولیہ میں چھپا لیا اور کھانسنے لگی۔ گرما کی تعطیلات میں جن دو ہفتوں کے لیے میں دِلّی سے آیا تھا مجھے ہر رات اُس کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ وہ مسلسل کھانستی رہتی۔ کوئی پاؤ گھنٹہ بعد اس کی کھانسی کا دورہ رُکا۔ وہ ہانپتی ہوئی پیچھے تکیے پر لڑھک گئی۔ دستی کو اپنے منہ پر ڈھانکتے ہوئے پلٹ کر اُس نے میری طرف دیکھنا چاہا۔ اُس کی روشن آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق چیخ پڑے گی۔ احساسِ ندامت کے ساتھ میں اپنی کرسی پر سے اُٹھا۔ واقعہ سنانے پر مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں نے اُسے چُپ کرنے کی کوشش کی۔

ایسی کوئی بات نہیں تھا ما۔ میں نے شال کو اُس کے کمزور شانوں پر اوڑھاتے ہوئے کہا۔ اب تم لیٹی رہو اور آرام کرو۔

اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اِلا کو وہاں رہنا نہیں چاہیے۔ وہ جگہ اُس کے لیے نہیں ہے۔ اُس ملک میں وہ کیا کر رہی ہے۔

وہ وہاں تعلیم پا رہی ہے تھا ما۔ میں نے بڑی نرم آواز میں کہا۔

اُن دِنوں اِلا لندن یونیورسٹی کالج میں تھی۔ تاریخ سے بی۔ اے کر رہی تھی۔

لیکن اُسے وہاں رہنا نہیں چاہیے۔ میری دادی نے چلّا کر کہا اور میرے ہاتھوں کو پرے کر دیا۔

واپس میں اپنی کرسی پر بیٹھا اُس کی طرف لاچار نظروں سے دیکھتا رہا۔ گذشتہ چند مہینوں میں اُس کا چہرہ مرجھا گیا تھا اور گالوں پر جلد لٹک رہی تھی۔ سوکھی جھُرّیاں تھیں۔

اِلا کو وہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس نے حلق کے اندر سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔ وہ جگہ اُس کے لیے نہیں ہے۔ اُس ملک کو بنانے کے لیے وہاں کے باشندوں کو ایک طویل عرصہ لگا ہے۔ سینکڑوں سال۔ کئی برسوں کی جنگ اور خونریزی سے گزرے ہیں۔ جو شخص بھی وہاں رہتا ہے اُس نے اپنا حق اپنے خونی رشتے کی بدولت حاصل کیا ہے۔ اپنے بھائی کے خون سے، اپنے باپ کے خون سے اور اپنے بیٹے کے خون سے۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کا ایک ملک ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا خون دے کر اس کی سرحدیں بنائی ہیں۔ کیا مایا نے تمہیں نہیں بتایا کہ ان کے تمام گرجاگھروں پر فوجی جھنڈے لہراتے ہیں اور انھوں نے جگہ جگہ ان سپاہیوں کی یادگاریں قائم کی ہیں جو ساری دنیا کی جنگوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ جنگ ان کا مذہب ہے۔ اسی سے تو کوئی ملک بنتا ہے۔ ایک بار ایسا ہو جائے تو پھر لوگ بھول سکتے ہیں کہ وہ کس کے کیا ہیں۔ مسلمان یا ہندو۔ بنگالی یا پنجابی۔ ان کا رشتہ ایک ہی خاندان کا خونی رشتہ بن جاتا ہے۔ ہندوستان کے لیے یہی تو تمہیں حاصل کرنا ہے۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا۔

اب بھی میں اسے اسی طرح دیکھ رہا ہوں جیسے آج ہی کی بات ہے۔ اُس کی آنکھیں خون آلود، بلغم ہونٹوں سے ٹپکتا ہوا اور وہ اپنی پلنگ پر لیٹی لیٹی بڑبڑا رہی ہے۔ جب بھی میں اُسے اپنے سامنے اس طرح بستر میں پڑے دیکھتا ہوں اور اُس کے ریشم دار بالوں کو اُس کے پسینے میں بھیگا ہوا پاتا ہوں تو میرے دل میں اُس کے لیے پیار امڈ آتا ہے۔ پیار ـــ اور ایک دوسرا جذبہ بھی ہے جو صرف رحم کا جذبہ نہیں۔ اس کے اظہار کے لیے شاید انگریزی میں کوئی موزوں لفظ نہیں۔ (Sympathy) ہمدردی۔ ایک ایسا نرم و نازک جذبہ صرف پیار یا صرف رحم نہیں ہے۔ یہ مجھ پر اس شدّت سے چھا جاتا ہے کہ اس کی بدولت اب بھی میں اس غصّے کو اپنے اندر محسوس کرتا ہوں جو اُس وقت اُبل پڑا تھا جب میں نے اِلا سے ذکر کیا تھا۔ اپنا سگریٹ

سلگاتے ہوئے اِلا نے جب جنگ باز فاشستوں کی بات کی تھی تو تب ہی میں نے اُس کے بارے میں تردید کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا: وہ فاشست نہیں ہے۔ وہ تو اس دور کے متوسط طبقے کی ایک خاتون ہے۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ورنہ اس طبقے کا ہر شخص کسی نہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک خیالی دنیا تخلیق کر لیتا ہے۔ وہ تو عالمی برادری اور تمام ممالک کے متحد ہونے کے تصور سے مچل جاتا ہے۔ ملکوں کی سالمیت اور فرد کی خود داری پر اُسے اتفاق ہے۔ وہ تو متوسط طبقے کے ایک فرد کی طرح جیتے رہنے کی آرزومند تھی۔ ایک چھوٹی سی آرزو لیکن جسے تاریخ نے جھٹلا دیا اور اسی لیے وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ہر دوسری صبح میری دادی مجھے اپنے کمرے میں طلب کرتی۔ اُس کے پہلو میں بیٹھ کر میں ہر دفعہ محسوس کرتا کہ اس کی آنکھوں میں خون بھرا ہے اور اُس کا چہرہ پھیکا پھیکا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ فکرمند نظر آتی ہے۔

کیا میں تمہیں بتاؤں۔ اپنے تکیے کا سہارا لیتے ہوئے اس نے کہا۔ اِلا وہاں کیوں رہتی ہے۔

میں نے اس سے لیٹے رہنے اور آرام کرنے کی سماجت کی لیکن اس نے میری بات کاٹی۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اِلا وہاں کس لیے گئی ہے؟ اس نے کہا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ بڑی حریص ہے۔ اسی لیے وہ وہاں گئی ہے۔ دولت کمانے کے لیے۔

تب میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اسے وہاں پیسے کے لیے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا۔ اس کے خاندان میں یہاں اتنا پیسہ ہے کہ وہاں اسے اس قدر نہیں مل سکتا۔ پورے خاندان میں وہی تو ایک لڑکی ہے اور تم جانتی ہو کہ وہ لوگ کتنے دولت مند ہیں۔ وہ یہیں پر رہے تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہوگا کہ وہاں ساری زندگی وہ کما نہیں سکتی۔ یہاں تو اس کے لیے کئی مکانات، کئی کاریں اور بے شمار نوکر چاکر بھی تو ہیں۔ وہاں تو یہ سب کچھ نصیب نہیں۔ وہ تو وہاں ایک معمولی سے سادہ کمرہ میں پانچ دوسرے طالب علموں کے ساتھ رہتی ہے۔ وہاں اسے برتن دھونا، کھانا پکانا اور وہ سب

کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تو اس کے لیے کوئی درجن نوکر دوڑے دوڑے پھرتے ہیں
صرف پیسے کی بات نہیں ہے۔ دادی چلّائی۔ وہ ساری اشیاء، وہ تمام چیزیں جنھیں پیسے سے خریدا جا سکتا ہے۔ ایسا فریج جیسے مسز سین کے داماد نے امریکہ سے لایا ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں۔ اور ٹونٹی سے برف کے کیوبس خود سے آپ کی گلاس میں گرتے ہیں۔ رنگین ٹی وی اور کاریں۔ کیمرے اور کیا کلکیولیٹرس۔ یہ تمام چیزیں تو تمہیں یہاں نہیں ملتیں۔
لیکن اُس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جھلّا کر کہا۔ اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے۔ آپ جانتی ہیں کہ اُسے پاکٹ منی پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ ایسی چیزیں خرید سکے۔ وہ خریدنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ اپنی فرصت کا وقت مظاہروں اور ایسے انقلابی ڈراموں میں کام کرنے میں صرف کرتی ہے کہ مشرقی لندن میں رہنے والے مہاجرین کا فایدہ ہو۔ آپ کو یاد ہوگا پچھلی بار جب اِلا وہاں تھی تو خود آپ ہی نے پوچھا تھا۔ کیا اِلا کمیونسٹ ہوگئی ہے۔
وہ بڑی حریص چھوکری ہے۔ بستر کی چادر کو اپنی کمزور مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے میری دادی نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اُس کی طرف داری کیوں کر رہے ہو۔ تم وہاں رہتے ہو اس لیے تم زیادہ جانتے ہو تو تم ہی بتاؤ کہ وہ وہاں کیوں رہتی ہے جب کہ پیسہ اور وہاں کی سہولتیں حاصل کرنا اُس کا مقصد نہیں ہے۔
اس دوران میرا غصّہ اتنا بڑھا کہ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک سال قبل گرمیوں میں اِلا کلکتہ آئی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ یونیورسٹی کی گرمائی تعطیلات میں رد بی اور میں دلّی سے آئے تھے۔
اِلا کا آنا اچانک تھا۔ لندن میں کالج کی چھٹیوں میں صرف دو دن قبل اس نے اپنا ارادہ کیا تھا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو برا ٹسلاویا ٹیلیفون کیا۔ باپ نے لندن میں

اپنے ٹراویل ایجنٹ کو فون کیا اور چوتھے دن بعد وہ کلکتے میں موجود تھی۔

یہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میرے والدین کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ دلّی سے جب کالکا میل ہاوڑا اسٹیشن میں داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اسی پلیٹ فارم پر تو وہ قدیم گھڑیال لگی تھی جس کی سوئیاں ہمیشہ نو پر رہتیں۔ میری ماں سمندری سبز رنگ کے لباس میں ملبوس تھی اور اس خیال سے مسرور تھی کہ چھٹیوں میں میں اس کے پاس آگیا ہوں۔ میرے والد ہمارا لگیج نکلوانے میں جُٹ گئے تھے۔ ہم نے روبی کو ان کے بیلے گنج پیلیس میں پہنچایا جہاں وہ اپنے ماں باپ سے ملنے دارجلنگ جانے سے قبل دو ایک روز گزارنا چاہتا تھا۔

کوئی گھنٹہ بھر تک میں دسترخوان پر اپنے چار مہینے کی بھوک مٹاتا رہا۔ پھر بھی ماں کی تشفی نہ ہوئی۔ وہ پوچھتی رہی کہ مجھے مزید کیا چاہیے اور یہ کہ ڈنر میں کیا کھانے بنائے جائیں۔ میری دادی نے اعلان کیا۔ تم اُس کے ڈنر کی بات مت کرو۔ شام میں وہ یہاں نظر نہیں آئے گا۔

کیوں؟ میری دادی چلّائی اور میری آنکھوں میں گھورنے لگی۔ اس لیے کہ الا آئی ہوئی ہے۔

دادی کی بات پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

ماں نے پوچھا: الا یہاں ہے! آپ کو کیسے معلوم؟

دادی نے کہا۔ اُس نے کل ہی ٹیلیفون کیا تھا۔ کوئین وکٹوریہ نے اس سے میری صحت دریافت کرنے کے لیے کہا تھا۔

آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ ماں نے سوال کیا۔

اس لیے کہ میں چاہتی تھی کہ تمہارا بیٹا دوپہر کا کھانا یہاں کھائے۔ دادی نے جواب دیا۔

وہ کیسی ہے؟ کیا اس نے کچھ کہا؟ میں نے پوچھا۔

میری دادی نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مزے میں ہے۔ گذشتہ گرمیوں میں جب وہ یہاں آئی تھی اُس سے بھی اب بہتر ہے۔ بال گردن تک، کٹے ہوئے جیسے ٹوتھ برش پر بنتے ہیں۔ تنگ جامہ پہنے ہوئے کسی خیراتی اسکول کی بازاری عورت لگتی تھی۔

حیران ہوں کہ وہ اب کیوں آئی ہے۔ میری ماں نے جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے

کہا۔ اتنی گرمیوں میں ؟

گھنٹہ بھر بعد اِلا نے اپنے یلجن روڈ ہوز کے کمرے میں بیٹھے ہوئے بتایا وہ ان دنوں اس لیے آئی ہے کہ اس کی بھی چھٹیاں ہیں اور اسے گئے ہوئے بھی تو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ مجھے اپنی دستی سے چہرہ کا پسینہ صاف کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ میرے مقابلے میں گرمی تمہیں زیادہ ہی پریشان کرتی ہے۔

اس نے سچ ہی کہا تھا۔ گرمی نے اسے چھوا نہیں تھا۔ کٹے ہوئے بالوں میں وہ اپنی عمر سے کم لگتی تھی۔ ایک طرح سے لڑکا نما۔ وہ چھریرے بدن کی بھی تھی۔ اُس کے بازو بید کی چھڑی کی طرح تھے۔ گال میں گڑھا ابھی ویسے ہی تھا۔ لگتا تھا کسی بیرون ملک سے درآمد کی گئی ہے۔ مدہم ہوتے ہوئے اودے رنگ کی جین اور شرٹ پہنی ہوئی۔ میں نے ایسی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی سوائے ان تصویروں میں جو امریکی رسالوں میں چھپتی ہیں۔

وہاں وہ اونچی چھت والے کمرے میں تھی۔ سہ پہر کے وقت نیم سبز نیم اندھیرے ادھ کھلے کمرے میں۔ آرام کرسی پر وہ پوری طرح دراز نہیں تھی۔ اپنے دونوں پاؤں کو پیچھے کیے ہوئے اس طرح کہ اُس کی ناف کا وہ حصہ جو جینس اور ٹی شرٹ کے درمیان تھا اندھیرے میں چمک رہا تھا۔ جسم کرسی میں جھول رہا تھا۔ سر پیچھے کی طرف اسی کے ہاتھ پر ٹکا ہوا۔ کاٹن کے ٹی شرٹ کے اندر سے جھانکتی ہوئی دو نکیلی چھاتیاں جو سانس کے اُتار چڑھاؤ سے کبھی نرم اور کبھی سخت لگتی تھیں۔ پھر بھی سیاہ دائروں میں گم ہو جاتی تھیں۔ چھاتی پر دکھائی دیتا ہوا نمایاں خال۔ اپنے جسم کی ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز چھوٹے بچے کی طرح وہ کرسی میں بیٹھی رہی اور میں اپنے رگ پٹھوں کو رانوں میں قابو میں کرتا ہوا اور چڈے میں ہونے والے درد کی پروا کیے بغیر پیٹ کے بل دوسری طرف پلٹ گیا اور ایک جریدہ اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس سے درد میں اضافہ ہوا جیسے اس کی شدت سے عضو پھٹ پڑے گا۔ میں اُس سے دور کھسکنے لگا اور فرش پر پھسلتا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری کیفیت سے واقف ہو۔ اس لیے نہیں کہ شرم آتی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اُس کی دوستی کا پاس تھا۔ اس کا احترام تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے رشتے کی کچھ اقدار ہیں۔ اس میں میرا مقام

ایک کزن کا تھا۔ شاید ایک چہیتا کزن۔ پھر بھی ایک کزن۔ اُس سے بڑھ کر نہیں۔

روبی کے دارجلنگ روانہ ہونے سے ایک دن قبل ہم لوگوں نے ایک دن اُن کے گھر پر آرام سے گزارا ایک یادگار دن کمرے میں فرش پر چاروں طرف لڑھکتے ہوئے ٹھنڈی جگہ کی تلاش میں آگے بڑھتے ہوئے۔ جھگڑتے ہوئے۔ جب سہ پہر گزر چکی اور سورج غروب ہونے کو آیا تو الا نے کھڑکیاں کھول دیں۔ سڑک پر ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہوئی کاریں۔ اُن کا منظر جیسے "ناٹک" کا کام کر رہا تھا۔

ادھر آؤ۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ چلو کہیں باہر چلیں۔ یہاں سارا دن اسی طرح پڑے رہنا نہیں ہے۔ اور پھر روبی تو کل جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسے ایک پارٹی دیں۔

روبی تنک کر فرش پر بیٹھ گیا۔ جو کتاب وہ دیر سے پڑھ رہا تھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے مداخلت کی۔ پارٹی اور اس گرمی میں؟

ہاں۔ الا نے کہا۔ ہم لوگ کہیں چل کر مزے کریں گے۔

روبی اور میں دونوں ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے۔

پھر میں نے کہا میرے پاس کافی پیسے ہیں۔

اُس نے ہنس کر کہا۔ پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ پارٹی میں دوں گی۔

لیکن ہم جائیں گے کہاں؟ روبی نے پوچھا۔

میں بتاؤں گی۔ الا نے کہا۔ ہم لوگ گرانڈ ہوٹل جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ اُس جگہ نائٹ کلب ہے۔

ہم لوگ نائٹ کلب میں کیا کریں گے۔ روبی نے پوچھا۔

ہم کچھ بیئر پئیں گے۔ الا نے جواب دیا۔ اور کیبرا ڈانس دیکھیں گے۔ ایسی ہی دوسری چیزیں۔

روبی چلایا۔ بیئر پئیں گے۔ ایسی جگہ پر؟

کیا مطلب؟ اُس نے فوری سوال کیا۔ تم پیتے ہو کہ نہیں؟ اس واقعے کے بارے میں بتاؤ تم نے ہی سنایا تھا کہ کالج کے ساتھیوں نے تمہاری وداعی پارٹی کی تھی! تم بڑے منافق ہو۔

اس طرح کے فیصلے کرنا الاخوب جانتی تھی اس لیے کہ اس کے پاس اخلاق کا صرف ایک ہی معیار تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کی عزت کرنا جانتی تھی جو اُصولاً گوشت نہ کھاتا ہو لیکن ایسا شخص جو صرف اپنے گھر کی حد تک ویجیٹیرین ہوتا اُسے وہ بدترین منافق قرار دیتی ۔ وہ جانتی تھی کہ کس طرح روبی رم کی بوتلیں کالج روم میں لاتا تھا باوجود یہ کہ اسے کالج سے خارج کر دیئے جانے کا اندیشہ تھا اور پھر دوستوں کے ساتھ رات رات بھر پیتا تھا۔ یہ کام تو کسی معصوم شرارت کے طور پر نہیں تھا اور نہ اس میں اس کے لیے غیر ضروری قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خوش ہونے والی کوئی ایسی بات تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی کہ آج وہ کسی نائٹ کلب میں پیتے ہوئے اپنے کو گرا ہوا کیوں محسوس کرے گا جب کہ دوسرے لوگ بھی پینے والے ہی ہوں گے اور اُن کی آنکھیں اس کی غماز ہوں گی۔ روبی کی دانائی الاکی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ موقع و محل کے لحاظ سے مصلحت برتنا وہ جانتی ہی نہ تھی۔

یہ ایک معمولی سی بورژوا حرکت ہے۔ الانے ایک بار روبی کے بارے میں مجھ سے کہا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ تمہارے کالج میں شہرت کیسے پا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اسٹوڈنٹ کا مطلب تنگ نظری سے انحراف۔ ویسے چھوٹی جماعت کے طالب علم اپنے ایسے ساتھیوں کی عزت کرتے ہیں جن کے رگ پٹھے مضبوط ہوتے ہیں اور ہاں روبی میں اسی کی تو کثرت ہے۔

خود میں مخمصے میں پڑ گیا جب مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ کالج میں روبی کا بڑا رعب ہے یقین نہ آتا تھا کیونکہ کالج میں کوئی بھی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں روبی نے کوئی نمایاں مقام حاصل کیا ہو۔ اسپورٹس میں بھی اس کی حیثیت نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ گیارہ کھلاڑیوں میں کا ایک تھا۔ وہ اچھا پڑھتا تھا اس کا معیار اونچا نہ تھا۔ ہوشیار وہ نہیں تھا۔ بڑھیا لباس وہ نہیں پہنتا تھا۔ کسی خاص صلاحیت کا وہ حامل نہ تھا۔ کالج کے اُن ایک درجن طالب علموں میں بھی اُس کا نام نہ تھا جنھوں نے اپنے کسی نہ کسی وصف کی بدولت شہرت پائی تھی۔ پھر بھی کوئی وجہ تھی کہ لوگ اسے توقیر سے دیکھتے اور یہ بات کسی دوسرے ذہین طالب علم کو بھی نصیب نہ تھی۔

یہ جاننے کے لیے مجھے وقت لگا کہ اس توقیر کا سبب اُس کی وہ سادہ لوحی تھی جسے وہ ہر شخص کے ساتھ برتتا تھا۔ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے کے لیے وہ ذرا بھی توقف نہ کرتا تھا کیونکہ وہ جن مفروضات کو برتتا تھا

میں بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اپنی جسمانی طاقت اور بہادری کی وجہ اُسے کسی کی مدافعت کا بھی ڈر نہ تھا۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ ہمارے کالج میں ایک لڑکے سے چھوٹی سی لغزش ہوگئی۔ اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اُس لڑکے نے ایک طالبہ سے اپنے کمرے تک ایک چائے کی پیالی یا ایسی ہی کسی چیز کے لانے کی فرمائش کی تھی۔ اسٹوڈنٹس یونین نے بہ اتفاق آرا، ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن تنہا روبی وہ شخص تھا جس نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ نہ اُس نے کوئی بحث کی نہ ہی کوئی تقریر۔ صرف یونین کی میٹنگوں میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور بعض یونین کے لیڈروں نے جب اُسے مار پیٹ کی دھمکی دی تو انھیں حیرت ہوئی کہ روبی طاقت آزمائی پر آمادہ ہوگیا۔ نتیجتاً ہڑتال کو واپس لے لینا پڑا۔

بعد میں میں نے اس سے پوچھا۔ میری خاطر تو بتاؤ کہ تم نے ہڑتال میں حصہ کیوں نہیں لیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے کہا۔ قاعدہ ایک قاعدہ ہی ہوتا ہے۔ اگر اسے تم توڑو تو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لیکن کیا یہ اچھا قاعدہ ہے۔ میں نے پوچھا۔

وہ صرف مسکرایا۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن اس نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ جواب نہیں دے سکتا۔ اس نے جو بڑائی حاصل کی تھی اس کے پیچھے اُس کے وہ پوشیدہ فیصلے تھے جنھیں ہم اخلاقی کہتے ہیں اور جس کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ اسے مباحثے کا موضوع نہ بنایا جائے۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ روبی کی رائے ہمیشہ قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دوسرے لوگ نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی نہ کسی مغالطے کا شکار رہتے ہیں لیکن مشکل سے مشکل مراحل میں بھی روبی کی چھٹی حس کام کرتی رہتی ہے اور وہ راست جان جاتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ کوئی کام کیوں کرنا ہے اسے جاننے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کی بات مان جاتے۔ وہ تنہا ان سب مسائل اور پیچیدگیوں کا حل ڈھونڈ نکالتا

جس میں دوسرے خوامخواہ کے پھنسے ہوتے۔ بالکل اسی وجہ سے ہم سب اس سے ڈرتے بھی تھے اور اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ اس کی جرأت کا سبب اس کی جسمانی طاقت بھی رہی ہوگی لیکن اہم سبب اس کی اخلاقی قوت تھی جو بے داغ تھی۔

آؤ۔ ایک آدھ بار تو مزے کرو۔ اِلا نے کہا۔ کسی طرح تم تو یہاں سے جانے والے ہی ہو۔ بعد میں سب کچھ بھول جانا۔

لیکن تم گرانڈ ہوٹل جانا کیوں چاہتی ہو۔ روبی نے پوچھا۔

اس لیے کہ شہر کی وہ سب سے بڑھیا ہوٹل ہے۔ اِلا نے اپنا سر پیچھے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ کیا یہ معقول وجہ نہیں ہو سکتی؟

میں ایسی جگہ جانا نہیں چاہتا۔ روبی نے کہا۔

لیکن اِلا جو فیصلہ کرتی تھی اُسے پورا کرنا جانتی تھی۔ اس نے روبی کے سامنے جھک کر اپنی پیشانی کو اس کے قدموں سے لگا دیا۔

کرم کرو روبی کاکو۔ اس نے کہا۔ صرف ایک بار۔ اگر آپ کو پسند نہ آئے تو ہم واپس ہو جائیں گے۔ میرا وعدہ۔

اس طرح ہم لوگ گرانڈ ہوٹل کے لیے روانہ ہو گئے۔ سلک کے بلوز اور اسکرٹ میں اِلا بانکی لگ رہی تھی۔ مجھے اور روبی کو اصرار تھا کہ ہم لوگ اپنے طالب علموں کے لباس کرتے اور میلے پاجامے ہی ہوں گے۔

جب ہم ہوٹل کی گیٹ پر پہنچے اور اُس چوکیدار کو دیکھا جو شملہ پہنے مچھلی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا تو روبی کو اور مجھے لگا کہ ہمیں وہاں داخلہ نہیں ملے گا۔ ہمیں واپس چورنگی کی گلیوں کی طرف لوٹنا پڑے گا لیکن ہمارے پیچھے پہنچی۔ سلک کے کپڑوں کی سرسراہٹ کے ساتھ وہ ہمیں آگے ہانک لے گئی اور ہم کاریڈارے ہو کر فانوس لگے ہال میں داخل ہو گئے۔ پھر وہ ہمیں رسیپشن کاؤنٹر تک لے گئی۔ وہاں اُس نے اپنے مخصوص انگریزی لہجے میں تحکمانہ انداز میں نائٹ کلب کا رُخ دریافت کیا۔ کچھ حیران کچھ پریشان اُن لوگوں نے ایک اٹنڈر کو ساتھ کر دیا کہ وہ نائٹ کلب تک ہماری رہبری کرے۔ وہ ہمیں اندر ایک اور کاریڈار کی طرف لے گیا

اور ایک بڑے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کا پٹ کھول کر اس نے اِلاکی دی ہوئی ٹپ اپنی جیب میں ڈالی اور ذرا ہٹ کو سر جھکائے کھڑا رہا۔

اندر سے کہیں الیکٹرک گیتار کی موسیقی کی بازگشت ہمیں سنائی دے رہی تھی۔

میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ روبی نے کہا اور اپنا ہاتھ اِلا کے ہاتھ میں سے کھینچ لیا۔ اِلا کا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

اوہ، چلو تو۔ اِلا نے سانس زور سے کھینچتے ہوئے کہا۔ چلو تو انکل روبی۔

اندر کی طرف اتنا اندھیرا تھا کہ ویٹر الیکٹرک ٹارچ کی مدد سے ہم لوگوں کو لے کر ایک خالی میز کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنے چہرے پر کسی بھیگی ہوئی شئے کو مس کرتے دیکھا۔ فطری طور پر میرا ہاتھ اسے نکال پھینکنے کے لیے اٹھا۔ میں نے دوبارہ اسے اپنے ہاتھ پر محسوس کیا اور پیچھے کی طرف اچھل گیا اور ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔

اپنی جلد پر جھرجھری محسوس کرتے ہوئے میں چلایا۔ یہ کیا چیز ہے۔ کس چیز نے مجھے چھوا ہے۔

یہ سجاوٹ کی اشیا ہیں جناب۔ ویٹر نے کہا اور آگے بڑھ کر ایک خالی میز پر ہم کو روکا۔ پھر اس نے اِلا کے لیے ایک کرسی کھینچی۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ اور جب ہماری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو ہم نے دیکھا کہ کسی کو وہاں خالی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ چاروں طرف کھجور اور ناریل کے درختوں کا سماں ہے۔ دیواروں پر ناریل کے پتوں کے نقش و نگار اور چھت پر سے جیسے ناریل لٹک رہے ہوں۔ اِلا نے سامنے بینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ناچنے کے فرش سے لگا ایک پلیٹ فارم تھا۔ اس پر چار آدمی سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ لوٹائی لگائے اور تنکوں کی ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔

دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اِلا نے کہا۔ میرا خیال ہے یہاں سمندر کے ساحل کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں کیے اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور مسکرائی پھر اس نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ کیا ہم بیئر منگوائیں؟

اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہاں کر دی لیکن روبی نے کچھ نہ کہا۔

کیا تم اس بات کا بہانہ نہیں کر سکتے کہ تم کالج میں ہو۔ اِلا نے کہا۔ شاید اس طرح تمہاری

منافقت کا درجہ گھٹ سکتا ہے۔

روبی نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔ جب ویٹر آ گیا تو اُس نے کہا۔ ہمارے لیے تین بیئر لے آؤ۔

اُس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا دیئے اور الا کی طرف دیکھنے لگا اور اپنے کاندھے اِدھر اُدھر گھمانے لگا۔

اُس نے کہا۔ ٹراٹسکائٹ کے کامریڈ اس بات سے واقف ہیں کہ جب تم انقلاب کے مظاہرے نہیں کرواتیں تو اپنا وقت کس طرح صرف کرتی ہو۔

وہ مسکرائی اور اپنی انگلیوں کے پوروں سے روبی کے گالوں کو چھوا۔ پھر کہنے لگی۔ تم تو انقلاب کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ احمق اور ہاں وہ جانتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کیونکہ ٹراٹسکائٹس تمہاری طرح اہلکارانہ ذہن نہیں رکھتے کہ زندگی کی لطف اندوزیوں سے یوں محروم ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے آپ سے ناراض ہو گئی۔

چلو، بڑھو۔ روبی۔ اُس نے اصرار کیا۔ اب تو یہ تمہاری آخری شام ہے۔ ہم لڑیں گے نہیں۔

اس بات سے روبی اور بھی ناراض ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے وہ جب سچ مچ خفا ہوتا تو کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لمحے بیئر کی بوتلیں آ گئیں اور وہ ہماری گلاسیں بھرنے میں مصروف ہو گیا۔ جب ہماری گلاسیں بھر گئیں تو اُس نے اپنی گلاس اُٹھائی اور ایک ہی سانس میں آدھی گلاس خالی کر گیا۔ پھر وہ تھوڑا سا پیچھے جھکا۔ اپنے منہ کو صاف کیا۔ سانس کھینچ کر گلاس میں گھورنے لگا۔

جب ڈرم کی زوردار آواز آئی تو میں نے نجات محسوس کیا۔ بینڈ والوں کے ہیڈ نے مائیکروفون پر اعلان کیا۔ خواتین و حضرات۔ آپ کے سامنے گیت پیش کرنے کے لیے جینیفر یہاں موجود ہیں۔ اُن کے لیے تالیاں بجائیے۔

مس جینیفر اندھیرے سے نکل کر کورنش بجالاتی ہوئی سامنے آئی اور آدھی جھک گئی۔ کاغذ کی طرح سفید اور بردبار عورت۔ چست لباس پر چمکی کا کام جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

خوش آمدید۔ خوش اخلاقی سے لیکن اونچی اور بیہنہ ورانہ آواز میں اُس نے سب کو مخاطب

کیا۔ لیجئے اب تیار ہو جائیے۔ آپ سب کے سب۔ ایک آنگوں بھری شام کے لیے۔

رنگ بدلتی روشنیوں کے دائرے اس پر پڑنے لگے اور اس کے لباس پر ٹنگے ہوئے پھول مزید جگمگانے لگے۔ اسی حالت میں وہ ہمارے قریب کی دوسری میز تک آ گئی۔

رس بھری آواز میں اس نے میکروفون سے اعلان کیا۔

ہمارے پاس اب کون ہیں۔

تجارت پیشہ دو آدمی جو پاس ہی میں بیٹھے تھے شرما شرما کر ہنسنے لگے۔ اس نے ان کے گالوں کو تھپکا لیکن جب انھوں نے اسے چھونے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائے تو اس نے انھیں چپت رسید کی اور ڈانس کرتی، گاتی اور زبان گھولتی ہوئی ان کی پہنچ سے نکل گئی۔

اپنی پلکوں کے جھروکے سے وہ ان کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ میری، میری۔ کیا ہم آج شریف ہو گئے۔

اگر وہ ادھر آئے گی تو میں تو اس کے دانت توڑ دوں گا۔ روبی جیسے اپنی گلاس سے باتیں کر رہا تھا۔

وہ ڈانس کرتی ہوئی فرش کے بیچ پہنچ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ڈرامائی انداز میں اوپر اٹھائے جیسے کوئی بلندی سے چھلانگ لگانا چاہتا ہو۔ پھر چلّا کر کہنے لگی۔ ٹھیک ہے لوگو ـــ آج ہم کسی نیلی آنکھوں والوں کے سامنے ناچیں گے۔ آج رات ہم کسی اجنبی کے ساتھ ناچیں گے۔

اِلا نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ہاں یہ بات ہوئی۔ ہم ناچیں گے۔ مزہ آجائے گا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ـــ چلو تو۔ اٹھو، ہم ناچیں گے۔

لیکن میں نے تو اپنی محرومیوں کو اس وقت بھی دعوت دی جب ایسی حرکتوں کو میرا من چاہا تھا۔ جب میری نظریں اس لمبے چوڑے فرش پر پڑیں جس کے بیچ کھڑی جینیفر اپنے ہاتھ ہلا رہی تھی اور ان تجارت پیشہ بھوکی نظروں پر بھی جو جینیفر کو تاکے جا رہے تھے تو میں جان گیا کہ میرے قدم اس فرش تک پہنچنے کے لیے کبھی آگے نہیں بڑھیں گے۔

میں نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا ـــ نہیں۔ میں وہاں نہیں جا سکتا۔

مجھ سے ناامید ہو کر وہ روبی کی طرف مڑی اور کہنے لگی۔ روبی کیا تم ڈانس کرنا پسند کرو گے؟

میں ڈانس نہیں کر سکتا اس نے کہا۔ پھر سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا۔ اگر مجھے ڈانس کرنا آتا تب بھی ایسی جگہ پر میں ہرگز نہ کرتا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی بیٹھی رہو۔ تم ڈانس کرنے کے لیے وہاں نہیں جاؤ گی۔

یہ سُن کر پہلے تو اُسے بہت تعجب ہوا۔ میں ڈانس نہیں کروں گی ؟ اُس نے کہا۔ کیوں نہیں ؟

اس لیے کہ میں تمہیں کرنے نہیں دوں گا۔ روبی نے سختی سے جواب دیا۔

تم مجھے نہیں کرنے دو گے ؟ اِلا نے کہا۔ اُس کے چہرے کی رگیں سکڑنے لگیں۔ تم مجھے نہیں کرنے دو گے ؟ اس نے کہا۔ تم اپنے کو سمجھتے کیا ہو ؟

روبی نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ میں کوئی ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُس نے کہا۔ میں تمہیں ڈانس کرنے نہیں دوں گا۔

اب اِلا مجھے دیکھنے کے لیے پلٹی۔ اُس کے ہونٹ پھیکے پڑ گئے۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں اُس کے کالج میں نئی نئی داخل ہوئی ہوں۔ یا کوئی ایسی بات ؟ کیا وہ سمجھتا کہ اس کے رگ پٹھے مضبوط ہیں اور میں کسی کالج کے غنڈے سے گھبرا جاؤں گی۔ دیکھوں وہ مجھے کیسے روکتا ہے۔

اُس نے اپنی کرسی کو لات ماری اور پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی۔

میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کے اسکرٹ کا دامن پکڑ لیا۔ اِلا پلیز ایسا نہ کرو۔ میں نے کہا۔ تم اُسے نہیں جانتیں۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔ ہم گھر چلیں۔

اُس نے میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا اور کہا۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں ہم دیکھیں کہ وہ مجھے کیسے روک سکتا ہے۔

میں اُچھل کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ اِلا پلیز تم کرنا کیا چاہتی ہو ؟

اُس نے مجھے ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔ میں وہاں اُن دونوں تاجروں کے پاس جاؤں گی اور اُن میں جو کم موٹا ہے اُس سے کہوں گی کہ وہ میرے ساتھ ناچے۔

یہ کہہ کر وہ اپنی ایڑیوں کے بل مُڑی اور چل پڑی۔

اپنی کرسی میں دھنسا ہوا روبی اُسے اُن دو تاجروں کے قریب جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اِلا

اُن کے قریب پہنچ کر مسکرانے لگی۔ اُس کے بعد اس نے بات کرنے کے لیے اپنا سر اُس آدمی کی طرف جھکایا جو دونوں میں نسبتاً کم موٹا تھا۔ وہ فوراً ہی اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ الا کو اپنے قریب پاکر اُس کے چہرے کی رونق بڑھ گئی۔ پھر وہ الا کی طرف لالچی اور مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دوبارہ مسکرائی۔ اس شخص نے بڑے اشتیاق سے آگے بڑھ کر الا کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

میں نے روبی کی کرسی کی کھرچتی آواز سنی۔ اسے روکنے کے لیے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنی سے مجھے ایک طرف ڈھکیلتا ہوا صرف تین ڈگ مار کر وہ اُن کے پاس پہنچ گیا۔ بلوز کے گلے سے الا کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اُس کو تاجر سے دور پھینکا۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلی اُس آدمی کے بیچ سینے پر رکھ دی۔ کاندھے سے گھما کر روبی نے اُسے ایک ایسا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر اپنی کرسی پر گر پڑا۔

گانے والی کے ہاتھ سے میکروفون چھوٹ گیا۔ آرکسٹرا کا بینڈ متحرک روشنیوں میں سفید رنگ کے ٹیبلو میں تبدیل ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ پھر ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلا۔ ہوٹل کے تمام ویٹروں نے ہمیں گھیر لیا۔

صرف ایک شخص جو ہر طرح سے مطمئن تھا وہ روبی تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا اور بڑی پُر سکون اور نرم آواز میں کہہ رہا تھا۔ میرے قریب نہ آنا۔ ہم بل ادا کر دیں گے اور فوراً یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن میرے قریب نہ آنا۔

اُس نے اپنی پاکٹ نکالی اور پچاس کی نوٹ ایک ویٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ الا کے کاندھے پر رکھتے ہوئے ہم لوگوں کو لے کر باہر نکلا۔ تمام ویٹر دس فٹ پاتھ تک ہمارے پیچھے آئے۔

ہم لوگوں کے میوزیم تک پہنچنے تک الا نے ایک لفظ نہ کہا۔ جب وہ سڑک کے کونے پر پہنچی تو وہ رُکی اور اُس نے ریلنگ کا سہارا لیا۔

کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ اس نے الفاظ منہ میں رولتے ہوئے روبی سے کہا۔ تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے تھے:

سنو۔ روبی نے کہا۔ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اب اسے بالکل بھول جاؤ۔

ہم اُسے نہیں بھولیں گے۔ دھیمی آواز میں لیکن شدید احتجاج کے ساتھ جیسا کہ عورتیں اکثر کرتی ہیں اس نے کہا۔ ہم اُسے بھول نہیں سکتے۔ لیکن مجھے اتنا تو بتا دو۔ تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے تھے۔

اِلاسنو۔ روبی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تمہیں وہ نہیں کرنا چاہیے تھا جو تم نے کیا تمہیں جاننا چاہیے کہ لڑکیاں ایسی حرکت نہیں کرتیں۔

کیا بے ہودگی ہے؟ اس نے جھٹ سے کہا۔ لڑکیوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میرا من جو چاہے گا کروں گی اور جس جگہ اور جب جو چاہوں کروں گی۔

تم نہیں کرو گی۔ روبی نے کہا۔ میری موجودگی میں تو ہرگز نہیں۔ یہاں لڑکیاں ایسی حرکتیں نہیں کرتیں۔

کیوں نہیں؟ وہ چیخی۔ یہ کیسی بے ہودہ بات ہے۔

تم جو چاہو انگلینڈ میں کر سکتی ہو۔ اُس نے کہا۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں تم یہاں نہیں کر سکتیں۔ یہ ہمارا کلچر ہے۔ ہم اس طرح رہتے ہیں۔

وہ آنکھیں پھیلا کر اُسے خاموش گھورتی رہی۔ پھر وہ میری طرف مڑی۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ وہ چلائی۔ اس حرکت کے ساتھ اس نے اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ زار و قطار اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں تھاما اور اپنی طرف کھینچا۔ اُس نے اپنا چہرہ میرے کرتے سے رگڑا اور بلک بلک کر روتی رہی اور کہتی رہی۔ کیا تم دیکھ رہے ہو۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟ میں اُسے تسلی دیتا ہوا اپنے الفاظ دہرا رہا تھا۔ کیا دیکھا؟ کیا سمجھا؟ یہ کہتے ہوئے میں اُس کے آنسو بار بار پونچھ رہا تھا۔

اِلا نے مجھے ایک طرف ڈھکیلا اور ٹیکسی کی طرف ہاتھ ہلایا۔ ٹیکسی رُکی اور وہ اُس میں گھس گئی۔ شیشے کو اوپر چڑھاتے ہوئے وہ چلائی۔ اب تم جان گئے ہو گے میں نے لندن میں رہنا کیوں پسند کیا۔ مجھے، صرف اس لیے کہ میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔

کس چیز سے آزاد؟ میں نے کہا۔

تم لوگوں سے! وہ پھر چلائی۔ تم لوگوں کے بے ہودہ کلچر سے۔ تم لوگوں سے۔
ٹیکسی آگے بڑھنے لگی اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔
تم مجھ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتیں۔ میں کار کی کھلی کھڑکی کے اندر چیخا۔ اگر میں کل مر بھی جاؤں تو تم آزاد نہیں ہو سکتیں۔ تم مجھ سے اس لیے آزاد نہیں ہو سکتیں کہ میں تمہارے اندر ہوں ایسے ہی جیسے تم میرے اندر ہو۔
میں یہ کہتا رہا اور ٹیکسی کی رفتار بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ چورنگی کی گلیوں میں غائب ہو گئی۔

یہی باتیں تو میں نے اپنی دادی کو سنائی تھیں جب وہ بستر پر بیمار پڑی تھی۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ الا لندن میں اس لیے رہتی ہے کہ وہ آزاد رہے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کہہ کر میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایسی آزادی کو حقارت کی نظر سے دیکھتی جو ہوائی جہاز کے ایک ٹکٹ کے دام پر خریدی جا سکتی ہے۔ وہ خود بھی ایک بار آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اس کی خاطر وہ کسی کا خون بھی کر سکتی تھی۔
وہ آزادی کی طلبگار نہیں ہے۔ میری دادی نے کہا۔ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اُس کی خون آلود آنکھیں کٹوروں میں روشنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ تنہائی کی خواہش مند تھی تاکہ جو من میں آئے کر سکے۔ ایک بازاری عورت بھی یہی چاہتی ہے۔ وہاں ایسا کرنا اُس کے لیے آسان ہے۔ یہی تو ملتا ہے وہاں۔ لیکن آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے۔
تب میں وہاں سے اُٹھا اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ کھڑکی میں سے دور جھیل کی طرف اندھیرے میں نظریں دوڑائے پھر سے الا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ بالکل اُسی طرح جیسے میں نے اُس دن اُسے ٹیکسی میں دیکھا تھا۔ آنکھیں آنسو، غصّے اور نفرت کے جذبات سے بھری تھیں۔ میں

نے سوچا کہ وہ سب لوگ کس طرح آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ وہ آزاد رہنے کے لیے کتنے پاگل ہو چکے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر مجھے حیرت ہوئی کہ پاگل تو میں ہوں۔ ایسا سمجھنے والوں میں میں اکیلا تو نہیں کہ میں اپنے اندر کی آوازوں کے شور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں اپنی دادی سے دوبارہ ملنے کے لیے دوسری ہی صبح وہاں پہنچا۔

اُس وقت اُس کے پاس ایک نرس تھی۔ جوں ہی اس نے مجھے دیکھا نرس سے خواہش کی کہ اُسے پلٹ کر لٹا دے تاکہ اُس کا رُخ دوسری طرف ہو جائے۔ میں نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

نرس کو عجیب سا لگا۔ اُس نے میری دادی سے میٹھی آواز میں کہا۔ آپ بھی کچھ کہیے۔ آپ اُن کے کسی سوال کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟ آخر وہ آپ کا پوتا ہی تو ہے۔

میں اپنی دادی کے چہرے کے تاثرات دیکھ نہ سکا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ اپنا بڑ بیان حاصل کرنے کے لیے پلنگ کے نیچے جھکی اور اسے نرس کی طرف کھسکانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اُسے صرف فرش پر لڑھکا سکی۔

نرس پریشان ہو گئی۔ اسے دادی کے ساتھ رہتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ وہ اُسے بہت ہی غریب طبیعت کی بڑھیا سمجھتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ تمہیں اب یہاں سے جانا چاہیے۔ مریض بے کل ہوتا نظر آتا ہے۔

میں بڑی تیزی سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ دروازہ کھولا ہی تھا کہ مجھے اپنی دادی کے بستر سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ اُس کی ہمیشہ کی آواز تھی۔ کرخت آواز۔ وہ آواز نہیں جو اُسے بیماری میں ملی تھی۔

تم ہمیشہ اس بازاری عورت کی حمایت میں بات کرتے ہو۔ اس نے کہا۔

آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ میں نے پلٹ کر پوچھا اور اس کے سر کے پچھلے

حقے کو دیکھتا رہا۔

وہی میم صاحب۔ بازاری عورت۔ اس نے کہا۔ اِلا۔ تم ہمیشہ اس کی مدافعت کیوں کرتے ہو۔ وہ تمہاری کیا لگتی ہے۔

نرس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے نکلتا ہوا بلغم پونچھا اور چپکے سے کمرے کے باہر نکل گئی۔

اس شام میری دادی کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ ہم لوگوں نے اپنے کمروں کی دیواروں سے سنا۔ اس نے سانس لینے کی کش مکش میں ساری رات گزار دی۔ دوسری صبح جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ گول ہو کر ادھ موئی اپنے تکیہ پر پڑی تھی۔ جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوا اُس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں مجھ پر جما دیں اور پوچھا۔ تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ مجھے بتاؤ کہ وہ انگریزنی بازاری عورت تمہیں کیا لگتی ہے؟

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا نرس کمرے میں دوبارہ آئی اور مجھ کو لے کر باہر نکل گئی۔

اس کے چند دِنوں بعد دادی کی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ آکسیجن دینے کا سلسلہ چلتا رہا۔ گھر پر اس کے کمرے میں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کے مستقل سونے کا انتظام کیا گیا۔ کبھی کبھی دن کے وقت نرس ہمیں اُسے دیکھنے کی اجازت دیتی۔ آکسیجن ماسک سے سانس لینے کی اس کی کش مکش جاری تھی۔ ڈاکٹر چاہتے تھے کہ اسے ہاسپٹل منتقل کیا جائے لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان سے کہتی: بجائے کسی ادارے کے وہ گھر پر مرنا پسند کرتی ہے۔

لیکن اس کی صحت آہستہ آہستہ واپس آتی رہی۔ آکسیجن کے ماسک نکال دیئے گئے۔ اور میری ماں بہت سارا وقت دادی کے بستر سے لگی گزارنے لگی۔ مجھے یا میرے باپ کو دادی کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

اب میری چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں۔ چونکہ میری دادی بھی صحت مند ہو گئی تھی اس لیے میرے ماں باپ نے سوچا کہ اب مجھے دِلّی واپس ہونا چاہیے۔ میرے فائینل امتحان کے لیے صرف تین ماہ باقی رہ گئے تھے اور میں نے چھٹیوں میں کچھ پڑھائی بھی نہیں کی تھی۔ مجھے تو کلکتے ہی میں ٹھہرے رہنا پسند تھا۔ تاہم میں نے اپنے ماں باپ کے مشورے کو بہ خوشی قبول کیا۔

جس دن مجھے اپنی ریل پکڑنی تھی اس دن میری ماں مجھے دادی کے کمرے میں لے گئی کہ

میں اُس سے وداع ہوں۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی اور ہمیشہ کے مقابلے میں بہتر نظر آ رہی تھی۔ جب اُس نے میرے کالج اور امتحان کے بارے میں ہنستے بولتے بات کی تو مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ جب وداع کا وقت آ چکا تو ہمیشہ کی طرح میں نے اس کے پیر چھوئے۔ اس نے میرے حق میں دعا دی اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اُس کی دعاؤں کی بڑبڑاہٹ سنی۔ پھر اُس نے اپنا منہ پھیر کر میرے کانوں کے قریب کیا۔ اس قدر قریب کہ اس کی سانسوں کی گرمی میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔

کیوں تم نے اُس بازاری عورت کو تمہیں پھانسنے کا موقع دیا۔ اُس نے میرے کان میں کہا۔ میں جانتی ہوں کہ اُسی نے تمہیں دِلّی کی بازاری عورتوں سے قریب کیا ہے جن سے ملنے تم جایا کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں ان باتوں سے واقف نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں اس کی اجازت دوں گی۔

میں نے اپنا سر اُس کے دونوں ہاتھوں کے بیچ سے ہٹا لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کمزور بوڑھی اور ناتواں عورت وہی ہے جس سے میں ڈرتا بھی ہوں اور جسے پیار بھی کرتا ہوں۔

دو مہینے تک میرے ماں باپ ہر دوسرے دن مجھے دادی کے بارے میں لکھتے رہے۔ میرے کلکتہ چھوڑنے کے بعد اُس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر اندازہ نہ لگا سکے کہ اس کی صحت کیوں بگڑ گئی۔ پھر اس کے بعد معجزاتی طور پر وہ اتنی بہتر ہوئی کہ خطوط لکھنے لگی اور مطالعہ بھی کرنے لگی۔

اس کے ایک ہفتے تک مجھے کوئی اطلاع نہ ملی۔ میرے پاس بھی وقت نہیں تھا کہ میں سوائے تاریخ ہند کے کسی اور مسئلہ پر سوچتا۔ مجھے کسی طرح امتحان کامیاب کرنا تھا۔

اس کے بعد جو خط آیا اس میں دادی کے مرنے کی اطلاع تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ مرنے کے دوسرے ہی دن اُسے شمشان گھاٹ کی نذر کر دیا گیا۔ یہ سوچ کر مجھے ٹیلیگرام نہیں دیا گیا کہ کہیں میں کلکتہ نہ پہنچ جاؤں۔ میرے ماں باپ نہیں چاہتے تھے کہ امتحان کے زمانے میں میری پڑھائی میں خلل پڑے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کاش اُس دن روبی کالج ہی میں ہوتا۔ لیکن وہ تو ایک سال پہلے ہی

کالج چھوڑ چکا تھا۔ میں کسی دوسرے شخص کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے میں کالج سے نکل کر موریس نگر کے بس اسٹاپ کی سڑک کے آس پاس گھومتا رہتا۔ ۲۱۰ نمبر کی ایک خالی بس آئی اور میں اُس میں سوار ہو گیا۔ مجھے کھڑکی کے پاس جگہ ملی۔ میں وہاں بیٹھ کر باہر دیکھتا رہا۔ رِنگ روڈ کے پارک اور لال قلعے کی دیوار نظروں سے گزر گئے۔ جب سنٹر سکریٹریٹ پر بس رُکی تو میں اتر کر روڈ کی دوسری طرف گیا اور واپس ہونے والی ایک دوسری ۲۱۰ نمبر کی بس میں بیٹھ گیا۔ مال روڈ پر میں بس سے اُتر گیا اور پیدل چلنے لگا۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا اور راستے خالی تھے۔ امتحان کی وجہ سے یونیورسٹی میں مکمل خاموشی تھی۔

خاموش راستے پر تنہا چلتا ہوا میں رو پڑا۔ محض اس غم سے نہیں کہ میرے ماں باپ نے میری دادی کے مرنے اور اسے شمشان گھاٹ لے جانے کی اطلاع نہیں دی۔ روڈ کی اونچائی پر چلتے ہوئے اس علاقے تک پہنچا جہاں یادگار قائم کی گئی ہے۔ گھاس پر بیٹھا تو مجھے اپنا غم ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔ دادی کی موت کا غم میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ میرا امتحان۔ اپنے بورژوا معاشرے میں یہی تو میں اپنی سخت مزاج دادی سے سیکھا تھا۔

دو دن بعد ہمارے کالج کے ڈین نے مجھے بُلا بھیجا۔ وہ مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کتابیں ایک طرف رکھیں اور اُس کے آفس پہنچا۔ وہ معمولی سا خود پسند آدمی تھا جو کسی کو جاتا نہ تھا لیکن کسی نے اُسے ناپسند کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

جب میں اس کے دفتر میں پہنچا تو اُس نے مجھے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور جب میں کرسی پر بیٹھ چکا تو اُس نے اپنے پاس سے ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھا اور کہنے لگا۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ تمہیں اس وقت تکلیف دی۔ مسئلہ بڑا سنگین ہے۔ اگر رسٹکیشن نہ ہوا تو اخراج ممکن ہے۔ سنگین مسئلہ ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے بھی تو دیکھنا ہے۔

احمق تو وہ تھا ہی لیکن میں اس کی آواز کے لہجہ سے چونکا کیونکہ وہ میرے تعلیمی کیریئر کو بگاڑنے کا اہل تھا۔

آخر معاملہ کیا ہے جناب۔ میں نے پوچھا۔

ہمارے پاس اطلاع آئی ہے۔ کاغذ پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے کہا کہ تم بدنام گھروں

پر طوائفوں کے پاس جاتے ہو۔ لکھا گیا ہے کہ تمہاری بھلائی کے لیے تمہیں کالج سے خارج کر دیا جائے اور فوراً واپس کلکتہ بھیج دیا جائے۔

میں اس قدر حیران ہوا کہ تھوڑی دیر تک گم صم اسے دیکھتا رہا۔ پھر مشکل سے میں کہہ سکا۔ آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے جناب؟

تمہاری اپنی دادی نے۔ اس نے کاغذ کو میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ تم خود اسے دیکھ سکتے ہو۔

صرف تین سطروں کا خط تھا۔ تحریر بڑی شکستہ تھی۔ لیکن بلاشبہ میری دادی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔ وہ جانتی ہے کہ میں دلّی میں طوائفوں کے پاس جاتا ہوں اور یہ کہ اس نے مجھ سے اس مسئلہ پر بات کی لیکن مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ خود ٹیچر ہونے کی حیثیت سے وہ جانتی ہے کہ اگر کالج کو اپنے وقار کا خیال ہے تو وہ مجھے گھر واپس بھیج دے گا۔

بچپن سے یہی ہوتا آیا تھا لیکن اب بھی میری دادی کے مردہ ہاتھ مجھ تک اس طرح پہنچ گئے تو میں بوکھلا یا۔ وضاحت سے پہلے ڈین کے سامنے مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں بڑی دیر لگی۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اپنی کالج کی ساری زندگی میں جاملکیہ سنیما اور کشمیری گیٹ سے لگی خیبر رسٹورنٹ سے زیادہ بدنام جگہ پر کبھی نہیں گیا۔ میں نے مزید کہا کہ میری دادی خط لکھتے وقت شدید بیمار تھی اور اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ فوراً ڈین کی سمجھ میں آگئی لیکن اس نے مجھے وارننگ دی کہ کالج کے اس آخری زمانے میں وہ مجھ پر کڑی نظر رکھے گا۔

وہاں سے اٹھتے ہوئے میں نے ایک اچٹتی نظر خط پر ڈالی۔ میری دادی نے ہمیشہ کی طرح خط کے اوپر کونے میں تاریخ بھی لکھ دی تھی۔ بعد میں میں نے تاریخوں کے بارے میں سوچا تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے مرنے سے ایک دن قبل یہ خط لکھا تھا۔

میری سمجھ میں یہ کبھی نہ آیا کہ میری دادی اس عورت کو کیسے جانتی ہے۔ میں خود بھی اُس کے پاس چند بار ہی گیا تھا اور وہ بھی اپنے احباب کے ساتھ۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا وجوہات تھیں جس کی بنا میری دادی یقین کرنے لگی تھی کہ میں اِلاسے محبت کرتا ہوں۔ ابھی تو خود مجھ

میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس بات کو قبول کروں۔

وہ تو میرے لندن کے قیام کے دوران کی بات ہے۔ پہلی بار خزاں کی آمد آمد تھی۔ درختوں کے سارے پتے جھڑ چکے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں اُس حقیقت کو مزید چھپا نہیں سکوں گا۔
بلا سبب میں سوہو اور ٹرافلگار اسکوائر کے چکر لگاتا رہتا اور جیسے اپنے آپ سے بہانہ کرتا کہ میں اس چہل قدمی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اور شہر کے محلِ وقوع کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو جاتا کہ میری چہل قدمی تو ان منڈیروں تک محدود ہے جو دریائے ٹیمس کے ساتھ ساتھ بنی ہیں۔ ان کی ریلنگس سے ٹیک لگائے میں جنوبی علاقے کی پہاڑیوں کی طرف گھورتا رہا ہوں۔ میں وہاں رُک جاتا اور کانسے کے بنے لیمپ کے کھمبوں پر، آس پر بنے مچھلی نما سر اور ہونٹوں پر ہاتھ کٹھہرنے لگتا۔ مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب میری حلق کے اندر سے دھیمی دھیمی آواز آنے لگی اور میں ایک فلمی گیت گانے لگا۔ بے قرار کر کے ہمیں یوں نہ جایئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ گیت میں کس طرح گانے لگا تھا۔ میں نے یہ فلم تو نہیں دیکھی تھی۔ اس کا کوئی رکارڈ بھی میرے پاس نہیں تھا لیکن یہ گانا میری زبان پر چڑھا کیسے۔ کوئی دوسرا گانا نہیں۔ بہ ظاہر کوئی سبب نہ ہوتا اور یہ گانا میری زبان پر ہوتا۔ گانے کی دھن اکثر ایک ہی طرح کی ہوتی۔ صرف کبھی کبھی مختلف۔ بعض وقت بھیگی ہوئی اور سرد اکڑا دینے والی راتیں ہوتیں۔ سنسان سڑکوں پر میرے پہلو سے کاریں فراٹے بھرتی ہوئی جاتیں۔ پھر بھی میں ایک لہک کر یہ گیت گاتا ہوا آگے بڑھتا۔ ایک فٹ پاتھ پر سے دوسرے فٹ پاتھ کی طرف۔ ہاتھ میں پنسل لیے ریلنگ سے ٹکراتا ہوا۔ اس کی کلک کلک کی آواز سنتا ہوا اور محسوس کرتا ہوا کہ اس کی تال میرے گانے کی سُر سے میل کھا رہی ہے۔ لیکن بعض لمحے ایسے بھی آتے کہ یہی دھن بڑی پُراسرار اور غمناک ہو جاتی۔ فٹ پاتھ پر جو سائے پڑتے اُن سے کترا کر میں نکل جاتا۔ اونچی اونچی ایک ہی قطار میں بنی ہوئی عمارتوں

سے مجھے خوف ہونے لگتا۔ میں لیمپس کی تیز روشنیوں ہی میں چلتا۔ قمیص کی چمکتی ہوئی سیاہی سے نظریں چراتا۔ میں اپنے سر کو نیچا کیے، اسکارف میں چھپائے پاس سے گزرنے والوں سے نظریں بچائے وہاں سے تیزی سے نکل جاتا۔ ایسی راتوں میں میں اس دھن سے مکمل گریز کرتا۔ دعا کرتا کہ میں تنہا رہوں۔ کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ اس دھن کو بھول جاؤں۔ ایسے وقت میں کسی بنچ پر بیٹھ جاتا اور پھر یقین کرنا چاہتا کہ میں اُسے سن رہا ہوں اور سچ مچ میں اُسے سننے لگ جاتا ــــ میری حلق سے گدگدا کر نکلی ہوئی آواز۔

ایسی شام جب بھی آتی میں لیا مبتھ پُل پر پہنچ جاتا۔ پُل سے دُور سُرخ اینٹ کی بنی ہوئی دیواروں والے محل کو دیکھتا رہتا اور پھر اچانک اپنے آپ سے سوال کرنے لگ جاتا کہ میں لیا مبتھ پُل پر کیوں آگیا اور جب آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اسٹاک ویل چلا جاؤں اور الا سے ملوں۔

تب میں پُل کے ساتھ ساتھ چل کر آدھا راستہ طے کر لیتا۔ پھر کسی ریلنگ کا ٹیکا لے کر سوچنے لگ جاتا کہ کیوں نہ باقی راستہ بھی طے کر لوں۔ چلنا تو بہت دور ہے۔ میرے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے کہیں بارش تیز نہ ہو جائے۔ ابھی ہفتے تو میں دو بار وہاں جا چکا ہوں۔ الا اس وقت گھر پر موجود نہ ہوگی .... اسی طرح کے بے تکے سوالات میرے ذہن میں اُٹھتے۔ اپنے ہی آپ سے سوال وجواب مجھے اس طرح لگتے جیسے دو پرانے دوست آپس میں گن سن کر رہے ہوں۔ پھر مجھے خود ہی اپنے لیا مبتھ روڈ تک آنے کا سبب معلوم ہو جاتا۔ تب کوئی اور سوال نہ اُٹھتا۔ اب میں کوئی بہانہ سننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

اور جب میں فیصلہ کر لیتا۔ خاص طور پر یہ سوچ کر کہ تین دن سے میں اسٹاک ویل جا نہیں پایا تو پھر میرے قدم اپنے آپ اُٹھ جاتے اور میں بڑی تیزی سے پُل کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا۔ اس قدر تیزی سے جیسے کوئی دوڑ رہا ہو۔ اُس کے مکان اسٹاک ویل کی جانب۔

چلتے ہوئے اُس دھن سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا اور اپنے ذہن میں اعداد و شمار کرتا۔ میں حساب لگانے کی کوشش کرتا کہ کتنے میل چل چکا ہوں اور اس کے لیے کتنا وقت لگا ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتا ساڑھے چھ میل یا ۱۱۴۴۰ گز یا ۳۴۳۲۰ فیٹ یا شاید ۱۰۴۶۱ میٹر

ان اعداد کو اپنے ذہن میں سمائے رکھتا تاکہ وہ مسرت چھپی ہی رہے جو مجھے تیز قدموں سے اسٹاک ویل کی جانب لے جا رہی ہوتی۔

بعد میں کبھی کبھی برٹش سنڈے میگزین میں ہیرے جواہرات کے اشتہارات دیکھتا یا فلم اسٹاروں کے رومانٹک واقعات پڑھتا تو مجھے حیرت ہوتی کہ وہ کیفیت جسے ہم محبت کہتے ہیں اس میں لوگ کس طرح حساب کتاب کرتے ہیں جب کہ ان جرائد ہی میں کہا گیا ہے کہ اعداد و شمار اور مقدار کا تعین اس کیفیت کی نفی کرتا ہے۔ اس کے متضاد ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ وہ کون سی وجوہات ہیں جس کی بنا پر ایک شخص کسی صحافی پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ اس نے کتنے روپے، ڈالر یا پونڈ خرچ کر کے ایک کار یا ایک جزیرہ خریدا ہے جسے وہ اپنی محبوبہ کو تحفے میں دینا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ یہ اشتہار ایک مرد کو کیوں اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ ایک مقررہ قیمت پر وہ ان زیورات کو خرید کر اپنی محبوباؤں کو پیش کرے کیونکہ کسی لڑکی نے اپنے عاشق کو پانے کے لیے نو بار خودکشی کی کوشش کی۔ الاسکا پہنچنے کے لیے میں نے کتنے قدم چلے اور ان کا حساب لگایا تھا۔ مجھے ان سوالوں کا جواب نہ مل سکا سوائے اس کے کہ محبت جس کا نام ہے اس میں انصاف جیسا کوئی تصور ہی نہیں۔ حالانکہ انصاف کے تصور کے بغیر ہم میں انسانیت باقی نہیں رہ سکتی لیکن شاید محبت کو انصاف کے لفظ ہی سے چڑ ہے۔ اس کا خمیر ہی جدا ہے اسی لیے محبت اس کے ساتھ چند تضادات کو جوڑ کر اُسے رام کرنا چاہتی ہے تاکہ ہم اپنے آپ سے کہہ سکیں۔ کس نے کس دام پر وہ ہیرا خریدا یا کس لڑکی نے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر اپنا مقام کھویا۔ کسی امید سے ہم ان عام استعارات کو استعمال کرتے ہیں ان کا ایک انبار کھڑا کر دیتے ہیں اور آخر کار ہم اُن کا تخمینہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ استعاراتی زبان میں پھر بھی اس کیفیت اور ان استعارات کے درمیان کوئی رشتہ قائم ہو نہیں پاتا۔ سوائے کسی لفظ کے توسط کے جیسے ایک چٹائی اور خود وہ شئے۔ ان دونوں کا رشتہ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اسی لیے ہم استعارات کا ایک انبار لگا دیتے ہیں۔ ہیرے، خودکشیاں، فاصلے، مصائب، اپنی قابلیت کی انتہا پر بھی اس کیفیت تک نہیں پہنچ سکتے اور پہنچیں تو شاید کوئی متضاد شئے ہاتھ لگے۔

میلوں اور گزوں کے وہ فاصلے اور اُن کے استعارے میری ذہنی پیداوار تھے۔ انصاف پانے کی ایک کوشش تھی اس لیے کہ میں نے اپنی ساری چیزیں ترازو کے پلڑے میں رکھ دی تھیں اور وہ چیزیں ایسی ویسی بھی نہیں تھیں۔ خود میں بھی ایک باوزن، باوقار آدمی تھا۔ انسان تھا۔ بدصورت بھی نہیں، کم وقعت بھی نہیں۔ تعلیم یافتہ اور اوصاف حمیدہ کا حامل جیسے صبر و تحمل، مزاح۔ سچ پوچھیے تو ایک انسان میں اس سے بڑھ کر اور کیا خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ میں نے اپنی ساری چیزیں داؤ پر لگا دی تھیں۔ وہ ساری چیزیں جو ترازو کے ایک پلڑے میں سما سکتی تھیں۔

اسی لیے تو میں نے اتنا فاصلہ پیدل چلا تھا۔ اسی امید میں کہ طویل فاصلہ طے کرنے کا کچھ تو اثر الا پر ہوگا۔ یہ فاصلہ ایسی باتیں بتائے گا جنھیں میں نے الا کو نہیں بتایا تھا۔ اس ڈر سے کہ اسے کھو نہ بیٹھوں۔ ان بے حساب گزوں کے فاصلے سے میری ترازو کے پلڑوں کا وزن بڑھے گا۔ اور اگر اتفاق سے الا گھر پر موجود ہوتی تو دروازہ کھول کر کہتی۔ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اندر آؤ۔ لیکن ڈنر کی توقع نہ رکھنا۔ میں اپنی مخصوص مسکراہٹ سے اس سے کہتا میں آٹھ میل چل کر آیا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ٹھیک دو گھنٹے اور دس منٹ کا وقت لگا ہے۔ پھر وہ اپنی کمانی دار بھنویں چڑھا کر کہتی۔ کیوں صحت بنانے کی کوئی ترکیب تو نہیں؟

الا جن لوگوں کے ساتھ رہتی تھی وہ اگر گھر پر ہوتے تو شام کے وقت باورچی خانے میں جمع ہوتے۔ ایک تو داڑھی والا آئرش تھا جو کمپیوٹر سائنٹسٹ تھا۔ دوسری لیسٹر کی ایک لڑکی تھی جس نے نارتھ لندن پولی ٹکنیک کا دوسرا سال نامکمل چھوڑ دیا تھا اور فورتھ انٹرنیشنل میں کام کر رہی تھی۔ اور گھانا کا ایک تیکھا نوجوان جس نے نازی لیگ کے خلاف کام کیا تھا۔ شام میں یہ لوگ میز کے چاروں طرف بیٹھ کر کئی کئی مگ چائے پیتے رہتے اور جب اُن کے پاس زاید پیسے ہوتے تو بیئر بھی پیتے۔ اُن کی باتیں ہمیشہ عملی ہوتیں۔ گھنٹوں وہ باتیں کرتے رہتے کہ کون سا پنسل پوسٹرس کی ڈرائنگ بنانے میں زیادہ کارآمد ہوگا۔ یا یہ کہ اگلی بار اپنے پیکٹ پر انھیں کس طرح کے کھانے لے جانے ہیں۔ مباحثے میں کبھی ایسی سختی نہ ہوتی جیسے کہ کلکتہ یا دلّی میں ہم باتونی لوگ آپس میں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بحث ہوتی بھی تو ٹیڑھی ترچھی ایسی باتیں ہوتیں کہ ان میں تاریخی اور سیاسی نظریات ہوتے۔ مکالموں پر اُن لوگوں کو اس قدر قابو تھا کہ ابتدا میں میں نے تو خیال

کیا کہ یہ کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اُن کی بُردباری اور سنجیدگی ہی میں ان کے ارادوں کی پختگی پوشیدہ ہوتی۔

ان مباحثوں کے پس منظر کے بارے میں اِلا کی میری ہی طرح نہ تو معلومات ہوتیں نہ ہی کوئی دلچسپی۔ بہت جلد یہ بات مجھ پر آشکار ہوئی کہ ان سب کی سیاسی اجتماعی زندگی میں اِلا ایک اہم رول ادا کر رہی تھی۔ اِلا کی رائے طلب کرنے سے بہت قبل وہ لوگ اپنا فیصلہ کر چکے ہوتے۔ علانیہ محسوس ہوتا کہ وہ اِلا کو بہت پسند کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسے مہمان تصور کرتے ہیں جیسے وہ کوئی آرائش کی چیز ہو۔ وہ تو اپنے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی آزاد خیالی پر نکتہ چیں ہوتے لیکن اِلا سے اس کی کبھی باز پرس نہ ہوتی۔ ایک طرح سے وہ اِلا پر فخر کرتے۔ وہ اکثر اس کی آبائی دولت کے بارے میں پوچھتے۔ ہندوستان میں اس کے گھر پر کتنے نوکر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ جواب دیتی اور کبھی کبھی بڑھ چڑھ کر باتیں کرتی تو وہ اُسے غور سے سنتے۔ اُس کے بارے میں وہ کہتے۔ یہ تو ہماری اونچے درجہ کی ایشیائی مارکسسٹ ہے۔ اس سے انھیں خوشی ہوتی۔ انھیں تاریخ کا گہرا شعور تھا اور وہ اِلا کو محتاط اشتراکیت کا ایک واسطہ خیال کرتے۔ یا شاید اُنھیں محسوس ہوتا کہ ان کی اپنی زندگی اور اُن کے نظریات کا اثر اِلا کے توسط سے دوسرے ممالک پر پڑ سکتا ہے جب کہ خود وہ اپنے ہی ملک میں مجہول ہو کر رہ گئے تھے۔ ویسے وہ دوستی کے لائق تو نہیں تھے لیکن قابلِ قبول۔ اور پھر بہر حال وہ اِلا کے دوستوں کی پذیرائی کرتے تھے۔ یوں تو وہ کسی سے قریب ہونا پسند نہ کرتے بلکہ دوسروں کے بارے میں شکّی بھی تھے لیکن اِلا کے دوستوں کا خاص مقام تھا حالانکہ یہ دوست اُن پر توجہ نہ دیتے پھر بھی اُنھیں رسوئی گھر میں میز سے لگے بیٹھے دیکھ کر وہ خوش ہوتے۔

میں جب وہاں جاتا اکثر نِک پرائس کو رسوئی گھر میں بیٹھا پاتا۔ وہ ہمیشہ عمدہ لباس میں ہوتا۔ میں اس کے کپڑوں کی بڑھیا سلائی کا راز جاننا چاہتا اور وہ کہتا کہ اُس کی شرٹ ٹرن بُل اور اسر کی بنائی ہوئی ہے اور اُس کا جیکٹ آرمانی ہے۔ پھر وہ مسکراتا جب اسے احساس ہوتا کہ ان ناموں کی میرے پاس کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کا رسوئی گھر میں ہونا بڑا ناگوار لگتا لیکن شاید وہ مقابلتاً مجھ سے بہتر ہی تھا۔ اُس کی فطرت میں اپنا

کام آپ کر و والی بات بھی اور ایسی فطرت کے لوگوں کے لیے اس گھر کا ماحول نہایت موزوں تھا۔ پوسٹرس کے رنگوں اور پرنٹنگ کی روشنائی میں اُسے خاص دلچسپی تھی۔ اُن کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اکثر دن دن بھر ان لوگوں کے ساتھ گزارتا۔ اُس کے پاس وقت بھی تھا۔ اُس نے ابھی تک کوئی ملازمت بھی قبول نہیں کی تھی۔ اتفاقاً وہ وہاں پہنچ جاتا اور اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا جاہے وہ کیسا ہی کام ہو۔ جیسے پُروفس کی تصحیح، پوسٹرس کو رنگنا۔ وہ ان کے احتجاجی پروگراموں میں بھی شریک ہوتا اور پکٹس کے موقعوں پر اُن کے ساتھ کھڑا رہتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ان لوگوں میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سوٹ اور ٹائی میں ہوتا۔ جب کبھی معاملہ بگڑتا تو اس کے بااثر دکھائی دینے کی وجہ اسی کی پولس سے نپٹنا پڑتا۔ اُس گھر میں سیاست پر کبھی گفتگو ہی نہ ہوتی کیونکہ اس نے کسی بھی موضوع پر اُن سے اختلاف کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔

ایک شام میں چیرنگ کراس سے اسٹاک ویل تک سارا راستہ پیدل چل کر پہنچا تو لالا کو نک کے بازو بیٹھا ہوا پایا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ دھول میں اٹے ہوئے میرے معمولی کپڑوں کو دیکھ کر اپنی ناک سکیڑتے ہوئے اس نے کہا۔ تمہارے لیے اچھا لباس حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔

میں نے اسے یاد دلایا کہ میرا تعلیمی وظیفہ میری اہم ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں اپنے لیے کوئی نیا وارڈ روب خریدوں۔ میری بات کو سُنی اَن سُنی کرتی ہوئی وہ کہنے لگی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے شاپنگ کے لیے اچھی جگہ کون سی ہے۔

کون سی ہے؟

تم نہیں جانتے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر ہندوستانی اور بنگلہ دیشی تاجروں نے جلد فروشی کی سستی دکانیں لگائی ہیں۔

یہ کہاں ہے؟ میں نے کہا۔

اس جگہ کو برک لین کہتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔

اور جب اُس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا تو اپنی بھنویں چڑھا کر جواب کو مختصر کرتے ہوئے اس نے کہا۔ کیا بات ہے۔ کیا تم نے اس کے بارے میں سُنا ہے۔

میں نے فوراً سر ہلایا اور پوچھا کہ ہم لوگ وہاں کب جائیں گے۔ طے ہوا۔ دو دن بعد کیمبلس ہیڈ میں ملیں گے۔

میں وہاں دیر سے پہنچا۔ دور کمرے کے ایک کونے میں اِلا پر نظر پڑی۔ نِک اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ ٹوئڈ کا جیکٹ پہنا ہوا۔ اس پر سلک کی ٹائی۔ اِلا نے جینس پر ٹی شرٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے نِک سے کچھ کہا لیکن وہ تو فینانشیل ٹائمس پڑھ رہا تھا۔ آسے اُس نے چاروں طرف سے موڑ کر مربع کی شکل دی تھی۔ وہ وہاں سے کھسک کر ذرا فاصلے پر جا بیٹھا۔ لکڑی کے اس بینچ پر دونوں میں اچھا خاصا فاصلہ ہو گیا۔ کوئی بھی دیکھنے والا یہی سوچتا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں لیکن جس طرح سے لوگ انھیں دیکھ رہے تھے اُس سے میں اس بات کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ لوگوں نے انھیں ایک ساتھ آتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ شراب کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر میں ان دونوں کو منٹ دو منٹ ہی کیا گھنٹوں اسی حالت میں دیکھ سکتا اور ان کی قربت کا اندازہ لگا سکتا تھا لیکن کاؤنٹر والے نے مجھ سے فرمائش کے لیے اصرار کیا۔ میرا گلاس بیئر سے بھر جانے تک اِلا نے مجھے دیکھ لیا۔

جب میں ان کے قریب پہنچا تو اِلا نے سوال کیا کہ مجھے پہنچنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی۔ نِک نے سر کو ایک حسین جنبش دیتے ہوئے اپنے بالوں کی لٹ کو آنکھوں پر سے ہٹا لیا اور مسکرا کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں اِلا کو جواب دینے ہی والا تھا کہ اُس نے مجھے روکا اور معذرت کے ساتھ کہنے لگی۔

نِک نے ہمارے ساتھ آنے کا فیصلہ کیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کیوں؟

اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف گہری نظر سے دیکھا پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ نِک بزنس کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانی ریڈی میڈ کپڑوں کی درآمد و برآمد۔

اِلا نے اپنے پہلو میں میرے لیے جگہ بنائی۔ اور اگلے پندرہ منٹ تک، وہ اپنے بزنس کی اسکیم کے بارے میں مجھے بتاتا رہا۔ میں نے اس کی باتوں پر مشکل ہی سے دھیان دیا۔ لیکن مجھے اتنا

تو پتہ چلا کہ اِلا اور اس کے خاندان والے اس بزنس میں سرمایہ لگانا چاہتے ہیں جب کہ لندن میں نِک ٹھوک کا روبار سنبھال لے گا۔

اِلا نے اندازہ کر لیا کہ میں نِک کی باتوں سے اُکتانے لگا ہوں۔ اُس نے نِک کو مزید کہنے سے روکتے ہوئے مجھ سے کہا تمہیں تو برک لین جانے کی جلدی ہوگی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری طرف تجسس سے دیکھتے ہوئے اِلا نے کہا۔ برک لین میں کیا خاص بات ہے۔

میں نے کہا کہ وہاں پہنچ کر ہی بتاؤں گا کہ کیا خاص بات ہے۔ پہلے وہاں پہنچیں تو۔

اوّل تو مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ وہاں کوئی لین نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو ایک ایسی گلی کا تصوّر تھا جیسی آکسفورڈ کی تنگ اور بل کھاتی گلی۔ بھورے پتھروں سے بنی ہوئی۔ دونوں طرف دیواریں اور ان پر پھیلی ہوئی پھولوں کی بیلیں۔ ساتھ ہی چکا چوند کرنے والی روشنیوں میں دوڑتی ہوئی کاریں اور چاروں طرف بوٹیکس کی دکانیں۔ میرا خیال تھا کہ وہاں گلی سے لگے ہوئے سُرخ رنگ کے مکانات ہوں گے ان میں چھوٹے چھوٹے باغیچے ہوں گے اور ان مکانات کے دریچوں سے پھولوں کے گملے جھانک رہے ہوں گے۔

میرے پاس اُس جگہ کو پہنچانے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ مجھے خیال ہی نہ آتا تھا کہ میں یہاں پہلے کبھی آیا ہوں۔ میں نِک اور اِلا کے آگے آگے چلتا گیا۔ راستے میں جتنی بنگالی دکانیں تھیں ان کے بورڈ دیکھتا گیا۔ شوروم سے جھانکتے ہوئے تازہ فلمی رسالوں کو گھورتا رہا اور پرانے لندن میں اینٹ کی بنی ہوئی دیواروں پر چسپاں پوسٹرس کو پڑھتا گیا۔ ان پوسٹرس میں دفتر بائیں بازو کی پارٹیوں کے اجرا کیے ہوئے وہ پوسٹرس بھی تھے جو نسلی امتیازات کے خلاف تھے۔ ان کے اوپر سے نئی نئی فلموں کے اشتہارات چسپاں تھے۔ بنگالی بولیوں کی گڈمڈ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پیچھے سے آنے والے لوگ آپس میں ہنستے بولتے بڑی تیزی سے آگے نکل رہے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی پتلونوں کی جیب میں تھے جیسے جاڑوں کی کسی صبح شاپنگ کرنے کے لیے کارپہات پر چلتے ہوئے لوگ اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں دھنسا لیتے ہیں۔ ایک مٹھائی کی دکان پر گرم گرم رس گلوں کی خوشبو پا کر میں رُک گیا۔ پھر نِک،

اور اِلا کو اشارے سے جلد آنے کے لیے کہا۔ مجھے مٹھائی کی دُکان پر اس طرح گھورتے دیکھ کر اِلا ہنسنے لگی۔ گول پارک کی اس مٹھائی کی دُکان کی طرح ہے کہ نہیں؟ سچ مچ یہی منظر تھا۔ پالش کیے ہوئے کاونٹرس اور پلاسٹک کی میزیں۔ بالکل ویسے ہی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ یہاں اٹھارہویں صدی کے لندن کا ٹیرلیس تھا اور پہلو میں کوئی پان کی دُکان نہ تھی۔ وہاں کوئی نھو چوبے بھی نہیں تھا۔ ان کی جگہ جیساکہ نِک نے کہا ہاک مور کے کراسٹ چرچ رسپٹفیلڈ کا مینار چھایا ہوا تھا۔

اِلا نے ہنس کر کہا۔

دیکھو تمہارے لیے ہر چیز نئی ہے۔ میں نے تم سے ہمیشہ یہی کہا تھا۔ تم لندن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

ایک بڑی گنبد نما عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نِک نے کہا۔ لندن کی جامع مسجد۔

تم اس مسجد کو دیکھ رہے ہو۔ یہ یہودیوں کی ایک عبادت گاہ تھی۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد بھی۔

اس وقت تمہارے چچا آلان یہاں رہا کرتے تھے۔

میرے چچا۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا ــ کیا وہ یہاں رہا کرتے تھے۔

ہاں۔ میں نے کہا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں رہتے تھے۔

گلی کے دونوں جانب دُکانوں کے نام پڑھتا ہوا تیز قدموں میں آگے بڑھتا گیا اور ان دونوں کو ایک ایسے راستے سے لے گیا جہاں تازہ بیڑ کی خوشبو مہک رہی تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جیسی برک لین سے پرے ریلوے پُل کے نیچے کے پیپ سے ہر شنبہ کی شام کو آتی تھی۔ گلی پہ خاموشی طاری تھی۔ راستے کی ساری آوازوں کو ہم پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔ یہاں کی بہت ساری دُکانیں بند پڑی تھیں۔ جگہ جگہ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اندر کی اشیا ہمیں نظر آرہی تھیں۔ بوسیدہ عمارتوں کے اندر ٹوٹے پھوٹے گلدان اور شیشے پلائی وُڈ کے پارٹیشن اور کارڈ بورڈ کے بوسیدہ ڈبے۔ بہت سی دُکانیں جو ہندوستانی چمڑے کی اشیاء

بچ رہی تھیں ایسی ہی لگ رہی تھیں جیسے دلّی کی جنپت روڈ پر سیاحوں کو چمڑے کے سیاہ جیکٹ، اُن کے بیگس اور بیلٹس بیچتی دکھائی دیتی ہیں۔

آخر کار میری نظریں اس بورڈ پر پڑیں جس کی مجھے تلاش تھی۔

اُدھر دیکھو۔ میں نے فاتحانہ انداز میں بک کو دکھاتے ہوئے کونے والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

یہی تو وہ جگہ ہے جہاں جنگ کے ابتدائی زمانے میں تمہارے چچا رہا کرتے تھے۔

غیر یقینی کے تاثرات سے اس کا چہرہ لمبا ہو گیا اور وہ عمارت کرگرتی ہوئی دیواروں اور نیچے لگے ہوئے تاج ٹراویل ایجنسی کے بورڈ کو غور سے دیکھنے لگا

دیکھو۔ اس نے کہا تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ یہ اُن کا مکان نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنے نادار نہیں تھے۔ میرے دادا نے ان کے لیے کافی دولت چھوڑی تھی۔ وہ کسی بھی عمدہ جگہ رہ سکتے تھے۔

وہ یہ سوچ کر ناراض ہو رہا تھا کہ میں اس کے خاندان کی غریبی کا مزاق اُڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے کاندھے ہلائے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ یہ بتاؤں کہ دیکھو وہ یہاں اس لیے نہیں رہتے تھے کہ کوئی مجبوری تھی۔ انھیں اپنا روپیہ چند غیر معروف جرائد پر خرچ کرنا زیادہ پسند تھا۔ اس لیے انھوں نے بڑھیا موٹر کاروں اور عالی شان مکانوں پر اپنا پیسہ خرچ نہیں کیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو یقین آ سکتا ہے۔

مکان کے نچلے حصے میں صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک پر موٹے موٹے لکڑی کے تختے رکھ دیئے گئے تھے۔ دوسری کھڑکی کھلی تھی۔ اس کے اندر سے ہم وہاں لٹکتے ہوئے رنگین پردوں کو دیکھ سکے جو کسی مخمل جیسے کیمیاوی کپڑوں کے بنے ہوئے لگتے تھے۔

وہ ڈان کے سونے کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ کھڑکی کے پٹوں پر اخبارات کے تراشے چپکے ہوئے دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جسے ۱۹۴۰ء کی ستمبر کی ایک رات ڈان نے کھولی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے دوسرے لوگوں کے ساتھ چٹائی پر سوتے سوتے تھک گیا تھا۔ اپنے بستر کو نہ پاکر وہ ہمیشہ بے خوابی کا شکار رہتا۔ نیچے

سیڑھیوں سے لگے سوتے رہنا نسبتاً محفوظ تھا۔ اُسے نیند بہت آرہی تھی۔ پورا ہفتہ وہ مشکل ہی سے سوسکا تھا اور دوسری صبح اسے معمول کے مطابق پریس جانا تھا۔

اوپر کے حصے میں سونا بھی آرام دہ نہ تھا۔ ہوائی جہازوں کے اڑنے کی اونچی آوازیں آتیں۔ آس پاس کے کسی بھی علاقے میں بم پھوٹ پڑتا تو اس کے لوہے کی پلنگ ہلنے لگتی اور اس کے اسکریو ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس کے بارے میں اس نے دوسروں سے کہا بھی اور ایک صبح اُن لوگوں نے اس کے پرانے بستر کو وہاں سے اٹھانا چاہا لیکن وہ اسے تلاش نہ کر سکے۔ بستر تو بہر حال وہاں تھا۔ پھٹی ہوئی حالت میں۔ بستر سے باہر نکل کر اس نے سگریٹ سلگا لی۔ جلتے ہوئے سگریٹ کی روشنی کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے اس نے کھڑکی کا کچھ حصہ کھولا۔ تازہ ہوا نے اُسے کچھ فرحت بخشی اور رات سہانی ہو گئی۔

نیچے کے حصے میں سب ہی سو رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے شیوا سے ہوٹل کے سامنے احتجاج کرتے ہوئے اس بات کا مطالبہ کیا تھا کہ ہوٹل کے تہہ خانوں میں مشرقی حصوں میں رہنے والوں کے لیے ایر ریڈ شلٹرس بنا دیئے جائیں۔ مظاہرہ کے بعد وہ لوگ برک لین کو فاتحانہ لوٹے تھے۔ کچھ کر چکنے کی مسرت انھیں حاصل ہو گئی تھی لیکن بعد میں جب وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے تو ڈان نے ریڈیو آن کیا تھا۔ تب قومی سوگ دھن بج رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے انھوں نے اسے خاموش سنا پھر فرانسسکا نے رونا شروع کر دیا۔ تب ڈان نے سوئچ آف کیا اور اب وہ تینوں اُسی چٹائی پر گہری نیند سو گئے جسے انھوں نے بموں کے گرائے جانے سے قبل بچھائی تھی۔ اور جب ایک بھیانک آواز ہو کر چیرتی ہوئی گزری تو ڈان گھبرا گیا لیکن آواز اچانک ساکت ہو گئی تو اسے بھی اطمینان ہوا۔ تب اس کا دھیان سگریٹ کی طرف گیا۔ بموں کے گرائے جانے کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ ابھی شہر والوں میں اجتماعی بچاؤ کا احساس جاگا نہ تھا ورنہ پہلی آواز کے ساتھ ہی وہ زمین پر اوندھا لیٹ جاتا۔ ویسے کھڑکی سے لگے فٹ پاتھ پر ہی بم گرا تھا اور وہاں کوئی دس فیٹ کا گہرا گڑھا پڑ گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں تاج ٹراویل ایجنسی کا شوروم تھا۔ بموں کے گرائے جانے کے شروع شروع ہی میں یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بم کے

گرنے کے ساتھ ہی چاروں طرف اس کے جسم میں لوہے کے پرزے دھنس گئے تھے۔ ہیوی اسکیو سروس کے لوگ جب اس کی لاش کو لینے آئے تو انھوں نے اس کے جسم پر جگہ جگہ چھید دیکھے۔ یہ بموں کی کارستانی تھی۔

مکان کا جو حصّہ سب سے پہلے منہدم ہوا وہ سیڑھیوں کا علاقہ تھا۔ بم کے دھماکے سے جب عمارت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو کسی زنجیر سے ایک زوردار آواز آئی۔ اس ایک لمحے کے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹریسا سن نے مائیک کو دھکا دیا اور اسے فرانسسکا کے اوپر پھینک دیا۔ تب ایک دوسری زنجیر اس کے جسم پر پڑی۔ اس کے ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی اور اسی لمحہ اس کی موت واقع ہوئی۔

فرانسسکا کا جسم مائیک کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کے جسم کو تو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔ لیکن وہ شدید صدمے کا شکار ہوئی۔ ملبے کو ہٹا کر اسے نکالا گیا۔ ایک ماہ بعد اسے وہیٹ کے جزیرے میں دشمنوں کے کیمپ میں رکھا گیا۔ اس کے بعد مسز پرائس کو اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ مائیک تو بچ گیا تھا۔ وہ نیوی میں خدمت انجام دینے کا معاہدہ کر چکا تھا۔ مہینے بھر بعد ہی اسے بلا لیا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں مسز پرائس نے اس کا نام جنگ میں کام آنے والوں کے نام میں دیکھا جو ٹائمز اخبار میں چھپا تھا۔ اس کی کشتی کو لووسٹافٹ کی بندرگاہ کے پاس ہی تارپیڈو سے نشانہ بنا دیا گیا۔

دو دن بعد مایا دیبی اور مسز پرائس کے ساتھ ترڈیب پرک لین آیا تاکہ ٹریسا سن کا سامان اکٹھا کیا جا سکے۔ وہاں آسے چاروں کی وہ تصویر ملی جو رسوئی گھر کی دیوار سے آویزاں تھی۔ تصویر کو ایک پارک میں لیا گیا تھا۔ وہ سب کے سب ہنس رہے تھے۔ ڈان تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا اور مائیک نے اپنے دونوں ہاتھ ٹریسا سن اور فرانسسکا کے کاندھوں پر رکھے تھے۔

حیف۔ الا نے کہا۔ یہ لوگ اس مکان میں کس قدر خوش نہ رہے ہوں گے۔

تم کیسے جانتی ہو۔ اس کے لہجے میں یقین کی جھلک دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

اس لیے کہ ہم لوگ بھی اسٹاک ویل میں اسی طرح رہتے ہیں۔ اس نے کہا۔

شروع میں میں نے سوچا وہ مذاق کر رہی ہوگی لیکن جب میں نے اس کی آنکھوں میں

تھا نکا وہ سچی لگ رہی تھی ۔ مجھے اس کی ان حماقتوں پر تعجب ہوا کہ اس کے تجربے میں زمانوں مکانوں کی کوئی قید نہیں ہے کہیں بھی اور کسی بھی وقت۔

ساری جگہیں ایک ہی جیسی لگ رہی تھیں۔ ایئر پورٹ کے لانج جیسی ۔

کیا تمہارا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص ایسے لمحات میں سچ مچ خوش رہ سکتا ہے ؟ میں نے ایک سوال داغا۔ تم نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ وہ آپس میں جھگڑتے ہی رہے ۔ مثال کے طور پر سوویت نازی معاہدے پر ؟

الا پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ وہ بڑی مطمئن تھی۔ اس نے کہا یہ سچ ہے کہ وہ جھگڑا کرتے رہے پھر وہ ہنس کر کہنے لگی ۔ اس طرح زندگی گزارنے کا بھی ایک انداز ہے۔ تم نہیں جان سکتے ۔

تمہیں کیا معلوم کہ میں کس طرح زندگی گزارتا رہا ؟ میں نے کہا۔

ٹھیک ۔ اُس نے پُرسکون انداز میں کہا ۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ تم نے دلی اور کلکتے کے متوسط طبقے کے لوگوں میں بڑی محفوظ زندگی گزاری ہے ۔ تم اُس انبساط کو حاصل نہیں کر سکتے جو اس احساس سے ہو سکتا ہے کہ تم تاریخ کا ایک جزو ہو۔ اسٹاک ویل کے چھوٹے سے گھر میں ہم کچھ زیادہ حاصل نہیں کر سکتے لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے باشعور لوگ چاہے وہ نائجیریا، ہندوستان یا ملیشیا کہیں ہوں انھیں ہم یاد آتے رہیں گے ۔ یہی بات ٹریسا سن اور اس کے ہم عصروں پر صادق آتی ہے۔ کم از کم وہ یہ جانتے تھے کہ تاریخ کے ایک اہم دور کا وہ ایک حصہ تھے ۔ اس دور کا جس میں فاشزم کی جنگ دنیا پر مسلط کر دی گئی تھی ۔ اور وہ تمام باتیں جو آج تم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہو۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بے مقصد موت میں بھی ایک مجاہدانہ عمل ہے اور یہی سبب ہے کہ تم ہمیں یہاں لے آئے ہو۔ اُن جیسے واقعات کی بلندی تک تم نہیں پہنچ سکتے۔ تم جہاں موجود ہو وہاں تو کوئی اہم واقعہ ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا کوئی اہم واقعہ ہو نہیں سکتا ۔ میں نے حیرت سے پوچھا ۔

ہاں ۔ ہاں ۔ ہوتا ہے ۔ قحط ، فساد اور بربادی ۔ اس نے کہا ۔ لیکن وہ تو مقامی واقعات ہیں ۔ کوئی انقلاب نہیں اور نہ ہی فاشزم کے خلاف کوئی جنگ ۔ کوئی ایسا واقعہ نہیں جو دنیا

کی سیاست پر اثر انداز ہو۔ ناقابل واقعہ کوئی نہیں۔

اُس کا یقین، اس کا اعتماد، اس کے تجربات کی گہرائی اور بیان میں روانی اس بات کے غماز تھے کہ اُسے مجھ جیسے معمولی انسان سے ہمدردی ہے۔ ایک ایسے شخص سے جو ایک پس ماندہ علاقے میں زندگی گزار رہا ہو۔ ایسا علاقہ جہاں کوئی ہلچل ہی نہ ہو۔

میں نے چیخ کر کہا کہ مجھے اُس کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ وہ اور اُس کے قابلِ رحم دوست جو اُس جنگ کا حصہ تھے۔ ان سب سے مجھے ہمدردی ہے۔ اُسے جرأت کا مفہوم ہی معلوم ہے نہ ہی وہ سیاست سے واقف ہے۔ تریسا سن جیسے انسانوں کو اس کے مقابلے میں میں اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں اس دور کو بہتر سمجھ سکتا ہوں جس دور میں سیاست سنجیدہ تھی۔

سنجیدہ! تیکھے لہجے میں اس نے کہا۔ خدا کے لیے۔ تم ایک بھولے بھالے انسان ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ برلن کے شراب خانوں میں بیٹھے لوگ کیا کرتے رہے۔ شاید انھوں نے اپنا سارا وقت ایک دوسرے کا بستر حاصل کرنے میں گنوایا۔ نازی سوویت معاہدے پر نہیں۔ تم تو اندازہ لگا ہی نہیں سکتے اس لیے کہ تم انگلینڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ سچ ہی کہہ رہی تھی۔ میں انگلینڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کی ا... دات کے۔ تاہم میں اپنی عمر کے ان لوگوں سے واقف تھا جو کلکتے کے انیس سو ساٹھ اور ستر کے ہیبا... واقعات سے گزرے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے ان لوگوں کی ہمت و جرأت کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ دلکش لباس اور خوبصورت ننھی ہاتھوں والی ایلا ان سے کبھی واقف نہ ہو سکے گی۔

لیکن یہ بھی کوئی سچائی نہیں ہے کیونکہ جس دن میں ایلا کے ساتھ بال بنانے والی کی تاب نے ملا تھا اس وقت ایلا کے بال گھنگرالے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو اس کی نظر فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث غنڈوں پر پڑی جن کے ہاتھوں میں سائیکل کی چینیں تھیں۔ وہ فوراً ان پر ٹوٹ پڑی۔

میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ ایسی جانبازی میں کبھی دکھا نہ پاؤں گا۔

نِک ہم دونوں کی بے مقصد بحث سے اُکتا گیا تھا۔ اب یہاں سے چلیں۔ اس نے کہا۔ اور اُس گھر پر ایک نظر ڈالیں۔

اُس نے ہمیں سڑک پار کروائی۔ پھر تاج ٹراویل ایجنسی کے شیشے کے دروازوں کو دھکّا دیا۔ وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھُلا۔ اتنا بڑا کمرہ کے بیچ کی دیوار گر جانے سے دو کمروں کا ایک بن گیا تھا۔ کمرے کی ایک جانب بہت بڑی میز رکھی تھی۔ اس کے پیچھے چند لڑکیاں قطار میں بیٹھی تھیں۔ بعض لڑکیوں نے تنگ پاجامے پہن رکھے تھے اور بعضوں نے اسکرٹ۔ جوں ہی نِک نے دروازے کو دھکّا دیا گھنٹی کی دھیمی آواز آئی۔ وہاں بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک نے ہماری طرف ناگوار نظروں سے دیکھا اور اس کی میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ لیکن کرسیاں سنبھالنے سے قبل ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے جو بھورے سوٹ میں ملبوس تھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھا تھا۔ بنگالی زبان میں اس لڑکی سے کہا۔ زینت انھیں یہاں بھیج دو۔ میں ان سے نبٹ لوں گا۔

ہم اس کی میز کی جانب بڑھنے لگے تو وہ ہماری پرکھ کرتا رہا اور ہم اس کے پاس پہنچ کر بیٹھ گئے تو اس نے روکھے لہجے لیکن لندن کی مخصوص آواز میں کہا۔ میں آپ لوگوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔

اِلا نے اپنے آپ کو ہندوستانی نوخیز لڑکی کے انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ہم کو آپ سے کچھ معلومات درکار ہیں۔

میز کے پیچھے بیٹھا ہوا آدمی ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اِلا کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ آپ کتنے لوگ سفر کر رہے ہیں۔ ہم تو گروپس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔

ہم لوگ کلکتہ جا رہے ہیں۔ مَیں نے بے نیازی سے ہنستے ہوئے بنگالی میں کہا۔ کیا آپ ہمیں کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔

یہاں سارے کاروبار انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور میں اس وقت تک تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا جب تک تم یہ نہ کہو کہ تم کتنے لوگ سفر کر رہے ہیں۔

تمہارا رویّہ دوستانہ نہیں ہے۔ نِک نے کہا۔ غور تو کرو۔

دوستی میرا کام نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا۔
مجھے اتنا تو بتاؤ کہ یہاں کبھی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے چپکے سے سوال کیا۔
کیا ؟ وہ مجھے گھورنے لگا۔
میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہاں کبھی سیڑھیاں تھیں جو بم کے گرنے سے تباہ ہوگئیں۔
یہاں سے نکل جاؤ۔ اس نے کہا تم نے میرا بہت وقت برباد کیا ہے۔
ذرا اِدھر دیکھو نِک نے کہا۔
اگر تم سیدھا نہ مانو گے تو میں تمہیں یہاں سے دھکے دے کر بڑھا دوں گا۔ اس نے کہا۔
مجھے یہ جگہ پسند نہیں۔ میں تو چلی۔ اِلا نے کہا۔
ہم لوگ ایک ساتھ اُٹھے اور دروازے کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ آدمی ہم کو پیچھے سے گھور کر دیکھتا رہا۔
میں نے سنا وہ اپنے منہ میں اندر ہی اندر کچھ بک رہا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتا ہم باہر آ گئے تھے۔
جب ہم سڑک پار کر چکے تو میں نے پلٹ کر ایک آخری نظر اس مکان پر ڈالی۔ اس خیال سے کہ آس پاس میں کوئی بڑی دراڑ نظر آ جائے۔ جیسا کہ تردیب نے کہا تھا۔
نِک تھوڑی دیر کے لیے رک گیا اور مڑ کر تاج ٹراویل ایجنسی کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کہا۔ ایسے ہی لوگوں کے حوالے کیا جانا چاہیے۔ ان کا کوئی بدل نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تجارت بڑھا لیتے ہیں۔ اگر مجھے تھوڑا بہت سرمایہ حاصل ہو جائے تو میں سٹہ بازار میں داخل ہوں گا۔ میرے بعض دوستوں نے وہاں خوب مال بنایا۔ صرف اس قدر جاننا ضروری ہے کہ کس وقت کون سا مال خریدا جائے۔
مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔
کیا پہلے تمہیں نوکری نہیں کر لینی چاہیے۔ سٹہ بازار کا خیال تو بعد میں آئے۔
میرے کہنے پر اس نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ یا پھر سنجیدہ ہونے کا بہانہ کرنے لگا۔

اس نے کہا۔
مشکل تو یہ ہے کہ نوکری میں کچھ زیادہ کمائی ہاتھ نہیں آتی۔ سچ مچ حیرت کی بات ہے۔
چارٹرڈ اکونٹنٹ کو پندرہ ہزار سے ابتدا کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ یا کویت جیسے ملکوں میں اس
کا دوگنا، تگنا مل جاتا ہے۔

پھر تم نے کویت کی ملازمت کیوں چھوڑ دی؟ میں نے پوچھا۔
میں اکتا گیا تھا۔ اس نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی موزوں جگہ نہیں تھی نظم ونسق
کے پرانے طریقے۔ میں نے وہاں اپنا بزنس قائم کرنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن مشکل یہ ہے
کہ آپ کو کسی عرب باشندے کی ساجھے داری درکار ہے اور وہ لوگ آپ کے کام میں ہمیشہ
مداخلت کرتے رہتے ہیں۔

تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ تم نے کسی دن اچانک نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور چلتے
بنے؟ میں نے کہا۔ میری باتیں شاید اُسے مشکوک لگیں کیونکہ وہ اب میری طرف سرد مہری
سے دیکھ رہا تھا۔

ہاں۔ میں نے یہی کیا تھا۔ اُس نے کہا۔
سچ! میں نے کہا۔ لیکن میں تمہاری جگہ ہوتا تو سٹہ مارکٹ کے بارے میں سوچنے سے قبل
ملازمت کی تلاش میں رہتا۔

الا نے بے ڈھنگے پن سے اپنا ہاتھ نک کے کاندھے پر ڈالا۔ میں نے کنکھیوں سے اُس
کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور وہ مجھ سے ناراض ہو چکی تھی۔

مجھے اور نک کو اب جانا ہے۔ اس نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس قدر تجربہ ہے کہ
تم اپنی شاپنگ خود کر سکتے ہو۔

یہ کہہ کر وہ اپنے پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ پھر مجھے چھوڑ کر نک کو ساتھ لے کر آگے
بڑھ گئی۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ میری زبان بند رہی۔ وہ دونوں کوئی سو گز چلے
ہوں گے کہ نک کو وہیں چھوڑ کر الا دوڑتی ہوئی میری طرف آئی۔

میں نہیں چاہتی کہ میری موجودگی میں تم میرے دوستوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آؤ۔

اُس نے کہا۔ آئندہ سے اسٹاک ویل آنا ہو تو ٹیلیفون کر لینا۔ شاید میں نہ رہوں۔

اِلا سے دوبارہ ملاقات ایک ہفتہ بعد ہوئی۔ وہ کرسمس کی شام تھی۔ ہم لیمنگٹن روڈ پر مسز پرائس نے ہم لوگوں کو شام کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

اِلا بہت دیر میں پہنچی۔ جس وقت مسز پرائس اور مٹے کھانا پروسنے لگے تو وہ ہم سب سے کھُل کر باتیں کرنے لگی۔ اس کا چہرہ روشن تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک چھوٹی اسکرٹ پہنے ہوئی تھی لیکن اس کا جوتا گھٹنوں تک لمبا تھا۔ اس نے آتے ہی پہلے ہم سب سے باری باری معافی چاہی۔ جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

تم اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ اس نے چپکے سے کہا۔ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے۔

پھر اس نے موضوع بدلا اور میز کی تعریف کرنے لگی۔ میز خوبصورت سجایا گیا ہے۔ موم بتیوں کی روشنیوں میں شیشے چمک رہے ہیں۔ درمیان میں پھلوں سے بھرا کٹورا جگمگ کر رہا ہے۔ ہم لوگ جب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو مٹے نے سوپ پیش کیا اور نِک نے ہماری گلاسوں میں وائن انڈیل دی۔ اِلا والہانہ انداز سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر چلّائی اور کہنے لگی۔ ایک اچھی خبر ہے۔ آپ لوگ شاید یقین نہ کریں۔

میرا دل بیٹھنے لگا جب میں نے دیکھا کہ اُسے کا دمکتا ہوا چہرہ نِک کی طرف ہو گیا ہے۔

مجھے کام مل گیا۔ وہ بولی۔

بہت خوب۔ مٹے نے کہا۔ کیسا کام؟

بچّوں کے تحفظ کا فنڈ ہے۔ اِلا نے کہا۔ تنخواہ زیادہ تو نہیں لیکن کام بہت اہم ہے۔

بڑے ہی پُر سکون لہجے میں مَیں اُس سے مخاطب ہوا۔ میرا خیال تھا کہ بچّے تمہیں پسند نہیں ہیں۔

مجھے اس نیچی مخلوق کے ساتھ رہنا نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ میرا کام ان کی حفاظت ہے۔
اور سارا کام چونکہ حساب کتاب اور فائیلوں کا ہے اس لیے کوئی مشکل نہیں۔

ہم لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ نِک نے جام بڑھایا اور سبھوں نے اپنی اپنی گلاسیں خالی کیں۔ تب مسز پرائس نے کانپتے ہوئے اپنا گلاس اوپر کیا۔ اُس کے جھرّیاں بھرے چہرے پر مزید لکیریں اُبھر آئیں۔ وہ مسکرائی۔ اس نے کہا۔ اگر آپ لوگ اس بُڑھیا کی بات مان لیں تو میرا خیال ہے کہ ہمیں اس وقت مسٹر جسٹس چندر شیکھر دتّا چودھری اور میرے باپ مسٹر ٹریلاسن کے نام جام نوش کرنا چاہیے کیونکہ انھیں کی بدولت آج ہم لوگ یہاں اکٹھّے ہیں۔

ہم لوگوں نے دوبارہ اپنے گلاس اٹھائے۔ اس دفعہ بڑے تقدس کے ساتھ۔ نِک نے اپنا گلاس خالی کیا۔ گلاس کو اپنی دونوں انگلیوں میں گھماتے ہوئے اور منہ میں الفاظ رولتے ہوئے اُس نے کہا ہمارے دادا ٹریلاسن نے بڑھیا زندگی گزاری تھی۔ کس قدر مزہ نہ آیا ہوگا دنیا کا سفر کرتے ہوئے ڈکنس کے ناولوں کے کرداروں کی طرح۔ ایسی عمدہ بات نہ پہلے کبھی ہوئی تھی نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

اُس نے سورت لبوریکر کاندھے اُچکاتے ہوئے مجھے دیکھا۔

اور مجھے کیا ملا۔ اس نے کہا۔ قدیم، فرسودہ، کوویت۔ وہیں پیدا ہونے کا یہی تو انجام ہے۔

ٹھیک۔ مئے نے سرسری انداز میں کہا اور ہماری پلیٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ ان امکانات پر غور کریں کہ اگر دادا ٹریلاسن اس وقت زندہ ہوتے تو تمہارے مقابلے میں کوویت سے زیادہ استفادہ کرتے۔

کوویت ؟ نِک نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ اگر تم ٹھیک سے واقف ہوتے تو ایسی بات نہ کرتے۔ وہ تو ایک حباب ہے جو کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ٹوٹنے سے قبل ہی میں وہاں سے نکل پڑا۔

مئے نے اپنی پلیٹیں میز پر ٹکیں اور نِک کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ نِک بہتر ہوگا کہ تم کوویت کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ ایک آدھ بات سن کر تو میں چپ ہوگئی تھی لیکن اب لگتا ہے کہ تم بھی یقین کرنے لگے ہو۔ تمہیں نہیں چاہیے۔ تمہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ تم کو چاہیے کہ

سچی بات بتادو۔ میری ہی طرح تمہیں بھی سچ کہنے کی تربیت دی گئی ہے۔ ان لوگوں کی آنکھ میں جھانک کر دیکھو اور وہی کہو جو تم نے ہم سے کہا ہے۔ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ تمہارا باس تمہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے تم پر غبن کا جھوٹا الزام لگایا۔ اگر وہ جھوٹا ہی تھا۔

نِک کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے اپنا نیا پکن میز پر پٹکا اور مئے کی طرف غصّے سے دیکھنے لگا۔

تم جھوٹی ہو، چھنال ہو، اس نے کہا۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔ ہوں۔ کسے پسند ہوگا کہ ہر روز ناشتے پر اس منحوس چہرہ کو دیکھتا رہے؛

پھر وہ مسز پرائس کی طرف مڑکر کہنے لگا کہ وہ اپنے کمرے میں جارہا ہے۔ اسے اب کھانے کی حاجت نہیں۔ لیکن مسز پرائس گہری نیند میں ڈوب گئی تھیں۔ ان کی ٹھوڑی ان کی گردن میں دھنسی — وہ مزید ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ الا اس کے پیچھے دوڑی دوڑی آئی۔

مئے نے چپ سادھ لی۔ وہ موم بتی کے جلتے ہوئے شعلے کی طرف بے مقصد گھورتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ اے خدا میں نے کیا کیا ہے۔

کوئی پون گھنٹے بعد نِک اور الا ایک ساتھ واپس آئے۔ ہم لوگوں نے مسز پرائس کو جگایا۔ مئے نے بھُنی ہوئی ٹرکی لائی اور اسے میز پر سجایا۔ مسز پرائس نے تجربے سے کلکتے کے بارے میں چند باتیں کیں۔ کسی اور نے کوئی اور بات نہ کی۔ مئے نے شمعیں جھائیں۔ جیسے نیم غنودگی میں وہ کوئی رسم پوری کر رہی تھی۔ وہ کرسمس پڈنگ آگے بڑھائی اور جب اس نے تیلی جلائی تو برانڈی کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ اس شفاف نیلگوں شعلے پر صرف اکیلے میں نے تالی بجائی۔

آپ کا بہت شکریہ۔ میں نے مسز پرائس سے اس طرح کہا کہ بات بدمزہ نہ لگے۔ یہ بہت عمدہ شام رہی۔ سچ مچ ایک انگلش کرسمس۔ اس سے بہتر اور کوئی بات نہ ہو سکتی تھی۔ بہت ہی خوب۔ لیکن اب میں اجازت چاہوں گا ورنہ میرے گھر جانے کا آخری ٹیوب چھوٹ جائے گا۔

وہ مسکرائی۔ اپنی ایک آنکھ بند کرتے ہوئے اور ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آکر محظوظ ہوئے۔ تمہیں دوبارہ آنا چاہیے۔

جب میں اپنے گلوبند اور اوورکوٹ تلاش کر رہا تھا تو مئے کھڑکی کے قریب پہنچ کر باغیچے

کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نہیں سمجھتی کہ تم اس وقت جا سکو گے۔ اس نے کہا۔ کیا تم نے باہر کا منظر دیکھا ہے؟ باہر برفانی طوفان ہے۔ تم اکڑ جاؤ گے۔

میں آگے بڑھ کر اس کے بازو کھڑا ہو گیا۔ دستانے پہنے اور اوورکوٹ اوڑھے ہوئے میں دور تک دیکھ نہ سکتا تھا۔ ہواؤں کے ساتھ برف کے بگولے اُڑ رہے تھے۔

بہتر ہے تم رُک جاؤ۔ مٹے نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کو ٹھہرنا ہے۔ اس طوفان میں اسلنگٹن واپس ہونے کی مجھ میں ہمت نہیں۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں اگر چلا جاؤں تو وہ یہاں ٹھہر نہ سکے گی۔

ٹھیک ہے۔ میں نے کہا۔ میں ٹھہر جاؤں گا۔

لیکن میں آپ سب کے ٹھہرنے کا انتظام کہاں کروں۔ مسز پرائس نے کہا۔ تمہارے پرانے کمرے میں دو آدمیوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ کیا نِک کے پاس بھی نہیں۔

میرا خیال ہے۔ میں نے ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر کہا۔ یہ دونوں اُس سیلر میں سو سکتے ہیں۔ اُس پرانی کیمپ کی پلنگ پر۔ وہاں پرانا ہیٹر بھی ہے۔ سردی بھی نہیں لگے گی۔ نِک اور میں ہمارے سونے کا بیگ بھی انھیں دے سکتے ہیں۔ آرام مل جائے گا۔

یہی بہتر ترکیب ہے۔ میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ہلکی مسکان کے ساتھ اِلا نے کہا۔

میں نے سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ میرا دل امید سے اُچھل پڑا۔

تب تو تم اس کا انتظام کرو۔ مسز پرائس نے کہا۔ میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں اسّی سال کی بوڑھی ہو چکی ہوں۔ اب میں سونے جاؤں گی۔

مٹے تیزی سے کمرے سے باہر نکلی اور ہم اس کے پیچھے چلے۔ سیڑھیوں سے لگے دروازے کو اُس نے دھکا دے کر کھولا اور روشنی کا بٹن دبایا۔ اندر تھوڑی سی رطوبت کی بو آئی۔ اس میں ابھی گندگی نہیں تھی۔ میری توقع سے زیادہ صاف ستھرا مقام نکلا۔ سیلر کے ایک کونے میں پیپر بیگس کا ایک انبار تھا تو دوسری طرف صندوق اور سوٹ کیس ایک پر ایک دھرے تھے۔

مئے نے ہمیں سوٹ کیس میں رکھے ہوئے کیمپ کے بستر دکھائے۔ نِک نے اور میں نے مِل کر انھیں باہر کھینچا۔ انھیں کھولنے کی ترکیب سوچنے میں ہمیں تھوڑا وقت لگا۔ جب ہم لوگوں نے انھیں باہر نکالا اور بچھا کر دیکھا تو وہ آرام دہ لگے۔ نِک اور اِلا دونوں اوپر کی منزل میں جاکر سلیپنگ بیگس حاصل کیے۔ تولیے اور شب خوابی کے لباس۔ تھوڑی ہی دیر میں سیلر ہمیں گرم اور اپنا سا لگا۔ تب مئے اور نِک نے ہم دونوں کو شب بخیر کہا اور چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد مجھے دیکھنے کے لیے اِلا میری طرف مڑی۔

اب یہاں ہم دونوں رہ گئے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ہوزس کھیلنے والے پرانے میز کے نیچے آ گئے۔

میں نے اپنا سر ہلایا اور بستر کے کونے پر لڑھک گیا۔ میری پنڈلیاں کانپ رہی تھیں اور ہتھیلیاں نم ہو چکی تھیں۔ اِلا نے میری طرف پیٹھ کی اور اپنا جیکٹ اور سوئٹر اتارا۔ دھیمی آواز میں وہ کہتی رہی کہ کس طرح مئے نے وہ شام برباد کی تھی۔

اب وہ ایک مہین بلوز میں تھی۔ میں اس کے پستانوں کا جائزہ لے سکا۔ یہاں تک کہ اُس کے نپل پر جو تل تھی وہ بھی مجھے نظر آئی۔

یہاں بڑی گرمی ہے۔ اس نے کہا اور اپنے بلوز کے بٹن کھولنے لگی۔ میں نہیں سمجھتی کہ مجھے شب خوابی کے لباس کی ضرورت ہے۔

وہ ایک تولیہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ تب اس کی نظریں مجھ پر پڑیں جو کیمپ کے بستر کے ایک کونے میں دُبکا پڑا تھا۔

کیوں تم مجھے گھور رہے ہو۔ وہ تعجب سے ہنسنے لگی۔ دوبارہ مجھے اپنی پیٹھ تمہاری طرف کر لینی چاہیے۔

وہ مڑی اور اپنا بلوز اتار پھینکا۔ اب میں اُسے سونگھ سکتا تھا۔ تازے پسینے اور صابن کی خوشبو اس کے جسم سے آنے لگی۔ میں اس کی نرم نرم جلد کو دیکھ سکا جو اس کی کمر میں بل کھا گئی تھی۔ اس نے تولیے کو اپنے گرد لپیٹا اور اسکرٹ کو پاؤں سے جھٹک دیا۔ میں اس لکیر کو دیکھ سکا جو اُوپر سے اس کی ٹانگوں تک آ رہی تھی۔

اس لمحہ وہ اپنی بغل سے لے کر اپنی چوتڑوں تک تولیے میں لپیٹے ہوئی تھی۔ اس کا پورا وزن اس کے ایک ہی پاؤں پر تھا۔ اس کی جلد گہرے ملائم سلک کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ کوئی دوسری ہی مخلوق لگ رہی تھی۔ ایک عورت نہیں جس سے ملنے کے لیے میں اور میرے دوست جایا کرتے تھے۔ انسانی جسم کا ایک ایسا نمونہ جو شاید ہی کسی اور میں ملے۔

مجھ سے مزید بیٹھا نہ گیا۔ میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اس کے برہنہ کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اپنا ہاتھ نکالو۔ وہ کھسیا کر ہنسی۔ بڑی سردی ہے۔ وہ میری طرف مڑی۔ میں نہیں جانتا اس نے میرے چہرے پر ایسی کیا بات دیکھی کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی مرجھا گئی۔

کیا ہوا؟ — وہ چلائی۔ تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی کہ مجھے ٹھیک سے دیکھ سکے۔ پھر وہ میری باہوں میں آ کر مجھ سے لپٹ گئی

تم ایک معصوم لڑکے۔ اس نے کہا۔ اس کی آواز ہمدردی سے بھری تھی۔ تم معصوم — ایک معصوم لڑکے۔ اس نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر میرے چہرے پر رکھا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

میں نہیں جانتی تھی۔ اس نے کہا۔ تم میرے بھائی ہو۔ کوئی دوسرا بھائی تو نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اگر معلوم ہوتا تو میں اس طرح پیش نہ آتی۔ سچ مجھ پر یقین کرو۔

کوئی بات نہیں — میں نے کہا۔

وہ میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور اپنی انگلیاں میری گردن اور پیٹھ پر پھیرنے لگی میں معافی چاہتی ہوں۔ وہ کہنے لگی۔ سچ مچ میں معافی کی خواستگار ہوں۔

تمہیں معافی چاہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے۔ اگر ہے تو میرا ہے۔

اوپر کی منزل میں کہیں دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اِلا اُچھل کر اپنے پنجوں پر کھڑی ہو گئی۔

اب مجھے جانا چاہیے۔ فوراً ہی اس نے سوختہ آواز میں کہا۔ میں نِک سے باتیں کرنے جا رہی ہوں۔ وہ بہت ہی بوکھلایا ہوا ہے۔

جب وہ جھک کر میری ٹھوڑی کا پیار لینے لگی تو میں نے اُس کے جسم کی حرارت کو اپنے جسم پر محسوس کیا۔

اب تم سو جاؤ۔ اس نے کہا۔ میں تھوڑی دیر میں لوٹتی ہوں۔

ایک لمحہ بعد میں نے اس کے نرم نرم قدموں کی چاپ سُنی جو اوپر کی سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں چت لیٹا ہوا چھت کو گھورتا رہا جوں جوں وقت گزرتا گیا میں آسی الا کو بار بار اپنے تصوّر میں دیکھتا رہا جسے میں نے اٹھارہ سال قبل گول پارک میں دیکھا تھا۔ اُس صبح اُس نے مجھے پہلی بار جوانی کا احساس دلایا تھا۔ پہلی اور آخری بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہم دونوں کی حاجتوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور اُس رات جب وہ سیلر میں لوٹ کر نہیں آئی تو مجھے لگا کہ میں اپنی زندگی کے ایک حصّے کو کھو چکا ہوں اور میرے وجود کی حیثیت ایک ڈائری کی ہے۔

واپسی

سن ۱۹۶۲ء میں جب مَیں دس سال کا ہوا تو میری دادی ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوچکی تھی ۔ ۱۹۳۶ء سے وہ سوان ہائی اسکول میں پڑھاتی آئی تھی ۔ جب وہ اسکول سے وابستہ ہوئی تو وہاں صرف پچاس طالبات تھیں اور اسکول کی عمارت صرف دو شیڈس پر قائم تھی ۔ اِن کے چھت ٹین کے تھے ۔ بارش کے موسم میں اکثر اسے گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے رہ کر پڑھانا پڑتا تھا ۔ اس کے بیان کے مطابق کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ جیومٹری کی کلاس میں کسی لڑکی نے کمپاس کی سوئی چبھو کر پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی کو پکڑ لیا ۔ لیکن اگلے بیس برسوں میں اسکول بہت ترقی کرچکا تھا ۔ کامیاب اداروں میں اس کا نام آنے لگا ۔ دلیس پریا پارک کے قریب اسکول کے لیے دوسری عمارت بھی خریدی گئی ۔ میری دادی وظیفہ پر الگ ہونے سے چھ سال تک اس اسکول کی صدر معلّمہ رہی ۔

اگرچہ کہ ستائیس برسوں تک اسکول میں کام کرنے کی وجہ دادی کو اسکول سے گہرا لگاؤ ہوگیا تھا تاہم وہ اپنے وظیفہ کا انتظار کرتی رہی ۔ اسکول کے انتظامیہ اور ٹیچروں کی آپسی سازشوں سے وہ بیزار آچکی تھی ۔ وہ اَبّا امّی سے کہتی کہ اب وہ بوڑھی ہوگئی ہے ۔ اس نے اسکول کے لیے خاصہ کام بھی کیا ہے ۔ ویسے میرے باپ بھی اپنی ملازمت بھی مسلسل ترقی کر رہے تھے اور دادی کو اب کوئی فکر دامن گیر نہ تھی ۔

کام کے آخری دن میری دادی کو وداعی پارٹی دی گئی ۔ اس میں مَیں اور میرے ماں باپ بھی مدعو تھے ۔ وہ ایک ضیافت سے پُر عمدہ پارٹی تھی ۔ کلکتہ کارپوریشن نے اپنا ایک نمائندہ بھیجا تھا ۔ اسی طرح کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کے نمائندے بھی موجود تھے ۔ بہت سی تقریریں

ہوئیں۔ ہر جماعت سے ایک ایک لڑکی نے میری دادی کی گلپوشی کی۔ اس کے بعد سب کی طرف سے نمائندگی کرتی ہوئی ایک لڑکی آئی۔ اس نے دادی کو ایک تحفہ پیش کیا جسے تمام لڑکیوں نے چندہ دے کر خریدا تھا۔ وہ ایک بڑا تاج محل کا ماڈل تھا جو سنگ مرمر کا بنایا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک بلب تھا اور اسے ٹیبل لیمپ کی طرح روشن کیا جا سکتا تھا۔ میری دادی نے بھی تقریر کی لیکن وہ اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے ہی رونے لگی۔ اپنے آنسو پونچھنے کے لئے اسے رکنا پڑا۔ جب وہ بڑے سبز رومال سے اپنے آنسو پونچھنے لگی تو میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میرے آزو بازو بیٹھی ہوئی بہت سی لڑکیاں بھی اپنے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ مجھے حسد ہونے لگا۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ دادی سے پیار کرنے کا حق صرف میرا ہے۔ میں اس بات سے کس طرح سمجھوتا کر سکتا کہ میرا یہ حق اسکول کی تمام لڑکیوں نے چھین لیا ہے۔

اس کے بعد اسٹاف روم میں کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ تمام ٹیچروں نے طے کیا کہ دادی کو سرپرائز دیں۔

جب میری دادی ہیڈ مسٹرس تھی تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ تمام لڑکیاں جنھوں نے ہوم سائنس اختیاری مضمون لیا ہے انھیں اپنے گھریلو پکوان کے علاوہ ایک ایسی ڈش بنانا سکھایا جائے جو ملک کے دوسرے علاقوں کی مخصوص ڈش ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس طرح ملک کی وسعت و رنگارنگی سے لڑکیوں کو واقف کروانا بہتر ہوگا۔ وداعی تقریب کے موقع پر ہوم سائنس کے شعبے نے دادی کی دی ہوئی تربیت کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے اس کا انتظام کیا اور ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔

ہمیں اسٹاف روم میں لے جانے کے بعد لڑکیاں بھی یکے بعد دیگرے اپنی اپنی ڈشیں لے کر وہاں پہنچ گئیں۔ میری دادی بہت خوش ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہمارے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے۔ اس طرح کے پکوان میں دادی نے گہری دلچسپی لی تھی اور اسے زبانی یاد تھا کہ کون سی لڑکی کس طرح کی ڈش بنا سکتی ہے۔ وہ رنجنا (یا منا نگنی) ہے۔ انھیں اندر داخل ہوتا ہوا دیکھ کر وہ تالی بجا کر کہتی۔ رنجنا نے کیرالا کی ڈش بنائی ہوگی لہذا آپ کے سامنے اَویال ہے — اور وہ سنیا نا ہے۔ اب آپ ٹاملین بن جائیں اور اس کا آیما چکھیں۔ لیکن بہت زیادہ

خوشی کی وجہ وہ غلطیاں بھی کرنے لگی تھی۔ یہ بہترین گجراتی مٹن خورمہ ہے۔ اُس نے کہا پھر اُچھل کر آگے بڑھی اور چلائی۔ آہ یہ تو میرا پسندیدہ دہی بڑا ہے۔ ابھی ذرا انتظار کرو۔ وہ دیکھو وہ پنجابی کیسی بھری بھری اور رسیلی ہے۔

جس لڑکی نے دہی بڑا بنایا تھا وہ ضرورت سے زیادہ موٹی لگتی تھی۔ وہ رو پڑی۔ دہی بڑوں کی کشتی زور سے پٹک کر سنسکرت ٹیچر کی ساڑی بھگوتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہم نے باقی کھانا بڑی خاموشی سے کھایا۔

بس وہ ایک ہی غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جب ہم لوگ گھر جانے کے لیے اُٹھے تو ٹیکسی میں تاج محل کے رکھنے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ ہیڈ مسٹرس نے اسکول کی ایک بس میں ہمیں گھر بھجوایا۔ جب ہم گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو سارا اسکول ایک ہی قطار میں کھڑا تھا اور ہمیں وداع کر رہا تھا۔ میری دادی نے جوابی سلام کیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

دادی کے وظیفہ پر علاحدہ ہونے کا دن مجھے خوب یاد ہے۔ صبح کے وقت اُس نے تمام فائیلوں کو صاف کیا جو برسوں سے اُس کے کمرے میں جمع ہوگئے تھے۔ شام کے وقت ہم لوگوں کو کمروں میں بلایا گیا۔ مکمل تبدیلی تھی۔ ساری فائیلیں اور کاغذات ہٹ چکے تھے۔ اور اب کمرہ تاج محل کی نرم روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس رات وہ بہت خوش تھی۔ رات کے کھانے پر وہ اپنی اصلی ہنسی ہنس رہی تھی۔ گرمجوش اور شرارت آمیز۔ بند ہونٹوں کی ہیڈ مسٹرس والی وہ ہنسی نہیں تھی جس کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے اسکول کے ابتدائی دنوں کے مزے مزے کے قصّے بھی سنائے۔

لیکن اس کی خوشی بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔

چند دنوں بعد ایک دوپہر جب میں اسکول سے آیا تو میں نے اُسے اور اپنی ماں کو اپنے کمروں میں بند پایا۔ اس رات میں نے اپنی ماں کو میرے باپ سے رو کر شکایت کرتے ہوئے سنا کہ سارا دن اس کی جھاڑ جھپائی ہوتی رہی۔ اس کے پکوان کے بارے میں اس کے کپڑوں کے بارے میں اور گھر کی حالت بنا رکھنے پر۔ میری دادی نے پہلے کبھی ان باتوں

کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

بہت جلد اسے دوسری باتوں کی بھی فکر ہونے لگی۔

ایک دوپہر میرا دوست مونٹو اور میں اسکول بس سے اتر کر گول پارک کی طرف آرہے تھے۔ وہ اچانک گلی میں رُک گیا اور ہمارے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ دیکھو کوئی آدمی پگڑی پہنے تمہاری دادی کے کمرے میں موجود ہے۔

اُس زمانے میں مونٹو میرا بہترین دوست تھا۔ وہ اور اس کے ماں باپ ہمارے بازو کے مکان میں رہتے تھے۔ ہمارے فلیٹ اس قدر لگے ہوئے تھے کہ ہم لوگ بالکونی میں کھڑے ہوکر ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے۔ اُس کا اصل نام مونٹو نہیں تھا۔ منصور تھا۔ اس کا وطن لکھنو تھا لیکن وہ کلکتے ہی میں پلا بڑھا تھا۔ اس کا باپ بالی گنج سائنس کالج میں ایک ٹیچر تھا۔ جب وہ پارک سرکس سے گول پارک منتقل ہوئے تو کسی نے اس کا نام مختصر کرکے مونٹو رکھ دیا۔ بہت کم باتیں ہمارے ایک دوسرے خاندانوں کی ایسی تھیں جس سے ہم واقف نہ تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میری دادی اپنے کمرے میں کسی بھی شخص کو آنے نہیں دیتی چہ جائے کہ ایک پگڑی والا اجنبی۔

جھوٹے۔ میں نے کہا۔ لیکن جب میں نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا تو وہ سچ ہی نکلا۔ بلا شبہہ میری دادی کی کھڑکی میں بیٹھا کوئی پگڑی والا نظر آرہا تھا۔

میں فوراً گلی سے بھاگ کر فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کال بل پر اپنی انگلیاں اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ ماں نے دروازہ کھول نہ دیا۔

تھاما کے کمرے میں کون ہے ؟ میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے انگلی اپنے ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے مجھے ٹھوکہ دیا اور جتایا۔ لیکن میں اسے نظرانداز کرتا ہوا سیدھا دادی کے کمرے کی طرف بھاگا۔

وہ اپنے سر کو گیلی ساڑی میں لپیٹے کھلی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

خاموشی سے میں واپس لوٹ آیا۔ ایک ایک قدم پیچھے کرتے ہوئے اپنی ماں کی تلاش میں۔

تھاما کیا کر رہی ہے۔ میں چلایا۔ اس کے سر کو کیا ہوا ہے۔

میری ماں نے پہلے مجھے بٹھایا۔ پھر صراحت سے یہ بات بتائی کہ میری دادی نے آیورویدک کورس شروع کیا ہے اور ڈاکٹروں نے اسے طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کا تیل دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ ہر روز صبح اپنے سر کو اچھی طرح باندھے رکھا۔

لیکن کیوں۔ میں نے پوچھا۔ اس کے سر کو کیا ہوا ہے۔

میری ماں نے سختی سے مجھ پر غصہ کیا۔

تمہارا سمجھتی ہے کہ وہ گنجی ہو رہی ہے۔ اس نے کہا ۔۔۔ اس کا ضبط ٹوٹا اور وہ ہنسنے لگی ایک تکیے کو اس نے اپنے چہرے پر رکھا تاکہ دادی اماں اس کی آواز نہ سن سکے۔

اس شام میں ہماری بالکونی میں نہیں گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں مونڈے کیسے کہوں کہ میری دادی نے اپنے سر کو کپڑے سے باندھے رکھا تھا کہ اسے اپنے گنجے ہونے کا ڈر ہے۔

خوش بختی یہ ہوئی کہ دادی نے اس علاج کو زیادہ دنوں تک جاری نہ رکھا۔ اس کی مغرور طبیعت نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے سر کو گیلی ساڑی میں لپیٹے گھنٹوں کرسی پر بیٹھی رہے ویسے اس کا سر سفید گھنے بالوں سے بھرا تھا۔

اب اس نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوپہر میں جاتی اور چند ہی گھنٹوں میں واپس لوٹتی۔ بے شمار کہانیاں اس کے پاس ہوتیں جنھیں وہ اسٹاف روم سے جمع کر کے لاتی۔ کس طرح ہیڈ مسٹرس اُن گلاب کے پودوں کو مسمار کرنا چاہتی ہے جنھیں دادی نے بڑے جتن سے بویا تھا۔ وہاں وہ باسکٹ بال کا کورٹ قائم کرنا چاہتی ہے۔ کس طرح بدبخت نے مسز فلاں فلاں کی تفضیحک کی تھی۔ کوئی درجن بار وہ اس طرح اسکول گئی ہوگی کہ نئی ہیڈ مسٹرس نے میرے باپ کو آفس میں ٹیلیفون کیا کہ اگر وہ اپنی ماں کو اسکول آنے سے باز نہ رکھے تو وہ چوکیدار سے کہہ کر اسکول میں میری دادی کا داخلہ بند کر دے گی۔

میں نہیں جانتا کہ میرے باپ نے اسے کیا جواب دیا۔ لیکن میری دادی پھر وہاں دوبارہ اسکول کے یوم قیام تک نہیں گئی۔

اس کے بعد وہ چند ہفتوں تک اکیلی اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ ایک بار دروازہ کھول کر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں

نے فوراً دروازہ بند کیا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کے ہاتھوں میں کیا ہے۔ اس کی بے شمار نیلگوں رنگ کی گٹھلیاں ___ اُن کے باسی پن کو میں سونگھ سکتا تھا۔

ہم لوگوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے ہمارے ساتھ زیادہ وقت گزارنا شروع کر دیا۔ شام کے وقت وہ ہمارے ساتھ بیٹھتی۔ اس کے پاس کوئی کتاب ہوتی یا اس کے گھٹنوں پر وہ خط پڑا ہوتا جسے اس نے ابھی پورا پڑھا نہ تھا۔ یا پھر میرے باپ کا کوئی کام یا میرا ہوم ورک جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تو اپنے کو مصروف رکھنے کی اس کی ایک کوشش تھی۔ ورنہ اب اُسے کسی سے سروکار نہ تھا۔

میں دادی کی اس تبدیلی سے فکر مند ہو گیا تھا اور میں نے اپنے طور پر اس پر قابو پانے کی کوشش بھی کی۔ پہلے میرے اسکول کے ہر کام پر اُس کا خفا ہونا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اب میں خود اس کے پاس اپنے ہوم ورک میں مدد حاصل کرنے کے لیے جانے لگا۔ میں اُسے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے اصرار کرتا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ اپنی کتابوں پر روشنائی پھیلا دیتا کہ اس کی توجہ میری جانب ہو جائے۔ کبھی میری یہ چالیں کامیاب ہو جاتیں اور وہ اپنے مراقبے سے نکل کر میرے کاندھوں پر کسی رولر کے کونوں سے ٹھوکا دیتی۔ لیکن بہت جلد اس کا ذہن کسی اور طرف بھٹک جاتا۔ وہ کھڑکی کے اُس پار گھورتی ہوتی اور میں اپنی پڑھائی میں منہمک ہو جاتا۔ اس کے باوجود نہ اُس کی آنکھوں کی چمک میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی اس کی چال کی پھرتی میں کوئی فرق۔

اس کے سر میں کوئی سودا سمایا ہوا ہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی میری ماں نے ایک دن چپکے سے میرے کان میں کہا۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔

سن ۶۲ء کا سال ہمارے لیے ہنگامہ خیز تھا۔ میری دادی کے وظیفہ پر علاحدہ ہونے کے چند سال بعد میرے والد اپنی فرم میں جنرل منیجر ہو گئے۔ اُن کا یہ تقرر غیر متوقع تھا۔ کیونکہ ان سے زیادہ تجربہ کار اور سینیر لوگ موجود تھے۔ یہ ایسی ترقی تھی جس کا خواب انھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ لیکن میری دادی جو ہماری معمولی معمولی ترقیوں کا ذکر کسی سے کرتے چوکتی نہ تھی۔ وہ اس اہم ترقی پر خاموش تھی۔ اس نے چند ہی لوگوں کو اس کی اطلاع دی۔ مجھے یاد ہے

کہ جب میرے والد کو مددگار منیجر سے ترقی ملی تھی تو کس طرح اس نے لوگوں کو اطلاع دیتے ہوئے ٹیلیفون پر گھنٹوں وقت ضائع کیا تھا۔ مددگار سے منیجر، پھر مارکٹنگ منیجر۔ لیکن اس دفعہ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس نے بہت مختصر اور کم باتیں کیں۔

میرے والد کی ترقی کے فوراً بعد ہم لوگ لیک کے روبرو سدھرن ایونیو کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ گول پارک کے چھوٹے تنگ فلیٹ کے مقابلے میں یہ گھر مجھے شاندار لگا۔ اس میں اتنی جگہ تھی کہ شاید ہم اس کا پورا استعمال بھی نہ کر سکتے تھے۔ اوپر کمرے، نیچے کمرے، ورانڈے، باغیچہ بھی۔ اور چھت اتنی لمبی چوڑی کہ ہم اس پر کرکٹ کھیل سکتے تھے۔ سب سے بڑھیا بات یہ تھی کہ مونٹو اور میرے دوسرے دوست پاس ہی میں تھے۔ یہ مکان گول پارک کے چند منٹ کے فاصلے پر ہی تھا۔

دادی کو گھر بتانے کی ذمہ داری میں نے اپنے اوپر لی۔ اُس کو میں کئی کئی بار گھما لایا۔ چھت اور نچلی منزل کے درمیانی کمرے دکھلائے۔ راستوں اور دروازوں کی نشاندہی کی۔ اُس نے کبھی کبھی خوش دلی کا اظہار بھی کیا لیکن میں جانتا تھا کہ اُس نے میری خاطر یہ بہانہ کیا کہ اس کو ان باتوں میں دلچسپی ہے۔

جیسے ہی ہم لوگ اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے تعلقات کی میزان بگڑنے لگی۔ پرانے مکان میں دادی ہماری گرہستی پر بڑا کنٹرول کرتی تھی لیکن اب اس کی توجہ باقی نہ رہی۔ اب جب کبھی میں بھوک محسوس کرتا اور کپ بورڈ سے دال موٹ نکالنا چاہتا تو اُس کی چابی حاصل کرنے مجھے اپنی ماں کے پاس جانا پڑتا اور اس وقت بھی جب مجھے لیک جا کر مونگ پھلی خرید لانے کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑتی۔

میری دادی کا گھر کے معاملات میں مداخلت کا دائرہ گھٹتا گیا اور اس کی موجودگی اس کے کمرے کی چار دیواری تک ہی محدود ہونے لگی۔

مکان میں اس کا کمرہ سب سے بہتر تھا۔ بہت کشادہ تھا۔ دیواروں میں شرق کی کھڑکیاں لگی تھیں۔ اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا فرنیچر اس کمرے میں مختصر ہی لگ رہا تھا۔ جیسے جھیل میں بکھرے ہوئے پتے۔ میں اب بھی اپنا ہوم ورک لے کر اُس کے کمرے میں جاتا۔ میں جب بھی وہاں جاتا

اُسے کھڑکی سے لگی آرام کرسی پر بیٹھا ہوا پایا۔

سکڑا اور مرجھایا ہوا جسم، جھیل کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ میں کرسی کھینچ کر اُس کے پہلو میں بیٹھ جاتا اور اپنی نوٹ بک میں لکیریں کھینچتا رہتا کہ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروں۔

ایک دن جب کہ وہ کھِچی کھِچی لگ رہی تھی میں نے اپنی نوٹ بک جھلّا کر زمین پر پھینک دی اور چلّایا۔ بھا ما تم ہمیشہ کھڑکی سے باہر اس طرح کیوں گھورتی رہتی ہو؟ کیا تمہیں یہ گھر پسند نہیں ہے؟

اس نے حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری پیٹھ تھپکی۔ یہ بہت پیارا مکان ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم جیسے بچّے کے لیے یہ ایک پیارا مکان ہے۔

تب اُس کے چہرے پر ناگواری کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ یہ مکان اس گھر سے مختلف ہے جس میں مایا اور میں بڑے ہوئے تھے

کس طرح؟ میں نے پوچھا۔

اس کے بعد کئی مہینوں تک ہر شام میری دادی ڈھاکہ کے اُس مکان کے بارے میں بتاتی رہی جہاں وہ پلی بڑھی تھی۔

وہ ایک عجیب طرح کا مکان تھا۔ اُس کی شکل شہد کی مکھیوں کے چھتّے جیسی ہوگی۔ ہر نئی نسل اُس میں اوپر نیچے اضافہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک بے ڈھنگا مخروطی شکل کا ڈھانچہ بن گیا۔ نسل در نسل خاندان کی اتنی شاخیں پھیل گئیں کہ گہری معلومات رکھنے والا بھی اپنے رشتوں کے بارے میں دھوکا کھا جاتا۔

اُن کے اپنے رہنے کا حصّہ بہت بڑا تھا۔ اور میری دادی کی اوّلین یادداشت میں وہاں بڑا ہجوم ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں ان کا بہت بڑا مشترکہ خاندان تھا۔ سب ایک ساتھ رہتے اور ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ اُس کے ماں باپ، اس کے دادا دادی۔ وہ اور مایا دیبی۔ اُس کا جھٹا موشائی۔ اُس کے باپ کا بڑا بھائی اور اس کا خاندان جو اُسی کے ہم عمر چچیرے بھائیوں پہ مشتمل تھا۔ غیر شادی شدہ پھوپیاں بھی تھیں۔ اُسے اپنے دادا یاد تھے۔ حالانکہ وہ صرف چھ سال،

کی تھی جب وہ رحلت کر گئے تھے۔ دُبلے پتلے لیکن مضبوط اور دیکھنے میں سخت گیر، پیشانی پر مستقل ایک اُبھار۔ اُن کی موجودگی میں ہر شخص، اس کا باپ اور جیتھا موشائی بھی آپس میں کانا پھوسی ہی کرتے۔ سر جھکائے ہوئے ہوتے اور آنکھیں فرش پر ہوتیں۔ لیکن جب وہ سیشن کی عدالتوں میں جاتے جہاں وہ ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو گھر میں پانچوں کزنس کا شور مچ جاتا۔ ہر شام پانچوں لڑکوں کو اپنی اپنی مائیں 'اس' کے کمرے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیتیں۔ وہاں انھیں حروف تہجی یاد کرنے پڑتے۔ پہلے بنگالی پھر انگریزی۔ ہاتھ اٹھائے ہوئے۔ ہتھیلیاں زمین کی طرف۔ کبھی کوئی غلطی کرتا تو وہ ان کی انگلیوں کے پوروں پر اپنی چھتری سے مارتے۔ اگر وہ چیختے چلاتے تو اُن کی پنڈلیوں کے نچلے حصے پر مارا جاتا۔

پریشانیوں میں بھی وہ کسی طرح سب کو ایک ساتھ لے کر چلتے۔ اُن کے مرنے کے بعد اُن کا بڑا بیٹا جیتھو موشائی باپ کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اُن سے بھی عجیب تھا۔ وہ ایک لحاظ سے محبت کا آدمی تھا لیکن بعض معاملات میں وہ اپنے باپ سے زیادہ خوفناک تھا۔ دُبلا پتلا منحنی اور نیم جان لیکن آنکھیں بڑی تیز اور روشن، اس کے لمبوترے چہرے اور بھنوؤں کے خول میں دھنسی ہوئی۔ اس کے خیالات بھی عجیب تھے۔ مثال کے طور پر وہ کھڑے رہ کر کھانا پسند کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہاضمہ کے لیے یہی بہتر طریقہ ہے۔ ایک گائے سے بہتر کسی کا ہاضمی نظام اچھا نہیں ہے وہ کہا کرتا اور اُن کی طرف دیکھتا کہ وہ کھڑی ہو کر کھا رہی ہیں۔ بلا شبہہ وہ سنکی تھا۔ اسی لیے بچے اُس کے ساتھ سنجیدہ نہ رہتے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے اصرار کیا کہ بچے ہر شام اُس کے سامنے بھی اُسی طرح حروف تہجی پڑھا کریں۔ باپ کی نقل میں وہ اسی طرح بیٹھا رہتا۔ چھتری کا ہینڈل بچوں کے ہاتھوں کی پشت پر رکھے ہوئے۔ چھتری کی نوک بچوں کے ٹخنوں کی طرف ہوتی۔ وہ اپنے باپ کی طرح دکھائی دینے کی پوری کوشش کرتا لیکن اس کی ایک عجیب عادت تھی وہ ہونٹوں سے سانس خارج کرتا۔ بالکل تانگے کے گھوڑے کی طرح۔ اس کثرت سے کہ مایا دیبی یا میری دادی بچوں کی پڑھائی کے اوقات ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اس سے اُس کے غصّے کا پارہ چڑھ جاتا اور وہ بچوں کے ٹخنوں پر ماروں کی بوچھار کر دیتا۔ بچّے بلبلا کر رونے لگتے تو وہ

آپے سے باہر ہو جاتا اور ان کی پنڈلیوں پر لاتیں مارتا۔ اس کی ان حرکتوں سے بچّے لطف بھی اُٹھاتے کیونکہ جیٹھو موشائی اتنا طاقتور نہیں تھا کہ وہ انھیں کسی طرح کی گزند پہنچا سکتا۔ اس کے علاوہ غصّے میں کبھی کبھی اس کا چہرہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا۔ مار کھائے ہوئے بچّوں کی ماں تو یکدم خفا ہو جاتی۔ اسے کیا معلوم کہ جیٹھو موشائی بچّوں کا بُرا نہیں چاہتا ہے۔ بات صرف یہ تھی کہ اُسے اپنے آپ پر قابو نہیں تھا۔ بچّوں کو سزا دے کر وہ انھیں خوش کرنے کے لیے حلوہ یا مٹھائی چوری چھپے خرید کر لا دیتا۔ بچّوں کی ماں کو اس کا علم نہ ہوتا۔ خسر کو مرے مہینہ ہی ہوا ہوگا کہ جیٹھو موشائی اور اس کی بیوی بچّوں سے دوسری بہو کی بات چیت بند ہو گئی۔

حالات کو بگڑتے دیر نہ لگی۔ دونوں خواتین ایک دوسرے پر شک کرنے لگیں کہ وہ صرف اپنے ہی بچّوں کی طرف داری کر رہی ہیں۔ مشترک رسوئی گھر سے کھانے کی عمدہ چیزیں اپنے بچّوں کے لیے لے جا رہی ہیں۔ اسی طرح کے دوسرے الزامات۔ تنہائی میں وہ اپنے شوہروں سے باز پرس کرتیں کہ وہ اپنے بچّوں کو تحفظ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ بہت جلد دونوں بھائیوں میں بھی جھگڑے شروع ہو گئے۔ دونوں وکیل تھے اس لیے اُن کی لڑائی نے ایک انوکھا موڑ اختیار کیا۔ وہ بہت کم آپس میں بات چیت کرتے۔ اپنے ناموں کے پیاڈس پر تحریر لکھ کر ایک دوسرے کو بھجواتے۔ بزرگ ہونے کے ناتے میری دادی اِن چٹھیوں کو ایک دوسرے کو پہنچاتی۔ اس کام سے وہ بیزار نظر آتی کیونکہ اسے جیٹھو موشائی کے بازو کرسی کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا۔ ان کے سامنے اُن تحریروں کو وہ بار بار پڑھتا۔ یہاں تک کہ غصّے میں اُس کی پیشانی کی رگیں تن جاتیں۔

وہ زمانہ بچّوں کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ ان کی مائیں کمروں کے دروازے بند کر کے سرگوشیوں میں لڑائیاں کرتیں یا پھر اپنے بستروں میں پڑی روتی رہتیں۔ بچّے چھپ چھپ کر انھیں سنتے رہتے۔ کزنس کو آپس میں کھیلنا ہوتا تو وہ اسے راز میں رکھتے۔ وہ ڈرتے کہ کہیں اُن کے ماں باپ انھیں ایک ساتھ دیکھ نہ لیں۔

بہت جلد ایک وقت آیا کہ گھر کی تقسیم کے لیے انھیں لکڑی کے پارٹیشن کی کئی دیواریں بنانی پڑیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن اس طرح کی دیوار بنانا بھی کوئی آسان کام نہ

تھا اس لیے کہ دونوں بھائی رتی رتی حصے کے طلبگار تھے۔ رتی برابر کوئی چیز دوسرے کے حق میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب دیوار بن گئی تو سارے دروازے بھی بند ہو گئے کسی کا گزر اِدھر ہو سکتا نہ اُدھر۔ بیت الخلا کا کموڈ بھی آدھا اِدھر آدھا اُدھر ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنے باپ کے نام کی تختی بھی بانٹ لی۔ پہلے سفید باریک لکیر اُس پر کھینچی گئی پھر دونوں نے اپنے اپنے نام آدھی آدھی پلیٹ پر لکھوا لیے۔ مجبوراً اتنے چھوٹے حروف لکھے گئے کہ انھیں پڑھنا مشکل ہو گیا۔

یہ سب حماقت کی مقدمہ بازی کا نتیجہ تھا۔

مکان کی تقسیم کی ضد اُس وقت ہوئی جب آپسی جھگڑے انتہا کو پہنچ چکے تھے لیکن جب تقسیم ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے حصے میں منتقل ہو گئے تو انھیں وہ سکون نہ حاصل ہوا جس کی انھیں تلاش تھی۔ بلکہ ایک پُر اسرار خاموشی چھا گئی۔ پہلا سا ماحول پلٹ کر نہ آ سکتا تھا۔ زندگی کروٹ لے چکی تھی۔ مایا دیبی سے زیادہ میری دادی کو تکلیف پہنچی اس لیے کہ پرانی اچھی باتیں اُسی کو زیادہ یاد تھیں۔ اکثر وہ اپنے کزنس کی طرف دیکھتی اور ٹہل جاتی لیکن تلخی دونوں طرف اتنی بڑھی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

باقی تمام زندگی جب بھی میری دادی کسی سے سنتی کہ وہ بھائیوں کی طرح رہتے ہیں تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔

کیا مطلب ؟ وہ عجلت سے پوچھتی۔ اس کا مطلب تم لوگ دوست تو نہیں ؟ جہاں تک خود اُس کا تعلق تھا وہ اپنی ابتدائی زندگی ہی میں اس تلخی سے واقف ہو چکی تھی۔ اسی لیے اُس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ میرے باپ کے لیے ایک دوسرا بھائی پیدا کرنے کا خطرہ مول لیتی۔

تاہم وہ تمام عورتیں میری دادی کی ماں اور اس کی آنٹی جن کی عمریں مسلسل لڑائیوں کی وجہ کم ہو گئیں تھیں جب ان کی بیٹیوں کی شادی بیاہ کی بات آتی تو وہ خاموش ہی خاموش آپس میں سمجھوتہ کر لیتیں۔ مثال ہے کہ مایا دیبی اور صاحب کی شادی میں اُن کی آنٹی نے مرکزی رول ادا کیا۔ سب سے پہلے اُسی کو اس کی اطلاع تھی۔ بزرگ شخص مسٹر جسٹس دتا چودھری اپنے بیٹے (اُس وقت کوئی اٹھارہ سال کے ہوں گے ہ) کے ساتھ ڈھاکہ کے دورے پر آنے کی

اطلاع اُسی کو بھی۔ خود اس کی لڑکیوں کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اب اس نے کوشش کی کہ جج بڑے میاں مایا دیبی کے بارے میں واقف ہو جائیں (شہر میں ان دنوں اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے) اس کے بعد کے مرحلے آسان تھے۔ زائچہ اور دیگر حالات بھی موافقت میں تھے۔ فوراً رشتہ طے کر لیا گیا اور صرف چھ ماہ کے اندر اندر مایا دیبی کی شادی کر دی گئی۔ وداعی کا وقت آیا تو اس کی ماں نے تاکید کی کہ کلکتہ پہنچ کر دلہن اپنی آنٹی کے لیے آدھی درجن ساڑیاں بھیجنا نہ بھولے۔

لیکن ڈھاکہ میں رہتے ہوئے اُن لوگوں نے آپس میں بات کرنا پسند نہ کیا حالانکہ دونوں کے بیچ ایک دیوار ہی حائل تھی۔

جہاں تک میری دادی کا معاملہ ہے اس کی شادی تو مایا دیبی کی شادی سے چار سال پہلے ہی ہو چکی تھی۔ میرے دادا برما کے ریلوے ڈپارٹمنٹ میں انجینئر تھے۔ شادی کے بارہ سال تک دادی کو ایسی ایسی کالونیاں نصیب ہوئیں کہ ان کے نام پرستانوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ جیسے مول مین، منڈالائے۔ اس کے بعد کی زندگی کی جو باتیں اسے یاد رہ سکیں وہ تھیں دواخانے، ریلوے اسٹیشنوں کے نام اور بنگالی سوسائٹیاں۔ کوئی دوسری باتیں اس کے یاد رکھنے کے لائق ہی نہ تھیں۔

میرے باپ ۱۹۲۵ء میں منڈالائے کے مقام پر پیدا ہوئے۔ میری دادی ہر سال اُنھیں ڈھاکہ لے آتی کہ چند ماہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارے۔ ان کے حصّے کا مکان خالی خالی سا تھا۔ اس لیے کہ دادی کے کزنس (دو لڑکے اور ایک لڑکی) برِ صغیر میں اِدھر اُدھر منتقل ہو گئے تھے۔ مایا دیبی کی شادی کے بعد جب وہ کلکتے میں رہنے کے لیے گئی تو اس کے صرف چار بزرگ۔ انکل، آنٹی اور ماں باپ ہی اس مکان میں رہتے تھے۔ اب لڑائی جھگڑوں کی گنجائش نہ تھی تاہم تلخ یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ ماضی کو بھلانے کے لیے جو کچھ بن پڑا میری دادی نے کیا لیکن طویل عرصے کی پڑی ہوئی عادتیں بدل نہ سکی تھیں۔ انھیں دیوار پسند آنے لگی تھی۔ وہ اُن کی زندگی کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔

میرے باپ جب چھ سال کے ہوئے تو میری دادی کے ماں باپ دونوں چند ماہ کے وقفہ

سے انتقال کر گئے۔ اس کے بعد میری دادی صرف دو دفعہ ڈھاکہ گئی یہ جاننے کے لیے کہ جو گھر ورثہ میں اسے اور مایا دیبی کو ملے وہ جوں کے توں ہیں کہ نہیں۔ دونوں بار وہ اپنے انکل اور آنٹی سے ملنے کے لیے دیوار کے اس پار گئی لیکن وہاں تو صرف دکھ بھری یادیں تھیں۔ دونوں بار وہ ڈھاکہ میں ایک دن سے زیادہ ٹھہر نہ سکی۔

سن ۱۹۳۵ء میں میرے دادا ایک کلورٹ کی تعمیر کی نگرانی پر تھے جو اراکن پہاڑی پر بنایا جارہا تھا۔ وہاں انھیں سردی لگ گئی اور وہ نمونیہ کے شکار ہو گئے۔ منڈالائے لانے سے قبل ہی وہ انتقال کر گئے۔

جب وہ مرے تو میری دادی کی عمر بتیس سال کی تھی۔ انھوں نے کوئی پیسہ نہیں بچایا تھا۔ اس نے پہلے کوئی کام بھی نہیں کیا تھا۔ اسی لیے اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ کسی طرح اپنے بیٹے کو اسکول اور کالج میں شریک کرائے گی۔ خوش قسمتی سے اس کے پاس گریجویٹ کی وہ ڈگری محفوظ تھی جو اس نے تاریخ کے مضمون میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ریلوے کے ایک ہمدرد آفیسر نے کلکتے کے ایک اسکول میں اسے ملازمت دلوانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس اسکول میں اس نے بعد کے ستائیس سال گزارے۔

اگلے چند برسوں میں اسے ڈھاکہ جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اسی دوران سن ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا۔ ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا دارالخلافہ بن گیا۔ اس کے بعد وہاں جانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ دوبارہ اسے اس کی آنٹی اور جیٹھو موشائی کی کوئی خبر نہ ملی۔

اس کے بعد کئی برسوں تک بھوانی پور کے علاقے میں ایک ہی کمرے کے کرایہ کے مکان میں رہتے ہوئے دادی نے اپنی ڈھاکہ کی یادیں تازہ کیں ___ وہ پرانا مکان، ماں باپ، جیٹھو موشائی۔ اور وہ ساری باتیں جن سے زندگی کا زرین زمانہ وابستہ ہوتا ہے۔ خود اس کا اپنا بچپن۔

لیکن کیا تم جانتے ہو۔ دادی نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے اور ہونٹوں پہ نیم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ڈھاکہ کے اس پورے دور میں وہی ایک بات تھی جس کا مجھے ہمیشہ افسوس ہے۔

وہ کیا بات تھی۔ میں نے پوچھا۔

وہ پھر مسکرائی۔ یہی کہ مجھے وہاں کی اونچ نیچ کو سمجھنے کا موقع نہ ملا۔

وہ کیا اونچ نیچ تھی۔ میں نے کہا۔

اس نے ہنسنا شروع کیا۔

جب مکان کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس نے کہا۔ تو مایا چھوٹی بچی تھی۔ اُسے گھر کا دوسرا حصّہ بالکل یاد نہ رہا۔ اکثر جب وہ سو نہ پاتی تو میں اُسے ڈرانے کے لیے مکان کے دوسرے حصّے کی کہانیاں گھڑتی۔ وہاں ہر معاملے میں اُلٹ پلٹ ہے — میں اُس سے کہا کرتی۔ کھانا شروع کرتے وقت وہ لوگ پہلے میٹھا کھاتے ہیں اور پھر کھانا ختم کرنے سے پہلے دال پیتے ہیں۔ اُن کی کتابیں اُلٹی ہیں پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔ اگلے کا پچھلا اور پچھلے کا اگلا۔ وہ اپنے بستروں کے نیچے سوتے ہیں اور چادروں میں کھانا کھاتے ہیں۔ وہ جھاڑوؤں سے پکاتے اور ڈوئیوں سے جھاڑو دیتے ہیں۔ وہ اپنی چھتریوں سے لکھتے ہیں اور پنسل کو لے کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ مایا ان کہانیوں کو پسند کرنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے ہر روز ایک نئی کہانی گھڑنی پڑتی تاکہ اُسے نیند آئے۔ ایک رات میں نے اُسے ایک واقعہ سنایا۔ جیٹھ موشائی کے پینے کے لیے ایک کپ میں چائے لائی گئی۔ اُسے غصّہ آیا۔ حلق پھاڑ کر وہ چیخا۔ تم نے اس طرح میرے لیے چائے کیوں لائی۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ چائے کو بکٹ میں بھر کر پینا چاہیے۔ دوسری رات میں نے ایک اور کہانی گھڑی۔ ایک دن جیٹھ موشائی اپنے ایک کزن پر غصّہ کیا کہ وہ اُس دن رسوئی گھر میں نہانا بھول گیا۔ ایسی ہی قسم کی بکواس۔ اور جب میں کہانی تمام کرتی تو اپنا چہرہ خوفناک بنا کر کہتی کہ اگر تم فوراً سوؤ گی نہیں تو میں تمہیں دیوار کے اوپر سے اُدھر صحن میں پھینک دوں گی۔ تب تم بھی الٹی پلٹی ہو جاؤ گی۔ مایا کے لیے یہ دھمکی کام کر جاتی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سو جاتی۔ لیکن تمہیں ایک حیرتناک بات بتاتی ہوں کہ جیسے جیسے ہماری عمریں بڑھتی گئیں ہم ان کہانیوں پر یقین کرنے لگے۔ جب ہم خاصے بڑے ہو گئے اور اسکول جانے لگے تو ہم ان کے مکان کے سامنے والے باغیچے میں بیٹھ جاتے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگتے یہ جاننے کے لیے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اب دوپہر کا وقت ہے۔ مایا کہا کرتی۔ وہ لوگ ناشتہ کر رہے

ہوں گے ۔یا شاید ایسا ہی کوئی فضول کام ۔ تب ہم ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے اور ایک دوسرے کی گردنیں پکڑ کر جھولنے لگتے ۔ لیکن تمھیں بتا دوں کہ کبھی کبھی جب ہمارے ماں باپ ہم سے ناراض رہتے یا ہم لوگوں کو کوئی بات اچھی نہ لگتی تو ہم وہیں بیٹھے رہتے اور اُس مکان کی طرف گھورنے لگتے ۔ اُس زمانے میں وہی جگہ ہمیں اچھی لگتی اور ہم اُسی میں کھو جانا چاہتے ۔

بہت جلد ہمارے کلکتے کے سرما کا مختصر موسم آیا ۔ اس سہانے موسم میں وہاں کی جھیلیں بہت خوبصورت ہوتیں ۔ شام میں جب کرکٹ کھیلنے کے لیے باہر نکلتا تو میری دادی بھی میرے ساتھ ہوتی ۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ گیٹ سے باہر ایک بار نکلنے کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر خود کسی بھی طرف نکل جاتی ۔ لیکن کبھی کبھی جب میں فیلڈنگ کرتا ہوا مختلف پوزیشن میں کھڑا ہو کر دیکھتا تو دور سے وہ مجھے جھیل کے کنارے ایک سفید پتلے کی طرح نظر آتی ۔ کبھی اکیلی تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی اور کبھی اپنی ہم عمر چہل قدمی کرنے والوں سے باتیں کرتی ہوئی ۔ اُس کو چہل قدمی کرتا ہوا دیکھ کر میرے ماں باپ بہت خوش ہو جاتے ۔ کہتے کہ اب دادی کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اُس کا دل اپنے ہم عمر لوگوں میں لگ گیا ہے ۔ تھوڑے دنوں میں ہمارا کرکٹ کھیلنا ختم ہو گیا ۔ لیکن دادی دیر تک پارک میں بیٹھی رہتی ۔ کبھی کبھی گھر لوٹتے ہوئے مجھے اس کی تلاش میں جانا پڑتا ۔ وہ جھیل کے کنارے کسی بڑے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھی کسی نئے ملاقاتی سے باتیں کرتی ہوتی ۔

شام کے کھانے پر میرے ماں باپ کو مذاق سوجھتا ۔ وہ دادی سے پوچھتے کہ شام جھیل کے کنارے ان لوگوں سے کس موضوع پر باتیں ہوئیں ۔ کیا انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ یہی ، چین کے ساتھ جنگ کے بارے میں ۔

اوہ ! تم لوگوں کو حال کی ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ میری دادی جواب دیا کرتی ۔ ہم لوگ ماضی کی باتیں کرتے رہتے ہیں ۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ پارک میں آنے والوں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو تقسیم ملک سے قبل یا اُس کے دوران مشرق سے سرحد پار کر کے آئے تھے۔ بہت سے لوگ اسی طرح مقیم ہو گئے تھے جیسے میری دادی کلکتے کے اس علاقے میں مقیم ہو گئی تھی۔ علاقہ پس ماندہ ہی تھا لہٰذا یہ کوئی خاص بات نہیں تھی کہ میری دادی جب بھی جھیل پر جاتی تو انھیں لوگوں کے ساتھ مل بیٹھتی جنھیں وہ ڈھاکہ کے زمانے سے جانتی تھی۔

اُسی زمانے میں ایک شام میرے والد آفس کی کسی میٹنگ سے تھک تھکا کر گھر لوٹے اس قدر تھک کر آنے کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں کوئی نہ کوئی عجیب و غریب واردات ہو جایا کرتی۔ مجھے بعد میں اس بات کا احساس ہوا کہ میرے ماں باپ ایسے لمحوں کی تلاش میں ہوتے۔ باپ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ تھکے ہارے گھر لوٹتے تو ان کا خاص خیال رکھا جاتا۔ آفس کی بندھی ٹکی زندگی سے نجات پاکر وہ بہت خوش ہوتے۔ میری ماں کے لیے گھر کے کاموں میں چمتکار دکھانے کے جواز پیدا ہو جاتے۔ اُس کی وہ صلاحیت عود کر آتی کہ گھر میں صفائی بھی رہے اور سکون بھی۔ موسیقی کی سماعت کی لذت کا سماں۔ جیسے کوئی میوزک ماسٹر اپنے تمام سازندوں کے تال میل جوڑے رکھتا ہے۔ کئی سازوں سے نکلتی ہوئی موسیقی کی ایک مسحور کن آواز۔ خاموشی کا ایک۔ نپا تلا مختصر وقفہ۔

کار سے اترتے ہوئے دیکھ کر ہی میری ماں میرے باپ کے چہرے پر نمودار کہانیوں کو پڑھ لیتی۔ پہلے تو وہ اسے اوپر کی منزل میں لے جاتی۔ پھر خود نیچے آکر گھر کے کام کا جائزہ لیتی۔ باورچی خانے میں نوکروں کو ٹرانسسٹر کا سوئچ آف کرنے کی ہدایت کرتی۔ سڑک کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکیوں کو چپکے سے بند کر دیتی۔ مجھے تاکید ہوتی کہ میں اپنی کیپ گن سے کھیلوں۔ گھر پر چاروں طرف خاموشی چھا جاتی تو وہ پھر اوپر جاتی۔ ایک صاف ستھرا تولیہ ہاتھ میں تھما کر اسے حمام میں بھیجتی۔ وہ نہا رہے ہوتے اور میری ماں باورچی خانے پہنچتی۔ باپ کی پسندیدہ چائے گرم گرم میٹھی میٹھی اور زیادہ دودھ کی مقدار والی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچتی جہاں سے باغیچے کا منظر دکھائی دیتا۔ باپ کی آرام کرسی کے بازو میز پر چائے رکھ دیتی وہ نہا دھو کر باہر آجاتے اور چائے پینے لگتے تو صبح سے شام تک کی گھر کی رام کہانی انھیں سناتی۔

ایسی ہی ایک شام میری دادی نے مداخلت کی۔ وہ اپنی ملاقات کا واقعہ سنانے پر تلی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ آج پارک میں کس سے ملاقات ہوئی تھی۔

میری ماں اُس بے وقت مداخلت سے خوش نہیں ہوئی۔ اس نے کوشش کی کہ یہ باتیں شام کے کھانے تک ملتوی ہو جائیں تو بہتر ہے لیکن میری دادی رکنے والی کب تھی۔

میری ملاقات مینا دی سے ہوئی۔ سانس روکے بغیر اس نے کہا۔ تم اُسے نہیں جانتے اُس کا خاندان ڈھاکہ میں ہمارے گھر کے پاس کی گلی میں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ دنیا بھر کی باتیں کرتی ہے۔ اسکول کے زمانے ہی سے وہ ایسی ہے۔ آج ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کئی برسوں بعد آج اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملتے ہی اچانک اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کہنے لگی۔ کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا کزن، جبیتھ موشائی کا ایک لڑکا یہیں کلکتے میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو بیہیں گاریا میں۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ خود وہ تو ہر شخص کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتی۔ ہم ایک دوسرے سے ربط کھو چکے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہا۔ وہ خود کیسے جانتی ہے۔ اُس نے کہا کہ اُس کی نوکرانی نے عرصہ قبل اس کا ذکر کیا تھا۔ شاید ایک سال قبل۔ چونکہ مینا دی کی بات تھی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کچھ اور سوالات ضروری تھے۔ میں ٹھیک سے نتیجے پر پہنچ گئی کہ یہ وہی ہے۔ میرا کزن جبیتھ موشائی کا لڑکا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اُسے ہم سب لوگوں کی اچھی واقفیت ہے۔ اُس نے ٹھیک پتہ معلوم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر میں آسانی سے اُس کے پاس جا سکوں گی۔

ایک ہی سانس میں اس نے یہ ساری باتیں کہیں۔ پھر ہماری طرف دیکھنے لگی۔

میرے باپ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ تاہم اُس نے چپکے سے کہا۔ اتنے سال گزر چکے ہیں کہ شاید وہ ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں۔

میری دادی ناراض ہو کر کہنے لگی۔ یہ بات اہم نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے کہ نہیں۔ آخر ایک ہی خون تو ہے۔ ایک ہی بڑی پسلی کے۔ اب اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ہم اپنے اختلافات اور ساری تلخیوں کو بھول جائیں گے۔

پھر وہ اپنے مخصوص لہجے میں جس کے خلاف کوئی بات نہ کر سکتا تھا، کہنے لگی۔ یہ آواز تو ہم نے کئی دنوں سے سنی نہیں ہے۔ اُس نے میرے باپ سے کہا۔ اس اتوار کو کار تیار رکھنا نہ بھولو۔ میناوی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی نوکرانی کو یہاں بھیجے گی۔ وہ ہماری رہبری کرے گی۔

یہ سُن کر حیرت سے میری ماں کا منہ کھل گیا۔ اُس کی آواز نکلی ہی تھی کہ میرے باپ نے سر ہلادیا اور وہاں کردی۔ ماں چپ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

یہ بات نہیں کہ میری ماں میری دادی کی بات رد کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ خود بھی وہی کرتی جو میری دادی کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ شاید اس کام میں عجلت ہی دکھاتی۔ اس کے پاس رشتہ داروں اور خاندان والوں کی اہمیت مرکزی ہے۔ یہی مفہوم اہم ہے اور اسی پر قدروں کی بنیاد ہے۔ اس کے برخلاف میری دادی نے کبھی ایسے خیالات کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔ اس کی قدروں کی بنیاد تو ایک اسکول مسٹرس بننے ہی میں تھی۔ اس میں وسعت بھی تھی اور انفرادیت بھی۔ بعض باتوں کو چھوڑ کر وہ اپنے رشتہ داروں سے بیزار ہی رہتی۔ وہ تو ایک طرح سے ایک دوسرے پر بار بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شک وشبہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ سوچتی رہتی۔ کبھی اُن کے بارے میں بات کرتی تو کہتی کہ اُس انکل نے ضرور ہماری ہنسی اُڑائی تھی لیکن اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ بُرے دنوں میں اس کا حال نہ جانے کیا ہو۔ وہ خود تو بھول گئی کہ اپنے بیجا غرور میں رشتے ناتوں کو توڑ رکھا تھا اور کسی سے کوئی مدد لینے سے انکار کر چکی تھی۔ اُس کی سگی بہن مایادیبی سے بھی اُس نے کوئی مدد نہیں لی تھی۔ اس رویّے کی وجہ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ آگے بڑھ کر اس کی مدد کرتے۔ خودداری میں کبھی وہ سادگی نہیں آئی کہ کسی سے مدد مانگتی۔ یہ غرور اس کی رگ رگ میں سما گیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک خیالی دنیا بنالی تھی اور سوچتی رہی تھی کہ اس کے سرمایہ دار رشتہ داروں نے اُس کے خلاف ایک ہزیمت کی دیوار کھڑی کردی ہے۔

یہ فطری بات تھی کہ خاندان والوں کے بارے میں اچانک اس ہمدردی پر میری ماں کو حیرت ہوئی۔ رشتہ داروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے کسی نے سنا ہی نہ تھا۔ مایادیبی بھی نہیں جس سے وہ پیار کرتی تھی۔ دادی کے ماں باپ تو اس شخص سے دنیا بھر کی نفرت

کرتے تھے جس کی اولاد کے بارے میں اب دادی کہہ رہی تھی کہ اس کی آواز کئی دنوں سے سنی نہیں ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس کے سر میں کیا سودا سمایا ہے۔ بعد میں میری ماں نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ کزن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چکر تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔

توقع کے مطابق اتوار کو موٹر آگئی۔ وہ عورت بھی آئی جو دادی کے کزن کے گھر تک ہماری رہبری کرنے والی تھی۔ ادھیڑ عمر کی وہ ایک ناٹی عورت تھی۔ گول گول چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں۔

کیا نام ہے تمہارا؟ بے دلی سے اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے میری دادی نے پوچھا۔

مرن موئی۔ پان کا بیڑہ ایک کلّے سے دوسرے کلّے کی طرف کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

اوہ! مرن موئی۔ یہی نا۔ میری دادی نے اپنی ٹھوڑی کو آگے کرتے ہوئے اس کی نقل کی وہ ان نوکرانیوں سے ایسا ہی طنز برتتی جن کے نام ان کی حیثیت سے بڑے ہوتے۔

لیکن میرے باپ نے جلدی سے مداخلت کرتے ہوئے مرن موئی سے دریافت کیا کہ وہ ٹھیک ہے اسی شخص کے بارے میں جانتی ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ قریب ہو کر بلند آواز میں اس نے نام دہرایا۔

مرن موئی نے اپنا سر ہلایا۔ وہ آہستہ آہستہ پان چبا رہی تھی۔ اجڈ نوکھالی انداز میں اس نے کہا۔ ہاں وہی ہے۔ آسے ندھو بالو کہا کرتے تھے۔ وہ شونا ریلوے اسٹیشن پر جس کے قریب میرا بھائی رہتا تھا۔ ٹکٹ کلرک تھا۔ اس کے وظیفہ پر علاحدہ ہونے پر ہم لوگ گاریا منتقل ہوگئے۔

وہ رکی اور دیر تک میرے باپ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کہا۔ ہاں، آپ اس سے بھی واقف ہوجائیں کہ وہ پچھلے سال سینے میں درد کی وجہ سے مر گیا۔

میری دادی نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی سنبھالتے ہوئے اس میں بیٹھ گئی۔ یہ بات واضح تھی کہ اُسے غم سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ رہی اور اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانک لیا۔ پھر وہ اٹھی۔ اس نے اعلان کیا۔ کوئی بات نہیں۔ ہم کسی طرح جائیں گے

شاید اس کی بیوی خاندان کے دوسرے افراد کے بارے میں نہیں پتہ دے۔

نہیں ماں سنو۔ میرا باپ کہنے لگا۔ لیکن دادی نے فوراً اسے روکا۔ ہاں میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ ہم لوگوں کو لے کر آگے بڑھتے ہوئے اُس نے کہا۔ چلو چلیں۔

تب میرے باپ نے بادلِ ناخواستہ موٹر اسٹارٹ   ہم سب اُس کے اندر بیٹھ گئے۔

ہم لوگ گول پارک پر سدرن ایونیو کی طرف مڑے تو ڈھکوریا کی ریلوے کراسنگ کو بند پایا۔ گیٹ کے کھلنے تک کوئی نصف گھنٹہ ہم لوگوں کو وہاں ٹھہرے رہنا پڑا۔ پھر ہماری کار جودھپور کلب کے راستے سے ہوتی ہوئی جادھوپور یونیورسٹی کیمپس روڈ پر دوڑنے لگی لیکن بہت جلد ہمیں اپنی رفتار کم کرنی پڑی کیونکہ راستہ تنگ ہونے کے علاوہ ٹرافک بھی زیادہ تھی۔ روڈ کے دونوں طرف جھونپڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ بعض کے اطراف بمبو کی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں اور بعض کے چھت لوہے کے پائپ اور ٹن کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں سمنٹ کے مکانات تھے۔ کئی مکان ابھی نامکمل حالت میں تھے۔

میری دادی کار کے پٹ سے جھانکتی ہوئی تعجب سے کہنے لگی۔ دس سال قبل جب میں یہاں تھی تو سڑک کے دونوں جانب خوبصورت کھیت تھے۔ یہاں کلکتہ کا امیر طبقہ باغات و مکانات بنایا کرتا تھا۔ اب یہاں دیکھو چمگادڑ کے گھونسلوں کی غلاظت ہے۔ مہاجروں کی وجہ سے بیا... کی طرح آکر پڑے ہیں۔

جیسا کہ ہم لوگوں نے کیا ہے۔ میرے باپ نے دادی کو اکسایا۔

ہم لوگ مہاجر نہیں ہیں۔ میری دادی نے فقرہ کسا۔ کیونکہ ہم لوگ نہیں آئے۔ تقسیم سے بہت پہلے ہی ہم یہاں آچکے تھے۔

میری موسی نے اچانک کھڑکی سے اپنا سر نکالا اور سمنٹ کی دو منزلہ عمارت کی طرف اشارہ ... یہ رہی عمارت۔ یہیں تو وہ رہتے ہیں۔

میرے باپ نے پہلے کار کی رفتار آہستہ کی۔ پھر اُسے روکا۔ ایک ایک انچ آگے بڑھتے ہوئے کار رکی۔ انھوں نے کار کا پٹ کھول کر اُترنا چاہا لیکن تنگ سڑک کی دونوں جانب جھونپڑیوں کو دیکھ کر لیا کہ وہ کار ہی میں بیٹھے رہیں گے۔ وہ سن چکے تھے کہ ایسے مقامات پر جیبیں

کو چھوڑ کر کار کا سارا سامان غائب کر دیا جاتا ہے۔

میری طرف مڑ کر وہ کہنے لگے۔ تم میرے ساتھ یہیں پر ٹھہر جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں اُوپر جاؤ۔

اُن کی آواز میں بلا کی سختی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لانے پر اپنے آپ سے خفا تھے۔ لیکن میں اوپر جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ لہٰذا میں ایسے وقت وہاں چپکے سے نکل گیا جب وہ میری طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔

مرن موئی ہم لوگوں کو لے کر عمارت کی طرف چلی۔ دو تاریک مقامات سے گزرنا پڑا ایسے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ہمیں کئی جگہ رُکنا پڑا۔ تیز دوڑتے اور ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے بچے۔ اُن کا شور۔ ہنسی مذاق کی آوازیں سیڑھیوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کر رہی تھیں۔ گرد کی وجہ سے سیڑھیوں پر پھسلن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دیواریں لکڑی کے دھوئیں سے کالی ہو گئی تھیں۔ برقی تار جگہ جگہ ڈھیلے پڑے تھے اور ان میں سے انسولیٹنگ ٹیپ کے کھل جانے کی وجہ سے تانبا جھانک رہا تھا۔ پوری عمارت ایک لمبی ماچس باکس کی ڈبیا کی طرح تھی۔ بہت بڑی بھی نہیں۔ کاریڈار اس جگہ جگہ سے تقسیم کیے گئے تھے۔ اس سے ثابت تھا کہ اس میں درجنوں خاندان بستے ہیں۔

مرن موئی ہم لوگوں کو لے کر دوسری منزل کے ایک دروازے پر رکی اور آواز دی۔ اندر کوئی ہے؟ اندر سے کسی کے چلنے کی آواز آئی اور تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔

میری ماں اور میری دادی نے جب اس عورت کو دیکھا جس نے دروازہ کھولا تو انھیں حیرت ہوئی۔ انھیں کسی خمیدہ کمر اور معمر آدمی کی توقع تھی۔ اس کا چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوگا۔ لیکن وہاں جو عورت ہمارے سامنے کھڑی تھی وہ صرف ذرا معمر تھی۔ گھنی بھنوؤں۔ کشادہ تھوڑی اور سیاہ بالوں والی۔ اتنی سیاہ کہ میری دادی نے بعد میں کہا کہ اس نے کوئی خاص ڈائی استعمال کی ہوگی۔

اس نے ہماری طرف تعجب سے دیکھا۔ مرن موئی کو پہچانتے ہوئے ہماری طرف سوالیہ نگاہوں سے۔

یہ لوگ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ ہرن موئی نے بلا تکلف کہا۔ میری دادی نے فوراً حامی بھری اور کہا کہ ہم لوگ رشتہ دار ہیں۔

وہ عورت بہت جلد جان گئی کہ ہم کون ہیں اور یہ کہ اُس کے مرحوم شوہر سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔ جب میں اپنی ماں کے اشارے پر اُس کے پیر چھونے کے لیے جھکا تو اُس نے مسکرا کر میری پیٹھ تھپکی۔ پھر اپنی شکن آلود ساڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بس ذرا ایک منٹ۔

یہ کہہ کر دروازہ بند کرتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ کوئی پانچ منٹ بعد اس نے دروازہ کھولا تو اُس کے چہرہ پر غازہ مَلا ہوا تھا اور اس نے سفید نیلان کی بھڑکتی ہوئی ساڑی پہنی تھی۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئی معذرت کرتے ہوئے کہ وہ بہت چھوٹا ہے اور وہاں کرسیاں بھی نہیں ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کسی بہتر فلیٹ میں منتقل ہونے والی ہے۔ ہم لوگ ایسے وقت پہنچے ہیں جب کہ وہ اپنا سامان پیک کر رہی ہے۔

کمرہ کافی تاریک تھا۔ دوپہر کا وقت ہونے کے باوجود بلب جلایا گیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک بڑی تصویر ایک طرف دیوار سے لٹکی تھی۔ اس کے نیچے دونوں کمروں کو ملا کر جو رسّی باندھی گئی تھی اُس پر چند ساڑھیاں سکھائی گئی تھیں اور میلے لہنگے اور بغیر دُھلے پاجامے اور انڈر ویر لٹکائے گئے تھے۔ میری ماں اور دادی دیوار سے لگے ہوئے بستر کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ ہماری رشتہ دار اُن کے بازو بیٹھ گئی اور ہرن موئی کو فرش پر ایک طرف اُکڑوں بیٹھنے کو کہا گیا۔

میرے بیٹھنے کے لیے وہاں جگہ نہ تھی۔ میں وہاں سے ورانڈے کی طرف کھسک گیا۔ ریلنگ سے ٹیک لگا کر میں نے اپنے پنجوں کے بل جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ کاریڈار کا رُخ دوسری طرف تھا۔ اس لیے میں روڈ کی جانب دیکھ نہ سکا۔ ہم جس عمارت میں تھے اُس کے عقب میں مکانات نہ تھے۔ زمین بڑی ناہموار تھی۔ کہیں جزیرے کی طرح اور کہیں گڑھے بنے ہوئے۔ جہاں زمین اٹھی ہوئی تھی اور جہاں جزیرہ نما تھا اُن پر کہیں کہیں جھونپڑیاں

بنائی گئی تھیں۔ اُن پر ٹن کی چھتیں تھیں۔ جہاں گڑھے تھے وہاں پانی جمع ہو گیا تھا۔ سیاہی اور کنجالی رنگ کی وجہ یہاں سے وہاں تک ایسا منظر تھا جیسے فرش پر قالین بچھا دیا گیا ہو۔ وہیں پر کنجال کو ہٹا کر لوگ اپنے بچّوں کی نہلائی دُھلائی کرتے تھے۔ اپنے کپڑے اور کھانے پکانے کے برتن بھی دھوتے تھے۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک فیکٹری چاروں طرف سے اونچی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھی۔ اس کی صرف طویل اور دندان نما اسٹیل کی چھت مجھے نظر آسکی۔ چمنی سے نکلتا ہوا گہرا سیاہ دھنواں ایسا ہی تھا جیسے گڑھوں میں جمع ہوا سیاہ پانی۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ساتھ کوئی گاڑھا سیال مادّہ نشیب میں گڑھوں کی طرف بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ بناتے ہوئے دیکھا کہ دور نشیب کی طرف بہت سے جسم حرکت میں ہیں۔ فاصلے کی وجہ وہ بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔ لیکن میں دیکھ سکتا تھا ان کے کاندھوں پر تھیلے لٹکے ہوئے ہیں۔ وہ اُس نشیبی علاقے سے کوئی چیز اُٹھا رہے تھے اور اپنے اپنے تھیلوں میں بھر رہے تھے۔ میں انھیں صرف اس وقت دیکھ سکا جب وہ حرکت میں تھے۔ اُس کے بعد وہ اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کی ہئیت میں گرگٹ کی طرح تبدیلی آگئی ہو کیونکہ ان کے جسم پر کی تمام چیزیں، ان کے کپڑے، ان کے تھیلے اُن کی جلد سب کا رنگ کھڑے پانی کے اندر کیچڑ کے رنگ کی طرح ہو گیا تھا۔

میری رشتہ دار نے مجھے ریلنگ سے لگا کھڑا جھانکتا ہوا دیکھ لیا۔ وہ دوڑ کر آئی۔ اس طرح مت جھانکو۔ وہ چیخی۔ وہاں بڑی گندگی ہے۔ پھر وہ مجھے اندر واپس لے آئی۔

میں اپنی مرضی سے وہاں گیا تھا۔ اسکول میں مجھے ایسی تربیت مل چکی تھی۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھے واپس لے جانا کتنا فضول ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنے گھر کی کھڑکی سے ایسا لینڈ اسکیپ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس طرح کا منظر ہمارے گھر میں بھی تھا۔ اسی میں میں بڑا ہوا۔ اسی لینڈ اسکیپ نے میری ماں کی آواز میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی امتحان کی تیاری میں لگاتی تو مجھے یاد دلاتی اور کہتی کہ اگر میں جی لگا کر محنت سے نہ پڑھوں تو میرا یہی انجام ہوگا کہ مجھے ایسے ہی دلدل میں گزارہ کرنا پڑے گا۔ ہماری طرح کے لوگوں کے پاس یہی تو ایک چارہ ہے کہ اگر ہم لوگوں نے اپنے دماغ کا ٹھیک سے استعمال

نہیں کیا تو ہمارا انجام ایسا ہی ہوگا۔ میں اچھی طرح جاننے لگ گیا کہ اگر میں امتحان میں ناکام ہو نار ہوں تو میرا حشر بھی اسی رشتہ دار کی طرح ہوگا جس کی زندگی اسی طرح کے سیاہ دلدل میں گزر رہی ہے۔ ایسا ہی لینڈ اسکیپ ایک دلدل کی طرح ہمارے مکانوں سے پالش زدہ فرشوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اسی دلدل نے تو ہماری رئیسانہ زندگی کی حماقتوں کو بڑھاوا دیا ہے۔

ہماری رشتہ دار نے چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی۔ پتلے ارد و روٹ کے بسکٹ جنھیں پھول کی شکل میں پلیٹ فارم میں سجایا گیا تھا۔

جب ہم لوگ چائے سپ کر رہے تھے تو اُس میں اور میری دادی میں لمبی باتیں ہوئیں۔ اس نے میری دادی سے کہا کہ اُس کا مرحوم شوہر مرنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے باپ کو ہندوستان منتقل کرے۔

تمہارا مطلب ہے کہ وہ ابھی بھی وہیں تھے۔ میری دادی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا۔ ہاں۔ ہاں وہ ابھی تک پرانے گھر ہی میں رہتے ہیں۔

اُس کے شوہر نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کو ڈھاکہ چلنے کی ترغیب دی کہ اپنے ضعیف باپ کو ہندوستان منتقل کر سکیں لیکن انھوں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ وہ ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک بنگلور میں، دوسرا مشرق وسطیٰ میں اور تیسرا خدا جانے کہاں ہے۔ اسی لیے اس کا شوہر اکیلا ہی ڈھاکہ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ لوگ اپنے باپ کو کلکتہ منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو اپنے حصے کا مکان بیچ کر کچھ پیسہ بنا لیا جائے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سارے مکان پر ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان مہاجروں کا قبضہ ہے۔ اکثر لوگ بہار اور یو پی کے آئے ہوئے تھے۔

میری دادی نے ایک سرد آہ بھری۔

ہمارا مکان۔ تو تمہارا مطلب ہے کہ ہمارے مکان پر مہاجروں نے قبضہ کر لیا ہے۔

ہاں۔ ہماری رشتہ دار نے کہا۔ یہی تو میں کہہ چکی ہوں۔ تقسیم کے بعد مکان خالی ہوگا۔ سوائے میرے سسر کے سب لوگ جا چکے تھے۔ لیکن وہ تو باہر والوں کو گھر میں داخل ہونے سے

روک بھی نہ پایا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ میرے شوہر نے ڈھاکہ پہنچتے ہی محسوس کر لیا کہ وہ اس مکان کو حاصل نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی کوئی عدالت اُن مہاجروں کو نکال نہیں سکتی تھی۔ بوڑھے آدمی نے اس پر دھیان بھی نہیں دیا۔ وہاں ایک خاندان تھا جو بڑے میاں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہی اس کے لیے کافی تھا۔ آسے امن وچین نصیب نہیں تھا لیکن اُسے اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

بے چارے بڑے میاں۔ بھرائی ہوئی آواز میں دادی نے کہا۔ سوچیں تو کسی غیر ملک میں مرنا کیسا لگتا ہے۔ وہ بھی بڑھاپے میں تنہا اور لاچار۔

اوہ۔ ابھی وہ مرے نہیں ہوں گے۔ ہماری رشتہ دار نے اونچی آواز میں کہا۔ کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا؟

کیا مطلب ہے تمہارا؟ میری دادی نے کہا۔ تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ ابھی بھی زندہ ہیں۔ نوّے سال سے اوپر کے ہوں گے۔

ہماری رشتہ دار مسکرائی اور پتلے اروٹ بسکٹ کو چبانے لگی۔ بڑے سلیقے کے ساتھ اپنا ہاتھ منہ پر رکھے ہوئے۔ پھر اُس نے کہا۔

گذشتہ ماہ تک تو وہ زندہ ہی تھے۔ دیکھو تو انھوں نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھی لکھا ہے لیکن یقیناً یہ اُن کے ہاتھ کا نہیں ہے۔ میرے شوہر کے گزر جانے کے بعد میں نے انھیں لکھا تھا۔ کوئی واضح پتہ نہیں تھا کیونکہ برسوں سے ہم نے اُن کے بارے میں کچھ سنا ہی نہ تھا۔ اس واقعے کو بھی کئی مہینے گزر گئے۔ جب اُن کا کوئی جواب نہ آیا تو ہم نے سوچا... لیکن تب ہی گذشتہ مہینے یہ پوسٹ کارڈ مجھے ملا۔

کسی ننھے بچے کی طرح اپنی ہتھیلی میں رکھے پوسٹ کارڈ کو میری دادی ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

وہ رہا اُن کا پتہ۔ وہ اپنے آپ بڑبڑائی۔ ۲۱/۱ جندرا بہار لین۔ یہ تو ابھی بھی وہی پتہ ہے۔ اپنی آنکھوں میں جاری آنسوؤں کو پوچھنے کے لیے دادی کو اپنا ہاتھ اونچا کرنا پڑا۔

میں اُن کا خط پہچانتی ہوں؛ اُس نے کہا۔ انھوں نے ہی لکھا ہے۔ وہ وہیں پر ہوں گے۔

لمبی سانس کھینچتے ہوئے اس نے پوسٹ کارڈ واپس کر دیا۔ پھر وہ اپنے پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ ہماری رشتہ دار کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب واپس ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ میرے باپ انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہماری رشتہ دار نے بڑی شائستگی سے ہمیں تھوڑی دیر اور رو کنے کی کوشش کی لیکن میری دادی نے مسکرا کر انکار کر دیا۔ تب وہ ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے نیچے آنا چاہتی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے میری ماں کو بازو سے تھاما اور وہ آپس میں کچھ کہتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے ملے۔ انھیں نیچے اترنے میں تھوڑی ہوئی۔ میرے باپ بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے انھوں نے ہماری رشتہ دار کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اسے ہمارے گھر آنے کی دعوت دی۔ جوں ہی ہماری کار آگے بڑھی میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سمنٹ کی چوکھٹ کے پاس کھڑی ہوئی اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی۔

سیڑھیوں کے پاس وہ تم سے کیا کہہ رہی تھی۔ دادی نے میری ماں سے پوچھا۔

میری ماں کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ اس نے وضاحت کی کہ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتی ہے حالانکہ ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔ وہ ٹھیک ٹھیک جانتی ہے کہ میرے باپ کیا کام کرتے ہیں اور ہم لوگ کہاں رہتے ہیں۔ اس نے اپنے لڑکے کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ وہ پچیس سال کی عمر کا ہے۔ اور اس نے میٹرک کامیاب کیا ہے۔ اسے کوئی نوکری نہیں ملی۔ وہ بگڑتا جا رہا ہے۔ دن بھر کچھ نہیں کرتا سوائے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گلیوں میں گھومنے کے۔ کیا میرے والد اسے کوئی نوکری دلا سکتے ہیں۔ وہ عاجزی کر رہی تھی۔ بے چاری — میری ماں نے اپنی بات ختم کی۔ ہمیں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔

کیوں ؟ دادی نے حوصلہ شکن جواب دیا جب میں ان حالات سے گزر رہی تھی تو کیا کسی نے میری مدد کی تھی ؟ ان کہانیوں پر مت جاؤ۔ ایک بار ان کا مطالبہ شروع ہو گیا تو پھر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ویسے لگتا ہے کہ وہ اپنے کاروبار خود اپنی طرح سے خوب نبھا سکتی ہے۔

میری ماں چپ ہو گئی۔ اس موضوع پر دادی سے بحث نہ کرنے ہی میں اس کی بھلائی تھی۔

مجھے اس عورت کی فکر نہیں۔ میری دادی نے اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مجھے ان
کی فکر ہے۔ بے چارے بوڑھے بڑے آدمی۔ اکیلے دوسرے ملک میں لاچار ۔ چاروں طرف سے۔۔
اُس نے اپنا جملہ پورا نہ کیا۔ دوبارہ جب اس نے بات شروع کی تو ہم لوگ گھر پہنچ چکے
تھے۔ اُس کی آواز میں نرمی تھی۔ خواب کی سی کیفیت۔

اب میری زندگی میں کرنے کے لیے ایک ہی اہم کام رہ گیا۔ اس نے کہا۔ اور وہ کام ہے۔
اس بوڑھے آدمی کو اپنے وطن لانے کا۔

وہ اپنے انکل کو دشمنوں کے نرغے سے بچا کر اپنے خوابوں کی دُنیا میں لانے کی بات کر رہی
تھی تو اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یہ وہی زمانہ تھا جب مئے کو تردیب کا چوتھا خط ملا تھا۔ کالج سے لوٹ کر جب اس نے دروازہ
کھولا تو گیس بِل کے ساتھ وہ خط اسے قالین پر پڑا ہوا ملا۔ اسٹامپس پر نظر پڑتے ہی اُس
نے فوراً پہچان لیا کہ وہ تردیب کا خط ہے۔ ایک بات جُدا تھی۔ خط ہمیشہ کی طرح ہلکا پھلکا
نہیں تھا۔ اکثر تو پوسٹ کارڈ ہوا کرتے۔ خط کا وزن بتا رہا تھا کہ وہ کئی صفحات پر پھیلا ہوا
ہے۔ اُسے کچھ عجیب سا لگا۔ بغیر کھولے وہ اُسے باورچی خانے میں لے گئی۔ گیس بِل کو اپنی ماں
کے حوالے کیا۔ مسز پرائس نے لفافہ دیکھ لیا۔ مئے کو بھی احساس ہو گیا کہ ماں نے اسے دیکھ لیا
ہے۔ تردیب کے دوبارہ خط لکھنے پر وہ بڑبڑائی۔ مسز پرائس نے یوں ہی سر ہلا دیا اور پھر
چائے بنانے لگ گئی۔

مئے نے نِک کو سامنے کے دروازے کی چابی گھماتے ہوئے سُن لیا اور وہ خط لے کر اپنے
کمرے میں بھاگی۔ صبح صبح برتنوں کی صفائی یا کسی ایسی ہی بات پر دونوں میں چخ پخ ہو گئی
تھی اور اب وہ دوبارہ اُس سے لڑ کر اپنے پر بار نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ شام میں اپنے کو

تازہ دم رکھنا چاہتی تھی۔ کلبرن کے ایک چرچ میں اپنی ایک دوست کے ساتھ مل کر اُسے ریہرسل کرنا تھا۔ اُس نے دروازہ زور سے بند کیا اور بستر پر گر پڑی۔ لفافے کے کنارے کو اپنے دانتوں سے کاٹا۔ خط اُس میں سے پھسل کر گر پڑا۔ اُس کے اندازے سے زیادہ طویل خط ملا۔

خط پڑھ چکی تو اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اپنی انگلیوں کو گال پر رکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ جل رہے ہیں۔ بخار کا عالم ہے۔ وہ اپنے بستر سے اُٹھی اور حمام خانے کی طرف دوڑی۔ آہستہ سے جیسے کوئی چوری چھپے کا کام ہو اُس نے حمام کا دروازہ کھولا اور اُس سے لگ کر لمبی گہری سانس لینے لگی۔

اُس نے لکھا تھا کہ مٹے کی تصویر کو اُس نے اپنے میز پر رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خط لکھتے وقت مٹے کی تصویر اس کے سامنے رہے۔ لیکن تصویر تو اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے۔ لکھنے کی بہت سی اور باتیں ہیں۔ جوں ہی تصویر پر نظر پڑتی ہے تو اسے لیمنگٹن روڈ اور ہیمپسٹڈ یاد آجاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان مقامات کی یاد کے ساتھ وہ اسے واضح طور پر دیکھتا رہتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اسی کے ساتھ ہے۔ باغیچے میں گیلاس کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا۔

پھر ستمبر کی وہ شام یاد آتی ہے۔ ایک خوبصورت دن گزر گیا تھا۔ دن بھر میں ایک ہی تو موقع تھا — اور وہ تھا دوپہر کا وقت۔ لیکن اب تو جھٹپٹے کا وقت ہے۔ ویسٹ اینڈ لین کی دوسری طرف مکانات کے پیچھے سورج ڈوب رہا ہے۔ اسے نمبر ۴۴ پر واپس جانا ہے۔ جلد ہی۔ لیکن ابھی نہیں۔ لہٰذا کیوں نہ وہ اتنے وقت میں وہاں اُس کونے تک جا کر اس مکان کو دیکھے جو ایک دن قبل بم کی زد میں آ گیا تھا۔

لیمنگٹن روڈ اور ویسٹ اینڈ لین کی طرف وہ سارے فلیٹس تھے۔ خاص طور پر وہ عمارت جو لیمنگٹن مینشن کہلاتی تھی۔ اسے وہ ہمیشہ پسند تھی۔ اس کا بالائی حصّہ مخروطی تھا اور اینٹ کا بنا ہوا۔ بیش رُخ بھی بہت خوبصورت تھا۔ لیکن عمارت کا بڑا حصّہ تباہ ہو چکا تھا۔ خاص کر اوپری حصّہ۔ اسی جگہ پر راست مار پڑی تھی۔ پہلی منزل پر وہ اُس کھڑکی کو دیکھ رہا تھا جو ہوا سے اِدھر اُدھر ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صرف ہنجس (Hinges) کے بل پر ٹکی ہوئی ہے۔ اب وہاں کوئی ملبہ نہیں تھا۔ سارا ملبہ اٹھا دیا گیا تھا۔

اب اسے نمبر ۴۴ پر واپس ہونا ہے۔ دیر ہو گئی تھی...

بائیں طرف دیکھنے کی تربیت کو بھول کر کسی جذبہ کے اثر میں اُس نے روڈ پار کیا۔ اُس کی سیدھی جانب سے ربر کے پہیوں کے گھسنے کی بہت ناگوار آواز سنائی دی۔ پھر مسلسل ہارن بجنے لگا۔ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب تک کہ وہ چبوترے پر محفوظ مقام دیکھ کر پہنچ نہ گیا تھا۔ چوڑا چکلا ایک شخص جس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اپنی چھوٹی سی موٹر کار سے اُترا اور مٹھی بھینچ کر اُس کی طرف آنے لگا۔

دیوار کی طرف جھک کر وہ سہارے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ گلی کی دوسری جانب سلسلہ وار دکانیں تھیں جو بند تھیں۔ اس طرف کی دیوار اونچی تھی — نہیں وہ دیوار نہیں بلکہ کسی بڑی عمارت کا حصہ تھا۔ سُرخ اینٹ کی بنی ہوئی اونچی اور طویل عمارت۔ کوئی جگہ بیٹھنے کی نہ تھی۔ کسی دروازے کا چوکھٹ بھی نہیں تھا۔ وہ اسی راستے سے واپس جانا چاہتا تھا۔ جس راستے سے آیا تھا۔ اس کی نظر دیوار میں ایک سیاہ دھبے پر پڑی۔ وہ گلی کے نکڑ پر تھا۔ وہاں سے ایک راستہ دکھائی دیتا تھا لیکن وہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔ ایک بڑی دراڑ جیسی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا بلا تھی۔ اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

جو کچھ اس نے سوچا تھا صحیح تھا۔ دیوار کا ایک حصہ گرا دیا گیا تھا۔ اُس میں مثلث نما ایک دراڑ پڑ گئی تھی۔ اندر کی طرف اندھیرا تھا۔ اور گرد و غبار کی بو آ رہی تھی۔ ایک اُچٹتی نظر اُس نے گلی کی طرف ڈالی اور اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے اندر اُتر گیا۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اُسے کوئی نہ کوئی اندر جاتے ہوئے دیکھ لیتا۔ لیکن یہ جگہ ہی ویسی تھی۔

وہ ایک بہت بڑے گودام جیسی عمارت کے اندر تھا۔ حیرانی میں وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اندر کیا ہے۔ تب اُس نے طویل قطاریں سیٹیں دیکھیں۔ ایک ہی رُخ پہ تھیں۔ فوراً اس نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک سنیما گھر ہے۔ خالی سیٹیں جیسے دراڑ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ باقی عمارت سامنے سے نظر آ رہی تھی۔ وہاں اسکرین لٹکا ہوا نظر آیا۔ وہیں تو بم گرا تھا۔ ایک حصے کو اُڑا دیا گیا تھا۔ پردہ کے قریب۔ وہ حادثہ کسی فلم کی کہانی کا

ایک حصّہ تھا۔ فرش کے ایک حصّے میں گہرا گڑھا بنا ہوا تھا۔ وہاں کرسیاں ایسی اوندھی پڑی تھیں لگتا تھا جیسے اس پر بیٹھے ہوئے لوگ ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہوں۔

مڑ کر دیکھا تو فرش کی گیلری پر نظر پڑی۔ وہ جوں کی توں تھی۔ اُسے کوئی دھکا نہیں لگا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس کی طرف بڑھا۔ جب بھی وہ فلم دیکھنے جاتا تو گیلری ہی میں بیٹھنا پسند کرتا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ اس ہال میں ایک گیلری تھی۔ بعض میں نہیں ہوتی۔ چند کرسیوں پر سے پھلانگ کر وہ آگے بڑھا۔ وہاں کوئی کوڑا کرکٹ نہ تھا۔ سب کے سب ہال کے کونوں میں جمع ہو گیا تھا۔

کرسیوں کے بیچ بنے ہوئے راستے سے گزر کر وہ ہال کی پچھلی جانب ایک دروازے پر رُکا۔ اُس نے کان لگا کر دوسری جانب سُننے کی کوشش کی۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو اس نے دروازے کو احتیاط سے دھکا دے کر کھولا۔ وہ لابی کی طرف نکلا۔ ٹکٹ گھر پورا محفوظ تھا۔ وہ واپس لوٹ کر چوکھٹ سے لگ گیا۔ ملگجی روشنی غائب ہو گئی۔ وہاں بھرپور اندھیرا تھا۔ دیوار کے سہارے اُسے ٹٹولنا پڑا تاکہ گیلری کی طرف سیڑھیوں کو تھاما جا سکے۔ وہ ذرا فاصلے پر تھیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے اپنا پاؤں سیڑھیوں پر رکھا پھر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے سیڑھیوں کا موڑ محسوس کیا۔ اس کے آگے مزید سیڑھیاں تھیں۔ اب وہ گیلری کے داخلے پر تھا اور دوبارہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ پردے کے پاس سوراخ کی وجہ روشنی اندر آ رہی تھی۔

گیلری کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اُس کے آگے نشیب تھا۔ سیٹوں پر اودے رنگ کا غلاف چمک رہا تھا۔ وہ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا اور اُس کے اندر سمانے کی کوشش کرنے لگا۔ سنیما کے ہال میں بیٹھ کر اس طرح مزے لیے جاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے گھٹنوں سے اپنی ناک کو مس کرتا اور کبھی پیچھے کی طرف جھکتا اور اوپر دیکھتا۔ یہی تو وہ کرتا تھا لیکن آج اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی نشست پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سنیما ہال میں اس طرح بیٹھ کر چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی روشنی کو دیکھتا ہوا وہ فرحت

حاصل کرنے لگا۔

وہ اُٹھا اور گیلری کے آخری کونے تک گیا۔ پیٹ کے بل لیٹ کر زنگ زدہ لوہے کے کٹہرے کے سوراخوں میں جھانکنے لگا۔ اوندھی پڑی ہوئی کرسیاں کچھ ایسی عجیب لگ رہی تھیں جیسے سورج کی طرف جھک رہی ہوں۔ اُس نے اپنا سر پلٹایا تو دیوار کے سوراخ سے اُسے وہ فٹ پاتھ نظر آیا جہاں سے وہ اندر آیا تھا۔

روڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اور دانتوں سے سیٹی بجاتے ہوئے وہ وہاں لیٹا تھا کہ دیوار کے سوراخ میں سے ایک سایہ نظر آیا جو وہاں سے گزر رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے سیٹی بجانا روک دیا اور چوکس ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کا جی بھاگ جانے کو چاہا۔ اس نے دیکھا کہ اودے اسکرٹ میں ایک عورت وہاں سے گزری۔ لمحہ بھر بعد وہ واپس ہوئی اور کمان دالی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جھنجھلاتی ہوئی اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں کی سمت پیچھا کرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ وہ ایک سفید اسپانیل کُتّے کو پکڑی ہوئی ہے۔ کتا فٹ پاتھ پر غلاظت کرنے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ عورت کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اُس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک سگریٹ نکالا اور جلایا۔ بہت زور سے اُس کا کش کھینچا۔ اُس کے گال چپک گئے۔ پھر اپنا سر پیچھے کرتے ہوئے بڑی تمیز کے ساتھ اُس نے اپنے نتھنوں سے دھنواں چھوڑا۔

وہ جب دوبارہ سگریٹ کا کش کھینچ رہی تھی تو اُسے کسی دوسرے شخص کے پاؤں نظر آئے۔ وہ کسی مرد کے پاؤں تھے۔ پہلے تو اُسے لگا کہ فٹ پاتھ پر سڑک کی دوسری جانب وہ پاؤں کسی کمانی دار دیوار سے لٹکے ہیں کسی پینٹنگ میں بادلوں کی طرح۔ وہ پاؤں چند قدم آگے چل کر رک گئے۔ ذرا تکلف ہوا۔ پھر اس کے بعد وہ سڑک پار کر چلے تھے۔ اب وہ اُس آدمی کو دیکھ سکا۔ اودا یونیفارم تھا اور سر پہ ٹوپی۔ کسی ہوائی آدمی کی طرح۔ وہ پائلٹ بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کی مونچھیں پتلی پتلی تھیں اور اُس کے ہونٹوں میں سگریٹ ابھی جلایا نہ گیا تھا۔

مرد کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ عورت تیزی سے مڑی۔ اس نے کُتّے کو اپنی طرف کھینچا لیکن وہ اپنے پاؤں فٹ پاتھ پر جمائے جھینگتا رہا۔ مرد نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اُس کے قریب گیا اور جھک کر اُس کے سر پر تھپکی دی۔ پھر سیدھا کھڑا ہو کر اپنے سگریٹ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے اُس نے عورت سے کچھ کہا۔ عورت نے سر ہلایا، ہینڈ بیگ سے اپنا لائٹر نکالا اور مرد کے حوالے کیا۔ اُس نے اپنا سگریٹ جلایا اور لائٹر واپس کر دیا۔ پھر سگریٹ کو اپنے منہ سے نکالا۔ ایک کھسیانی ہنسی کے ساتھ اُس نے عورت کے کان میں کچھ کہا اور سنیما کی جس دیوار میں دراڑ پڑی تھی اس کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے تو عورت کا سر دراڑ کی طرف مڑا پھر اُس کا منہ حیرت سے کھُل گیا۔ دوبارہ اُس نے مرد کی طرف غور سے دیکھا۔ عورت کے چہرے پر شگفتگی آگئی تھی۔ اسی طرح دیکھتے ہوئے اس نے اپنا سر ہلایا اور کھی کھی کرنے لگی۔ یونیفارم پہنا ہوا مرد ہنسا اور پھر اپنا ہاتھ اُس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ عورت نے کتّے کو گود میں اُٹھا لیا۔ دونوں نے ایک اُچٹتی نظر گلی کی طرف ڈالی اور پھر دیوار کی دراڑ کے پار نکل آئے۔

اندر آکر انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ انھیں اندھیرے کی تلاش تھی۔ اوپر کی طرف ایک کونے میں ایک لڑکا پہلے ہی سے چھپا بیٹھا تھا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ عورت کا چہرہ بہت سفید تھا اور ہونٹ سُرخ چمکیلے۔ مرد اُس سے بہت اونچے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ عمر میں عورت مرد سے بہت بڑی لگتی تھی۔

مرد نے اپنا ہاتھ عورت کی کمر میں ڈالا اور دو کرسیوں کے بیچ والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جگہ راست لڑکے کے نیچے تھی۔ عورت پھر ہنسی اور اپنا سر ہلائی۔ اُس نے اپنا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں دیا اور اُس کے ساتھ آگے بڑھی۔ وہ اونچی ایڑی کا جوتا پہنے تھی۔ اِدھر اُدھر گری ہوئی کرسیوں اور بوسیدہ قالین پر سے گزرتی ہوئی وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ مرد جیسے ہال کے اندر کے راستے سے واقف تھا۔ وہ عورت کو سنبھال رہا تھا۔

جب وہ قالین بچھے ہوئے سپاٹ حصّے پر پہنچے تو دونوں تیز تیز سانسیں لینے لگے۔ مرد نے عورت کو اپنے بغل سے نکالتے ہوئے اُس کے چہرے کو اپنی طرف گھمایا اور اُس کی بیچ پیشانی پر بوسہ لیا۔ کتّے کو اُس نے عورت کی گود سے نکال کر ایک کرسی پر بٹھایا اور اُسے زنجیر سے باندھ دیا۔

پھر وہ گھوم کر مڑا۔ تب عورت نے اپنی بانہیں مرد کی گردن میں ڈال دیں۔ وہ اپنا منہ اُس کے منہ کے قریب لے گئی۔ اُس کے سر کو وہ اس طاقت سے پکڑی ہوئی تھی کہ اُس کی کہنیاں سفید

ہو گئیں۔ مرد نے اپنے سر کو جنبش دے کر مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ کو آزاد کر لیا۔ ایک ہاتھ سے عورت کو اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اُس کی اسکرٹ میں ڈالا۔ پاؤں پھیلا کر عورت اپنے پنجوں پر کھڑی ہو گئی اور اپنے ہونٹوں سے مرد کے کانوں کو مس کرنے لگی۔ وہ ہنسا اور عورت کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر اُسے اونچا اُٹھایا۔ پھر اپنے ہاتھ کو بڑی نزاکت سے اُس کے اسکرٹ اور اُس کے چوتڑوں تک لے گیا۔ عورت نے مرد کے کانوں کو اپنے ہونٹوں سے دبایا۔ بدلے میں مرد نے اپنے ہاتھ کو اسکرٹ کے اندر اور بھی آگے بڑھایا اور اُسے وہیں رہنے دیا۔ عورت نے اپنے دانتوں کو بھینچتے ہوئی ہلکی سی چیخ نکالی۔ اُس کا پچھلا حصہ چپڑ کنے لگا۔ تب مرد نے اپنا ہاتھ وہاں سے ہٹا لیا اور اپنی ناک تک لایا۔ دونوں انگلیوں کو مسلتے ہوئے اُس نے اُنھیں سونگھا۔ مسکراتے ہوئے پھر وہ اُنھیں عورت کی ناک تک لے گیا۔ عورت نے منہ بنا کر اپنا سر پیچھے کر لیا۔ تب مرد نے اپنی انگلیوں کا بوسہ لیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ عورت بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگی۔ تب مرد نے عورت کو بھینچ کر اُس کے منہ سے اپنا منہ لگا دیا۔ عورت نے اپنا ایک ہاتھ مرد کے بلٹ میں دھنسا کر اُس کی پتلون کے اندر گھسایا۔ مرد کے کاندھے تن گئے ہو گئے اور اس نے عورت کا بازو پکڑ کر تھوڑی دیر کے لیے اُسے وہیں رہنے دیا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہو کر اپنے بلٹ کو ڈھیلا کیا۔ اس کے بعد اُس نے عورت کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے فرش کی طرف جھکا دیا۔

اچانک کتّے نے بھونکنا شروع کیا۔ باریک لیکن تیز آوازیں۔ بھونڈی آواز — لڑکے نے دیوار کی دراڑ سے ایک سایہ کو گزرتے دیکھا۔ ہیٹ پہنا ہوا آدمی کتّے کی آواز پر رُک گیا تھا وہ اندر جھانکنے لگا۔ لڑکے کو یونیفارم والے آدمی اور تنگ اسکرٹ والی عورت کی خاطر گھبراہٹ ہوئی اور اس نے چاہا کہ یہ دونوں کتّے کو بھونکنے سے روک دیں۔

عورت اُٹھ بیٹھی اور کتّے کی ناک پر ایک چپت لگائی۔ وہ بلبلایا اور چپ ہو گیا۔ جو ادنی سیاہ ہیٹ پہنے ہوئے تھا وہ اپنا سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

لڑکے نے عورت کے سانس لینے کے انداز سے محسوس کیا کہ اب اسے جلدی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سوئیٹر کے آخری سرے تک لے گئی اور اُسے اپنے بلوز کے ساتھ کاندھوں

کے اوپر کھینچنے لگی۔ وہ چند لمحوں کے لیے بیٹھی رہی۔ پھر پیچھے کی طرف جھکی۔ اُس کی چولی نیچے آرہی۔ اُس کی چھاتیاں بھری بھری تھیں اور تقریباً اس کے پیٹ کو چھو رہی تھیں۔ جلد بھیگی اور جھریوں سے بھری۔ ایسے لگتا تھا وہ سمندر میں دیر تک رہ کر ابھی ابھی آئی ہے۔ لڑکے کو اُس کے نپیل نظر آرہے تھے۔ وہ سڈول اور بھورے تھے۔ ایسے ہی جیسے دو پنس کا سکّہ ہر صبح وہ اخبار کے ایجنٹ کے پاس لے جاتا ہے۔ درمیان میں وہ نکیلے اور سخت تھے۔ اور بے حد سیاہ کشمش کی طرح۔ اُس کا جی چاہا کہ وہاں پہنچ کر وہ اُنھیں چومے اور اپنی انگلیوں سے رولے۔

یونیفارم والے آدمی نے اپنے ہاتھ اُن پر رکھے۔ عورت کا جسم لرزش کرنے لگا اور دھڑ اوپر سے کمانی دار بن گیا۔ اُس کا مسکرانا بند ہو گیا۔ اُس کا پسینہ نکل رہا تھا اور سفید میک اپ کیے ہوئے چہرے پر بہتے ہوئے لکیریں بنا رہا تھا۔

عورت نے اپنی اسکرٹ کے بٹن کھولے اور مرد نے اسے کھینچ پھینکا۔ اُس کے بعد اس نے عورت کا سفید انڈرویر بھی نکالا۔ اپنا ہاتھ اُس کے دونوں پاؤں کے بیچ کیا۔ مسکراتے ہوئے اور بڑی نزاکت کے ساتھ اپنے انگوٹھے کو اُس سائے پر پھسلانے لگا جو وہاں نظر آرہا تھا۔ عورت نے منمناتے ہوئے اپنے چوتڑوں کو مرد کے جسم کی طرف کیا لیکن اب وہ سرد پڑ گئی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر پسینے کی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔ اُس نے جلدی سے مرد کو اپنے اوپر کھینچ لینا چاہا لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور ہو گیا اور اپنے دونوں پنجوں اور گھٹنوں کا توازن برقرار رکھتا ہوا اُن پر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی پتلون کو ہتھیلیوں سے ڈھکیل دیا۔

اب عورت مرد کے قریب ہوئی۔ اپنی باہیں پھیلا کر وہ پیچھے کی طرف دیکھتی رہی۔ لڑکے کو محسوس ہوا کہ وہ مرد کے قریب تر ہونا چاہتی ہے۔ مرد کے چوتڑ لکڑی کی گیلری سے چپٹے ہوئے تھے اور وہ ایک طرح کی اینٹھن محسوس کر رہا تھا۔

لڑکے نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو مرد عورت کے اوپر تھا۔ اُس کے کولھے عورت کی پھیلی ہوئی رانوں کے بیچ میں تھے۔ وہ ابھی تک اپنی ہیٹ اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ صرف اس کے چوتڑ ننگے تھے۔ لڑکا اُس کی رانوں کو دیکھ سکا جس کے اوپر سے پسینہ بہہ رہا تھا اور

اس کے سیاہ بالوں کو تقسیم کرتی ہوئی لکیر پہ جم رہا تھا۔

کتے نے پھر بھونکنا شروع کیا۔ لڑکے نے تیزی سے دراڑ کی طرف دیکھا۔ اس دفعہ وہاں سے گزرتے ہوئے دو آدمیوں کے پاؤں نظر آئے۔ سانس روک کر وہ سوچنے لگا کہ کتے کی آواز اُن تک نہ پہنچے تو بہتر ہے۔ مرد و عورت کی آواز بھی باہر جا سکتی تھی۔ پیار و محبت کی حرکات میں تقابلِ لحاظ اضافہ ہو گیا تھا۔ اُن کے زور زور سے ہانپنے اور پسینے سے شرابور جسموں کے رگڑ کھانے کی آواز باہر جا سکتی تھی۔ لڑکے نے صرف اپنے پاؤں میں کپکپاہٹ محسوس کی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھے۔ اُس کے سارے جسم میں شدید درد کی کیفیت تھی۔ وہ درد اُس کے جبڑوں تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن وہ یہی چاہتا تھا کہ باہر کا کوئی آدمی ان دونوں کو دیکھ نہ پائے۔ وہ انھیں کا طرفدار تھا۔ کاش وہ ان دونوں کو اس خطرہ سے آگاہ کر سکتا۔

فٹ پاتھ پر نظر آنے والے پاؤں آگے بڑھ گئے تو لڑکے کو اتنی خوشی ہوئی کہ اُس کی ہنسی نکل گئی۔ ساتھ ہی اس کی نظر مرد پہ پڑی۔ اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ عورت بڑی نرم آواز میں کراہنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ہوا میں خلا بازیاں کھا رہے تھے اور پچھلا حصّہ فرش سے اونچا ہو کر مرد کو اُچھال رہا تھا۔

پھر لڑکا بغیر کسی آواز کے وہاں سے اُٹھا۔ اس طرح کھسک گیا کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

مَیں نے پہلے اپنے چہرے پر پانی مارا اور اس کے بعد اسے واش بیسن میں ڈبو دیا۔

خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ساری باتیں اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ اُسے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ واقعہ سچا تھا یا اُس کے تصوّر نے اسے گھڑ لیا تھا۔

لیکن اُس کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ مجھ سے اسی طرح ملے گا۔ ایک اجنبی کی طرح کسی ویرانے میں۔ وہ بہر حال ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن وہ ملیں گے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے دور ہو کر۔ ایک ایسے مقام پر جس کا کوئی ماضی نہ ہوگا۔ جس کی کوئی تاریخ نہ ہوگی۔ بے فکری کے ساتھ۔ بالکل آزادانہ۔ دو آدمی ایک دوسرے سے قریب ہوتے رہیں اور ساتھ ہی اُن میں اجنبیوں کا والہانہ پن ہو۔

اور اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر مٹے کو ہندوستان آنا پڑے گا۔ وہ ایک ایسی جگہ تلاش کرے گا۔ ویران مقامات سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔

مٹے نے باتھ ٹب کے ایک کنارے بیٹھ کر اپنے چہرے کو چھوا۔ یہ ابھی تک گرم تھا۔ اس نے سوچا اس گرمی کی وجہ اُس کا غصہ ہے۔ اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ ایک ایسے شخص نے جس سے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو اور جو کبھی ملے گا بھی نہیں۔ ایسا عریاں خط لکھا ہے۔ غصہ کیوں نہ آئے۔ وہ غصے میں کانپنے لگی۔ اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ ایسا خط لکھے۔ اس کی تنہائی میں اس طرح مخل ہونا اور اس کے احساسات کو اس طرح مجروح کرنا۔ اسی لیے وہ کانپ رہی تھی جیسے کوئی بجلی کوندکر اس کے قریب سے گزری ہو۔ ناقابلِ یقین۔ پاگل — صرف ایک پاگل آدمی ہی اس طرح کا خط لکھنے کی سوچ سکتا ہے۔

اُس نے دیکھا کہ نِک باتھ روم کے قریب سے گزر کر بھاگتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ گھر کی کوئی بھی آواز باتھ روم تک صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی ماں کو اس بارے میں توجہ دلائے کہ وہ کچھ تو کرے۔ ان کے گھر میں اس طرح کی کوئی گندی بات نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں۔

اُس نے باتھ روم کا کمرہ کھولا اور اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ خط کو پھر سے لفافے میں ڈال کر اُسے اپنے ایک کپڑے میں لپیٹا اور میز کے خانے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بستر پر گر پڑی اور سوچنے لگی کہ کیوں وہ اس خط کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس میں اس کا قصور ہی کیا ہے کہ ایک شخص جس سے وہ کبھی ملی بھی نہیں ایک فحش خط لکھتا ہے۔ اُس کی ماں کا کام تھا کہ اس سے واقف ہوتی۔ اس میں اس کا بھی اتنا ہی قصور ہے۔

اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ یاد آیا کہ ریہرسل کا وقت ہو چکا ہے۔ باہر نکلتے ہوئے وہ اپنی ماں کے پاس ڈرائنگ روم میں رکی اور اُس سے کہا کہ وہ جا رہی ہے اور یہ کہ رات کے کھانے کے لیے دیر سے لوٹے گی۔

مسز پیٹالس آرام کرسی پر بیٹھے مطالعے میں مشغول تھی۔ اس نے مٹے کو دیکھنے کے لیے ناک پر سے اپنی عینک سرکائی اور بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا کہ بہت دیر نہ کرنا۔ تم دیر تو نہیں کرو گی ڈیئر؟

بالکل نہیں۔ مئے نے جواب دیا۔ تم جانتی ہو کہ میں دیر نہیں کرتی۔
وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ مسز پرائس نے کہا۔ ٹھیک تو ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ تردیب نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے۔
مئے کو سجھائی نہ دیا کہ کیا کہے۔ اس کی زبان سے نکل گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس نے مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے۔
مئے کی طرف نظریں چراتے ہوئے مسز پرائس مسکرائی اور کہنے لگی۔ ٹھیک ہے خیال اچھا ہے۔ تمہیں جانا چاہیے۔
مئے مسکرائی اور تیزی سے گھر سے نکل گئی۔
لیمنگٹن روڈ پر سے گزرتے ہوئے وہ حیرت کرنے لگی کہ اس نے اپنی ماں سے جھوٹ کیوں کہا جب کہ وہ طے کر چکی تھی کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گی۔
ایسا لگتا تھا کہ ریہرسل ہمیشہ کے لیے جاری رہے گا۔
وہ چائے پی رہے تھے۔ الغوزہ بجانے والے نے جو جدید فرانسیسی موسیقی سے متعلق کسی موضوع پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس نے مسیاّن اور اس کی موسیقی پر ہندوستانی اثرات کے بارے میں باتیں کیں۔ اسے تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اس موسیقی میں پرندوں کی چہچہاہٹ اور اس طرح کی باتوں کے علاوہ رکھا گیا ہوگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ محض ایک پراسرار اتفاقی مطابقت ہے۔
وہ کلبرن ہائی روڈ سے اپنے گھر واپس ہوتے ہوئے میسیّن کے بارے میں سوچ رہی تھی میسیّن کی کوئی چیز اس کے اپنے گھر پر نہیں تھی۔ دوسرے دن وہ کسی میوزک کی دکان پر رکے گی اور میسیّان کی کوئی چیز حاصل کرے گی۔
روڈ سے آگے نکل کر گلی پار کرنے سے قبل وہ انڈین رسٹورنٹ کے آس پاس گھومتی رہی۔ دی تاج محل کری پیلیس۔ اس کی ایک کھڑکی میں تاج محل کی تصویر لگی تھی۔ اس کی طرف گھورتی ہوئی وہ سوچنے لگی کہ اس کی ماں شاید ٹھیک ہی کہتی تھی۔ کوئی برا خیال نہیں۔ کسی میسیّان کو حاصل کرنا چاہیے۔ تردیب سے کیا لینا دینا۔

اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا اور پھر سے اسے جلتا ہوا پایا۔ ناگہاں وہ مڑی اور روڈ پر تیزی سے چلنے لگی۔

میرے باپ بعض معاملات میں بچوں جیسے تھے اور کسی خوش خبری کو لوگوں تک پہنچانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے۔ ایک ایسے بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں کوئی چاکولیٹ بار دے دیا گیا ہو۔ لوگوں سے اُلٹے سیدھے سوالات کرتے۔ بھول جانے کا بہانہ تراشتے۔ پھر اچانک حیرت سے پیچھے کی طرف جھکتے۔ لوگوں کی بدلتی ہوئی کیفیات اور بے چینی کا مزہ لیتے اور اپنے ہاتھوں کو مسلتے رہتے۔ ان لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے بعض وقت وہ ایک اچھی خبر اور غیر متوقع خبر میں فرق ہی محسوس نہ کرتے۔

مارچ ۱۹۶۳ء کی ایک شام وہ اپنے چہرے پر ایسی ہی ایک شرارت لیے گھر پہنچے۔ ماں جب چائے لے کر اُن کے پاس گئی تو اس نے تاڑ لیا۔ اس نے میرے باپ سے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ انھوں نے مسکرا کر اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے کوئی اہم بات ہو جو رات کے کھانے پر ہمیں بتائی جائے گی۔

اُس رات میری دادی کو کھانے پر آنے میں دیر ہوئی۔ وہ چہل قدمی کے لیے پارک تک گئی تھی۔ ہم لوگ باغ میں بیٹھے تو اس کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ میرے باپ کی بے چینی کو میں محسوس کر رہا تھا۔ جب انھیں گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی تو وہ اپنی کرسی سے اُچھل پڑے۔ دادی کو ڈانٹنے لگے کہ اتنی دیر تک پارک میں گھومنا کس قدر غیر محفوظ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میری دادی کو اچنبھا ہوا۔ دادی چیخ پڑی۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں جو کل پیدا ہوئی۔

ڈنر ٹیبل پر بیٹھنے تک میرے والد بے صبری سے انتظار کرتے رہے کہ انھیں اپنی کرتب بازی کا موقع کب ملے گا۔

آپ کو ایک خبر سنانی ہے۔ انھوں نے دادی سے کہا۔

خبر؟ میری دادی نے چونک کر کہا۔ کیسی خبر؟

اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے میرے باپ نے کہا کہ صاحب کو نئی جگہ تعینات کیا گیا ہے۔ ترقی دے کر۔ اُن کے پیشہ کا یہ ایک اہم عہدہ ہے۔

میری دادی نے نتھنے پھلا کر دال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

یہ نا ممکن ہے۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

کیوں؟ میرے باپ نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

اسے کون ترقی دے گا؟ دادی نے حقارت سے کہا۔ وہ شراب پیتا ہے۔ وہ شرابی ہے۔

میرے باپ نے غصے میں سر ہلا کر کہا۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ صاحب بالکل شرابی نہیں ہے۔ وہ صرف کبھی کبھی پیتے ہیں۔ یہ اُن کے پیشے کا جزو ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ایک قابل آدمی ہیں۔ انھیں ابھی تک اس لیے ترقی نہیں ملی کہ ان کے خلاف محکمے کی سازشیں تھیں ورنہ وہ تو پہلے ہی اس کے مستحق تھے۔ پینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بڑی غلطی پر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میری دادی کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ میرے باپ کی بات کو نہیں مان رہی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ صاحب کے بارے میں دادی کا رویّہ ہی ایسا تھا۔ میرے باپ کے خیال کے مطابق شراب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے رویّے کی یہ سختی تو اسی زمانے سے ظاہر تھی جب وہ ہیڈ مسٹرس بن گئی تھی۔ اپنی ایک قریبی دوست کو جو ایک نیک فطرت عورت تھی دادی نے اس الزام سے نوکری سے نکال دیا کہ وہ کاہل تھی۔ اُسے یقین تھا کہ صاحب کسی ترقی کا مستحق نہیں ہے۔ بالکل کمزور۔ اُس میں ریڑھ کی ہڈی ہی نہیں۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی دھمکی کے آگے جھک نہ سکے۔ اس میں کوئی استقامت ہی نہ تھی۔ ریاستی امور میں اوروں کی طرح ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اہم فیصلے کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صاحب کے فیصلے مایا دیبی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ وہ تو سارے کام انجام دیتی ہے۔ سیاسی مسائل کو سلجھانے اور کئی معاملات کو اُلٹ پلٹ کرنے میں وہی اپنے ذرائع استعمال کرتی ہے۔ صاحب تو اس کا دستِ نگر ہے۔ دادی اپنے ان ہی خیالات کی وجہ سے صاحب کو ایک مجہول اور چھوٹا آدمی سمجھتی تھی۔

یہ بات بھی نہیں تھی کہ صاحب اس کو سرے سے ناپسند تھا۔ کسی حد تک وہ اسے قابلِ بھروسہ بھی جانتی تھی۔ وہ خراب رائے نہ رکھتی اگر صاحب کسی معمولی کام سے لگا ہوتا۔ وہ معمولی

کام کس طرح ہو سکتا تھا میں جان نہ سکا۔ اُسے یہ بھی برداشت نہ تھا کہ صاحب کسی اسکول کا ٹیچر یا ایک ریونیو انسپکٹر ہوتا۔ شاید اس کے لیے یہ زیادہ پسندیدہ بات ہوتی کہ صاحب کسی ہوٹل کا مالک ہوتا یا پھر شاید ایک فن کار ہوتا کیونکہ اس طرح کے پیشے اُس کے ذہن میں حد درجہ گھناونی آفاقیت کے ہم معنی تھے۔

میرے باپ نصف گھنٹے تک مسلسل دادی کو یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ صاحب بہت ہی قابل آدمی ہے اور اپنے پیشے میں سب سے اونچا مقام حاصل کرنے کے مستحق۔ لیکن جب وہ دادی سے ہار گئے تو دادی نے چپکے سے سوال کیا۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اُسے کہاں متعین کیا گیا ہے۔

میرے باپ نے اپنی پیشانی ٹھونکی۔ ہاں ہاں۔ میں تو بھول گیا۔ وہی تو اصل خبر ہے۔

کیوں؟ میری دادی نے کہا۔ وہ کہاں جا رہا ہے۔

آپ قیاس ہی نہیں کر سکتیں۔ میرے باپ نے کہا۔

وہ کون سی جگہ ہے؟

یہاں سے بہت دور نہیں۔ اُن کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

میری دادی نے اپنی پلیٹ سرکائی۔ وہ اُلجھن میں مبتلا ہوئی اور شاید تھوڑی سی فکر مند بھی۔

کہاں؟ اس نے اصرار کیا۔ مجھے بتاؤ۔

وہ ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ میرے باپ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ وہاں اُنھیں ڈپٹی ہائی کمیشن میں کونسلر بنایا گیا ہے۔

میری دادی نے خالی خالی آنکھوں سے دیر تک میرے باپ کی طرف دیکھا۔ پھر کرسی کو پیچھے کرتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں وہاں پہنچا تو اُس کے کمرے کو مقفل پایا۔

اس واقعے کے چند دنوں تک کسی نے دوبارہ دادی کے سامنے ڈھاکہ کا نام نہ لیا۔ لیکن ایک دفعہ میں نے اپنی ماں کو میرے باپ سے کہتے ہوئے سنا۔ بہتر ہوگا کہ اگر کچھ دن کے لیے دادی

ڈھاکہ چلی جائے۔ سب کو آرام مل جائے گا۔

ایک ہفتہ بعد میری دادی کے نام خط آیا۔ مایا دیبی کے نام لکھا تھا۔ پہلے میرے باپ کی اس پر نظر پڑی۔ ماں اور باپ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر خط کو میرے حوالے کرتے ہوئے میرے باپ نے کہا کہ میں اسے اوپر دادی کو دے آؤں۔

میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بھاگا۔ لفافے کو جھنڈے کی طرح ہلاتا ہوا۔ تھاتما تھاتما تمہارے لیے ایک خط ہے۔

بے چینی سے اس کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں اور اس نے مجھ سے خط حاصل کرنے سے قبل اپنی طلائی چین کو چھوا۔ جب وہ عینک لگا کر لفافہ کھول چکی تو میں اسے دیکھتا ہوا وہاں بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور لفافہ بازو رکھتے ہوئے سختی سے مجھ سے کہا کہ میں کمرے کے باہر چلا جاؤں۔

اس شام کھانے پر میرے باپ نے جان بوجھ کر خط کا ذکر نہ چھیڑا۔ تھوڑی دیر تک میری دادی نے یوں ہی سیاسی گفتگو کی۔ تعلیمی مسائل اور پرائم منسٹر کی پارلیمنٹ میں تقریر پر۔ پھر اسی روکھے انداز میں اس نے کہا۔ مایا نے مجھے ڈھاکہ آنے کی دعوت دی ہے۔

میرے ماں باپ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر باپ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ہاں میں جانتا تھا۔ وہ تمہیں ضرور دعوت دے گی۔

اب میری دادی اپنے ہونٹ چبا رہی تھی اور اس کی نظریں پلیٹ کی طرف تھیں۔ بڑی دھیمی آواز میں اس نے کہا۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے جانا بھی چاہیے۔

میرے ماں باپ نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہاں ہاں تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ میرے باپ نے کہا۔

کیوں؟ میری ماں نے کہا۔ چند ماہ قبل آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ کام تو آپ کو کرنا ہے۔

میں جانتی ہوں۔ میری دادی نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ لیکن اب... میں نہیں جانتی۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اتنے برسوں بعد یہ عقلمندی ہو گی؟ اب تو وہ اپنے گھر کی طرح نہیں رہا۔

چپام ۔ چپا مس اور دوسری مٹھائیاں تو اسی طرح کی ہوں گی ۔ میری ماں نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا اور تمام مچھلیاں بھی ۔ اور پھر خریدنے کے لیے ڈھاکہ کی ساڑیاں طرح طرح کی ۔

اور سوچو تو ۔ میرے باپ نے اضافہ کیا۔ آپ پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر سکیں گی۔ تفریح کا بہترین موقع ہے ۔

یہ بات دادی کے جی کو لگی ۔ اس نے باپ کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اگر میں جاؤں تو تفریح کی خاطر نہیں جاؤں گی ۔ تمہیں معلوم ہو کہ میں کوئی عیش پرست انسان نہیں ہوں۔ میں نے زندگی بھر کبھی چھٹی نہیں منائی ۔ اور میں ابھی وہاں نہیں جاؤں گی ۔ اگر میں جاؤں گی تو جیتھ موشائی کے لیے ۔ خاندان میں اکیلی تو رہ گئی ہوں جسے ان باتوں کا خیال ہے ۔ میرا فرض ہے کہ میں اس بے چارے ضعیف آدمی کو یہاں لے آؤں ۔

تب تو آپ جا رہی ہیں ؟ میری ماں نے تمنا ظاہر کی ۔

اس پر میری دادی کی غیر یقینی کیفیت پھر سے لوٹ آئی ۔ میں نہیں جانتی —— وہ کہنے لگی ۔ سچ مچ میں نہیں جانتی ۔

اگلے چند مہینوں میں میرے ماں باپ چپکے چپکے دادی کو ترغیب دیتے رہے ۔ لیکن جب بھی یہ موضوع زیر بحث آتا میری دادی یا تو سر ہلاتی یا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ۔

اس واقعے کے تین مہینوں کے بعد جون کے مہینے میں ایک شام ہمارے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ میرے ماں باپ نے رسیور اٹھایا اور دادی کو بلانے کے لیے کہا ۔ دلی سے دادی کے لیے ٹرنک کال تھا ۔ مایا دیبی نے کیا تھا ۔

ٹرنک کال کا کسی بھی شہر سے آنا آدمی کو چوکنا کر دیتا ہے ۔ ایک چھوٹے سے معجزہ کی طرح لیکن پریشانی کا سبب بھی بن جاتا ہے ۔ خبر اچھی ہو گی یا بری ۔ میں اتنی تیزی سے بھاگ کر اس کے کمرے تک گیا کہ میری سانس پھول گئی اور کچھ کہنے کے قابل نہ رہا ۔ میں نے صرف اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اسے نیچے لے آیا ۔

ماں باپ اور میں آس پاس ہی کھڑے رہے ۔

دادی نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے رسیور اٹھا کر اپنے کان سے لگایا۔ ہم تینوں اس کے گرد منڈلاتے رہے۔ ہم نے اُس کو کہتے سُنا۔ ہاں ہاں — میں نہیں جانتی۔ جب تم جا رہی ہو تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جب وہ مایا دیبی کو سُن رہی تھی تو تھوڑی دیر کی خاموشی تھی۔ پھر چیختے ہوئے اس نے وضاحت کی کہ اُن کا انکل ابھی زندہ ہے۔ ڈھاکہ کے آبائی مکان میں رہتا ہے۔ اور مایا کو چاہیے کہ ڈھاکہ پہنچ کر وہ اس سے ملے۔ اسے ہندوستان لانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ پھر سانس لے کر وہ دوبارہ سننے لگی۔ کسی چھوٹے سے سوال پر اُس نے کہا میں نہیں جانتی۔ نہیں۔ سچ مچ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ میں اپنے لیے نہیں۔ مجھے جیجھ موشائی کی فکر ہے۔ پھر وہ تھوڑی دیر سنتی رہی۔ آخر کار مسکرا کر اُس نے کہا ٹھیک ہے میں آؤں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔

مایا دیبی، صاحب اور روبی ایک ہفتہ قبل دلّی آنے ہیں۔ فون رکھ کر دادی نے میرے ماں باپ سے کہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ڈھاکہ روانہ ہونے والے ہیں۔ وہ کلکتہ میں رُک نہیں رہے ہیں۔ اُن کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔

لیکن کیا آپ بھی ڈھاکہ جا رہی ہیں؟ میرے باپ نے پوچھا۔ آپ کا جانا اہم بات ہے۔

میری دادی نے بے بسی سے کاندھے ہلائے۔ میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ اُس نے۔ اب یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ یہ بات طے کر دی گئی ہے۔

تو پھر آپ کب جا رہی ہیں؟

اگر میں جاؤں گی۔ اس نے کہا۔ تو آنے والے جنوری کی بات ہوگی۔ اُنھیں نئے مقام پر سنبھلنے کا موقع ملنا چاہیے۔

چند ہفتوں بعد ڈنر پر میرے باپ نے ہنستے ہوئے ایک لفافہ دادی کی طرف بڑھایا اور کہا۔ یہ آپ کے لیے ہے۔

یہ کیا ہے۔ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے میری دادی نے کہا۔

دیکھئے۔ اِسے اُٹھائیے۔

اس نے لفافے کو اُٹھایا اور چاک کر کے اُس میں جھانکنے لگی۔ میں نہیں جانتی۔ وہ

کہنے لگی۔ اس میں کیا ہے۔

میرے باپ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ یہ آپ کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے۔ انھوں نے کہا۔ ڈھاکہ کے لیے ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء کے دن۔

ایک طویل عرصے کے بعد میری دادی سچ مچ بڑے جوش میں تھی۔ سونے سے قبل جب میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ سامان اِدھر اُدھر کر رہی تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ میں خوش ہوا۔ گیارہ سال کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے میری اس طرح دلجوئی کی کہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں خود بھی کبھی ہوائی جہاز میں بیٹھا نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ فطری طور پر وہ اس بات سے خوش ہوگی کہ اُسے پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں فکر مند تھا کہ وہ ہوائی جہاز کے سفر سے ناواقف ہے۔ اسی لیے اُس رات سونے سے پہلے میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ وہ ٹھیک سے اس سفر کی تیاری کرے لیکن بہت جلد مجھ پر واضح ہو گیا کہ اسے ان باتوں سے واقف کروانا آسان کام نہیں ہے۔ اس نے میرے باپ سے جس طرح کے سوالات کیے اُس سے اندازہ ہوا کہ یہ معاملہ اس پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ہوائی جہاز کے سفر سے متعلق کچھ بھی جان نہ پائے گی۔

یہی لیجیے کہ ایک شام جب ہم باغ میں بیٹھے ہوئے تھے تو اُس نے سوال کیا کہ آیا وہ ہوائی جہاز سے ہندوستان اور مشرقی پاکستان کو الگ کرنے والی سرحد دیکھ سکے گی۔ میرے باپ نے ہنس کر کہا۔ وہ سرحد کو اس طرح کیوں دیکھنا چاہتی ہے جیسے کسی اٹلس میں دکھایا جاتا ہے۔ ایک طرف سبز اور دوسری طرف گلناری رنگ کی۔ اس پہ دادی ناراض ہونے کے بجائے حیرت میں پڑ گئی۔

نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ایسا بالکل نہیں۔ لیکن کچھ تو ہوگا۔ خندقوں جیسا یا سپاہی کھڑے ہوئے۔ یا توپیں ایک دوسرے کی طرف منہ اٹھائے ہوئے کم از کم بنجر زمین کے علاقے۔ کیا وہ اسے نو مینس لینڈ نہیں کہتے؟

میرے باپ کو سفر کا بہت تجربہ تھا۔ وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے۔ نہیں۔ آپ ایسی کوئی چیز نہیں دیکھ سکیں گی۔ سوائے بادل کے۔ اگر آپ خوش قسمت ہوئیں تو کہیں کہیں سبزہ زار۔

اُن کی ہنسی دادی کو نہیں بھائی۔ سنجیدہ بنو۔ اس نے ڈانٹا۔ مجھ سے اس طرح بات نہ کرو۔ جیسے تمہاری آفس سکریٹری ہوں۔

دبکی کھانے کی میرے باپ کی باری تھی۔ وہ کچھ بوکھلائے کیونکہ دادی کی کرخت آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں آپ کو اسی قدر بتا سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا۔ یہی تو ہوتا ہے وہاں۔

اس پر میری دادی نے تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر کہا۔ اگر خندقیں وغیرہ کچھ نہیں ہیں تو لوگوں کو کیسے معلوم ہو۔ میرا مطلب ہے۔ فرق کیسے ہوگا۔ اگر فرق نہیں ہے تو پھر دونوں طرف ایک جیسا ہی ہوگا۔ ویسے ہی جیسے پہلے تھا کہ ایک دن ہم ڈھاکہ میں بیٹھے اور کہیں رُکے بغیر دوسرے دن کلکتہ پہنچ گئے۔ ورنہ وہ سب کس لیے تھا۔ ملک کی تقسیم اور چاروں طرف قتل و غارتگری جب کہ دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے؟

میں نہیں جانتا ماں کہ تم چاہتی کیا ہو۔ میرے باپ نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں کہ تم ہمالیہ کی چوٹیوں پر سے گزر کر چین پہنچ رہی ہو۔ سرحد کوئی اُس پار نہیں ہے۔ وہ تو ایرپورٹ ہی ہے۔ تم دیکھو گی۔ جب تم اپنے کاغذات دکھا کر آگے بڑھو گی تو تم اس پر سے گزرو گی۔

میری دادی نے پریشان ہوتے ہوئے کرسی پر پہلو بدلا۔ کس طرح کے کاغذات؟ اُس نے کہا۔ اُن کاغذات پر وہ کس طرح کی تفصیلات چاہتے ہیں؟

میرے باپ نے اپنی پیشانی کھجائی۔ میں آپ کو بتا دوں۔ انھوں نے کہا۔ وہ آپ کی نیشنلٹی دیکھتے ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش۔ جائے پیدائش اور کچھ ایسی ہی باتیں۔

میری دادی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ کرسی پر اپنا سر ٹکا کر پیچھے کی طرف جھک گئی۔

کیا بات ہے؟ میرے باپ نے چونکتے ہوئے کہا۔

تھوڑی سی جدوجہد سے دادی کرسی پر سیدھی ہو گئی۔ اپنے بالوں کو پیچھے کیا۔ کچھ نہیں اپنا سر ہلا کر وہ کہنے لگی۔ بالکل نہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ تب میں نے سوالات کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور اپنے باپ سے ہوائی جہاز کے سفر سے متعلق طرح طرح کے سوالات کیے۔ ان کا جاننا دادی کے لیے ضروری تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں اُسے جتا نہ دوں تو وہ جہاز کے اُڑان کے دوران کھڑکی کھلی رکھ دے گی۔

کئی برسوں بعد ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اُس وقت کاغذات میں خانہ پُری کرتے ہوئے مقامِ پیدائش کی جگہ ڈھاکہ لکھنا دادی کے لیے ایسا ہی بُرا لگا جیسا وہ اپنے اسکول کی نوٹ بکس کی جانچ کے وقت محسوس کرتی تھی۔ اُس وقت ہرگز یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہوگی کہ مقامِ پیدائش کا تعلق نیشنالٹی سے بھی ہو سکتا ہے۔

میرے باپ نے محسوس کر لیا کہ دادی کیوں فکرمند ہے۔ اس نے چھیڑا۔ ماں اتنے نزدیک سفر کے لیے آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟ آپ تو برسوں تک کئی ممالک کا سفر کرتی رہی ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے برما کے باہر اور اس ملک کے اندر کتنے سفر نہیں کیے؟

او، ماں۔ میری دادی نے قہقہہ لگایا۔ یہ سفر بالکل ویسا نہیں۔ وہاں تو کسی بھی کاغذ پر خانہ پُری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُن دنوں سفر بھی بہت آسان تھا۔ جب چاہے میں اپنے گھر ڈھاکہ آتی جاتی رہتی۔

اچھل کر میں اپنے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ایک غلطی پکڑنے کی خوشی میں۔ وہ جو پورے ستائیس سال تک ایک اسکول کی ٹیچر رہی تھی۔

تھاما تھاما۔ میں چیخا۔ آپ اپنے گھر ڈھاکہ کس طرح آئیں۔ آپ کو تو آنے اور جانے کا فرق ہی نہیں معلوم۔ اس بات کو لے کر برسوں میں اُسے چھیڑتا رہا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی کہ وہ مجھے بنگالی کی گرامر پڑھائے گی تو میں ہنستا اور کہتا۔ تھاما آپ مجھے گرامر کیسے سکھائیں گی جب کہ آپ کو آنے اور جانے کا فرق ہی نہیں معلوم۔ آہستہ آہستہ یہ محاورہ خاندان میں عام ہو گیا اور خفیہ اشاروں کا وسیلہ بن گیا۔ کسی باڑ کے تاروں کے جال کی طرح جسے ہم لوگوں نے باہر والوں سے بچنے کے لیے اپنے اطراف گھیر لیا تھا۔ ایک واقعہ سُن لیں کہ جب ہم بچے تھے اور ابھی الاکلکتے میں مقیم تھی اور اگر کوئی ہم سے ملاقات کرنے آجاتا اور ہم سے

یاد پوچھتا کہ آپ لندن کب جا رہے ہیں؟ تب ہم لوگ تیز تیز بولنے لگ جاتے: لیکن پہلے اِلا کو کلکتے جانا ہے اگر مجھے لندن آنا نہیں ہے تو اور آپ کو بھی کلکتہ آنا نہیں ہے تو . . .
اور پھر ہم دیوانہ وار قہقہہ لگاتے۔ ملاقاتی بھی اس میں شامل ہو جاتا۔ اور پھر کہتا۔ آپ نہیں جانتے کہ ہمارے خاندان کے لوگ اس سے واقف ہی نہیں کہ وہ آ رہے ہیں کہ جا رہے ہیں یہ ہماری دادی کا کمال ہے لیکن سچ پوچھئے تو یہ دادی کا کمال نہیں تھا۔ یہ کمال تو زبان کا ہے۔ ہر زبان میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کی ایک مرکزیت ہوتی ہے۔ ایک متعیّن نقطہ جہاں سے ہم نکلتے ہیں اور جہاں ہم واپس آتے ہیں۔ ہماری دادی کو ایک ایسے سفر کے لیے لفظ کی تلاش تھی جس میں نہ کہیں آنا تھا نہ کہیں جانا۔ ایک ایسا سفر جو اسی متعیّن نقطے کی تلاش میں ہو جو افعالِ حرکت کی صحیح اجازت دیتا ہو۔

نومبر کے مہینے میں جب میری دادی اپنے سفر کی تیاری میں مصروف تھی ایک چھوٹی سی خبر اور آئی۔ مایا دیبی نے لکھا کہ اُس کی پرانی دوست الزبیتھ کی بیٹی مے دسمبر کے مہینے میں اپنی چھٹیاں گزارنے کے لیے ہندوستان آ رہی ہے۔ پہلے وہ آگرہ اور دہلی جائے گی۔ پھر کلکتہ۔ ڈھاکہ جانے سے قبل وہ کلکتے میں چند دن گزارے گی۔ مایا دیبی جاننا چاہتی تھی کہ آیا وہ کلکتے کے قیام کے دوران ہمارے پاس ٹھہر سکے گی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ ہمارے پاس زیادہ آرام سے رہ سکے گی۔ یہ جگہ اُن کے بیلی گونجے پیلیس کے مقابلے میں بہتر ہوگی جہاں ترِدیب کی بوڑھی اور مریض دادی محل کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔

میری دادی نے خط میرے باپ کے حوالے کیا۔ انھوں نے فوراً جواب میں لکھا کہ مے کو ہمارے پاس ٹھہرا کر ہمیں خوشی ہو گی۔

ایک ہفتہ بعد ترِدیب ہم لوگوں سے ملنے آیا۔ اُس نے پہلے میرے باپ سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کی پھر کہا کہ وہ بھی مے اور دادی کے ساتھ ڈھاکہ جائے گا۔

اُس نے کہا۔ جب سب جا رہے ہیں تو اس کے لیے بھی جانے کا یہی وقت مناسب ہوگا۔ پھر وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔ جب مے پہنچے گی تو اُسے لینے میں اسٹیشن جاؤں گا صرف دس دن رہ گئے ہیں۔ کیا تم بھی آنا پسند کرو گے؟

کلکتے میں مِنے کے قیام کے بارے میں اس کی اور میری پہلی بار گفتگو ہوئی تو وہ اِلا کی شادی کا دوسرا دن تھا۔

لندن میں اِلا کی شادی بڑی سادگی سے انجام پائی۔ اِلا اور نِک نے کہیں ایک رجسٹر پر دستخط کیے۔ مسز پرائس نے اسی شام چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ دولھا دُلھن کو دوسرے ہی دن کلکتہ روانہ ہونا تھا۔ نِک نے فیصلہ کیا کہ شادی کا مزہ ہندو رسم ورواج کے مطابق اُٹھانا چاہیے۔ کلکتے میں تیاریاں ہو چکی تھیں۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ جتنی شادیاں اُس نے دیکھی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ شاندار تھی۔ کلکتے میں اِلا کے والد نے تحفہ میں ایک فلیٹ لندن میں خریدنا چاہا۔ تب ہی تو اُنھوں نے تنزانیہ سے واپس ہوتے ہوئے لندن میں قیام کیا تھا۔ مکان کے بارے میں اِلا کی فراست پر اُنھیں بھروسہ نہیں تھا اسی لیے وہ خود مکان خریدنے سے پہلے اُسے دیکھنا چاہتے تھے۔ نِک نے اس کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی تھی اور آخر کار کلاپ ہام کامن میں دو بیڈ روم والا فلیٹ حاصل کیا تھا۔ نِک بہت خوش تھا۔ اِلا بھی بہت خوش ہوئی۔ گو اُس نے ظاہرا بے تعلقی برتی۔ اِلا اپنی ملازمت کی وجہ وقت نہ دے سکی۔ نِک کو مکان کا فرنیچر اور پردے وغیرہ خریدنا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ ہنی مون سے واپس ہو کر وہ اپنے مکان میں منتقل ہو سکیں گے۔ ہنی مون کے لیے وہ لوگ افریقہ کا پلان بنا رہے تھے۔ دارالسلام میں اِلا کے والد کے ساتھ ایک ہفتہ گزار کر کینیا اور تنزانیہ کا سفر اِلا کے باپ کی موٹر کار میں کرنا چاہتے تھے۔

اُس شام مسز پرائس کے مکان پر جو باتیں ہوئیں مجھے بہت کم یاد ہیں۔ چاندی کی ایک پلیٹ تھی جسے میں رنگین کاغذ میں لپیٹ کر تحفے میں لے گیا تھا۔ ایک انگریز کی دکان سے میں نے اسے خریدا تھا۔ دکان پر ایک سیاہ سائن بورڈ تھا جس پر رومن حروف میں ایک چھوٹے سے سنہری مونوگرام کے ساتھ لکھا تھا: آپ کے لیے... دکان میں یہ سب سے سستی چیز تھی۔ اس کے باوجود اس کی قیمت بیس پونڈ تھی۔ یہی تو ساری پونجی تھی۔ جسے میں انگلستان میں چھ ماہ کے قیام کے دوران بچا سکا تھا اور مسز پرائس کے گھر جاتے ہوئے راستے میں میں اس بچت سے ہاتھ دھو چکا ہوتا۔

ویسٹ ہمپسٹڈ ٹیوب اسٹیشن پر میں ذرا جلدی پہنچ گیا تھا۔ اس لیے پاس ہی ایک پب کو پاکر تھوڑا سا وقت گزارنا چاہا۔ آدھا پائنٹ بیئر خریدا لیکن وہاں لبنان کے ایک صحافی سے باتوں میں لگ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے چند پائنٹ بیئر خریدے اور جب میں نے گھڑی دیکھی تو ایک گھنٹے کی دیر ہو چکی تھی۔ میں فوراً اٹھا اور لیمنگٹن روڈ کی طرف دوڑ پڑا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ کسی شخص کے پیچھا کرنے کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لبنان کا صحافی تھا۔ دور سے ہاتھ بتا کر اس نے مجھے روکا اور جب وہ میرے قریب پہنچا تو اس نے رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز میرے حوالے کی یہ کہتے ہوئے کہ یہ چھوٹی سی چیز پھسل کر ایش ٹرے میں گر گئی تھی۔

میں نے جب اُسے اِلا کے حوالے کیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ یہ کیا ہے؟ اس نے پوچھا۔ مجھے اندازہ کرنے دو۔ کوئی چھوٹا سا ٹائی پن ہوگا جس میں ہیرے جڑے ہوں گے۔ یا سونے کی پلیٹ ہوگی جس میں پیاری چونٹیوں کو کھلایا جاتا ہے۔ ہاں میں مجھی شیر خوار بچوں کی انگلیوں کے لیے یہ آتشدانہ ہے۔

اتنے میں ایک اور شخص اِلا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس کی طرف مڑی۔ دیوار سے لگ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ مخصوص کھنکھناتی ہنسی کے ساتھ وہ گھومتی پھرتی اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہی تھی۔ چمکدار سلک کی ساڑی میں وہ بہت خوش تھی۔ اس سے قبل میں نے اُسے کبھی اتنی ہشاش بشاش نہیں دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد مئے نے میرے ہاتھ میں وائن کی گلاس تھما دی اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اتنے سارے لوگ وہاں موجود ہوں گے اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ مئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ رسوئی گھر سے آواز آئی اور وہ ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ میں نے وائن کا ایک اور گلاس لیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

پھر مجھے مئے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔ اُٹھو، اُٹھو۔ اب گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے کاندھے پر اُس کا ہاتھ محسوس کیا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ میری طرف اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔

مئے نے میرے کاندھے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اِلا اِنگ کے ساتھ گھر جا چکی ہے۔ اُس نے کہا۔ کل کے لیے انھیں پیکنگ کرنی ہے۔ ماں سونے کے لیے گئی ہے اور میں بھی گھر جانے کے لیے تیار ہوں۔

میں پھر آرام کرسی پر لیٹ گیا اور انگلیاں چٹخانے لگا۔ اس کے جانے سے قبل میں اِلا سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کئی دنوں سے میں اپنے ذہن میں اُس بات کو دُہراتا رہا تھا لیکن اس وقت یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بات تھی۔

تم کیا کروگے مئے نے کہا۔

مجھے فلہام جانا ہے۔ میں نے اپنے پاؤں پٹک کر کہا۔

میں نے اپنے ہاتھ اسکارف اور کوٹ کی طرف بڑھائے اور مئے اپنے ہاتھ سینے سے لگائے خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ جب میں نے اُسے خدا حافظ کہا تو اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔ میرا خیال ہے کہ جس حالت میں اس وقت تم ہو مناسب نہیں کہ گھر جاؤ۔

میں نے انگیٹھی کو بجھاتے ہوئے کہا۔ میں بہت اچھی حالت میں ہوں۔

میرے ذہن میں جو بات ہے وہ شاید تمہاری سوچ سے بہتر ہے۔ اُس نے مسکرا کر کہا میرا خیال ہے کہ تم اس وقت میرے ساتھ اسلنگٹن آؤ۔ میں تمہارے لیے بستر بناؤں گی اور کھانے کے لیے بھی کچھ دوں گی۔ سویرے تم ایک نیک سیرت بنگالی کی طرح گھر جا سکتے ہو۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اس تجویز پر غور کرو۔ ورنہ اسی وقت فلہام جاؤ گے تو میری صبح ضائع ہوگی جگہ جگہ دواخانوں کو ٹیلیفون کرتے ہوئے کہ جانے تم کہاں پڑے ہوگے۔

میں نے سوچا کچھ اچھا سا جواب دوں۔ لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

ٹھیک ہے۔ جیسا تم کہوگی وہی کروں گا۔ بہ شرطیکہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔

بہت اچھے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم سمجھدار آدمی نکلے۔

آخری ٹیوب کا وقت بھی نکل چکا تھا اس لیے مئے نے ریڈیو ٹکسی طلب کی۔ چند ہی منٹ میں وہ آئی اور مئے دروازہ بند کرتی ہوئی مجھے وہاں سے لے کر چلی۔

ٹکسی میں بیٹھ کر مجھے محسوس ہوا کہ سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔ حلق کچھ اس طرح

سکڑ رہا تھا۔ جیسے ہسٹریا سے پہلے کی کیفیت ہو۔ میں نے کار کا شیشہ اُتارا اور سر باہر نکالا۔ ہوا سرد تھی۔ شراب اور تلی ہوئی مچھلی کی تیز بو ابھی ناک سے گئی نہ تھی۔ میرے کان سُن ہو گئے اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ہوا کے جھونکوں نے مجھے جگا دیا۔ میرا جسم ایسے کسمسانے لگا جیسے سر ما کی کسی صبح زیتون کے تیل کا مساج کر دیا گیا ہو۔ میں نے اپنے خصیوں اور بالوں میں حرکت محسوس کی۔ مجھے لگا کہ میرے جسم کا ایک حصّہ اِلا کی شادی کا ماتم منانے کا بہانہ تلاش کر رہا ہے۔

میں نے اپنے کاندھوں پر دباؤ محسوس کیا۔ مینے میری طرف مشتاق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو؟ اس نے کہا۔ کیا میں ٹیکسی روک لوں۔

نہیں۔ میں نے اپنا سر ہلایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسلنے لگا۔

ٹھیک ہے۔ بے تعلقی سے اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

میں پیچھے کی طرف کھسک گیا۔ اپنا بازو اُس کے کاندھوں پر ڈالتے ہوئے میں نے اس کا پیار لیا۔ میری زبان کی نوک اس کی بھنوؤں کو چوم رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک وہ کچھ کہنے کے موقف میں نہ تھی۔ پھر اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ اس کا جسم سکڑنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور پھر سے پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا۔

تم شراب میں دُھت ہو۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ مجھے امید ہے کہ کوئی مصیبت نہ کھڑا کرو گے۔

میں نے شیشے میں جھانکا۔ ڈرائیور دیکھ رہا تھا۔ وہ مغربی ہند کا ایک نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں سڑک سے ہٹ کر بار بار شیشے کی طرف جھانک رہی تھیں۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے اپنے ہاتھ ڈیاش بورڈ کی طرف بڑھائے۔ اُس میں کوئی شے گرنے دی۔ وہ کپڑے کا ڈسٹر تھا۔ دوبارہ مجھ پر نظر پڑی تو وہ مسکرانے لگا۔

ہم لوگ گھر پہنچے تو اُس کو فکر ہوئی جس انداز سے اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ اس سے مجھے بھی گمان ہوا۔ مجھ میں تجسس تھا۔ اس کا علم نہیں تھا کہ وہ ڈری ہوئی ہے اور خود میں اس کے ڈر کا سبب ہو سکتا ہوں۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک ایک لفظ آہستہ سے کہا۔ آواز مت ہونے دو۔

مکان دار خاتون جاگ جائے تو وہ ناراض ہوگی۔
میں خاموش رہوں گا۔ میں نے کہا اور اپنی انگلیاں اُس کے بالوں میں گھمانے لگا۔
اپنا سر ہٹاتے ہوئے اُس نے تنبیہہ کی۔ یہ حرکت بند کرو۔ تم جانتے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو۔
شش۔ تم مکان دارنی کو جگا دو گی۔
وہ پنجوں کے بل چل کر اوپر گئی۔ چپکے سے دروازہ کھولا اور میرے پیچھے بند کر دیا۔
اب تم جاؤ۔ اس نے اپنے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس بستر میں گھُس جاؤ اور
چُپکے سے سو رہو۔ اب میں کپڑے بدلنے کے لیے کچھ نہیں دے سکتی۔ جیسے بھی ہو سو رہو۔
میں نے فوراً احتجاج کیا۔ تم سچ مچ تو نہیں کہہ رہی ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔
پلیز۔ اُس کی آواز پھٹی ہوئی تھی — پلیز اب سو جاؤ۔
میں بستر کی طرف دیکھنے کے لیے پلٹا۔ بہت چھوٹا اور تنگ بستر تھا۔ سبز رنگ کی بڈ شیٹ
بچھی ہوئی اور لحافوں سے لدا ہوا۔
اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا۔ مجھے شرابی کی اداکاری سوجھی۔
اگر میں اس بستر پر سو جاؤں تو پھر تم کہاں سوؤ گی؟
میں ٹھیک ہی ہوں۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ میری فکر نہ کرو۔
لیکن میں تمہاری فکر کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ تم کہاں سوؤ گی؟
اُس نے بستر کے قریب پہنچ کر لحافوں کو اُلٹا۔ بہت ہی صاف ستھرا بستر تھا۔ لگتا تھا کہ
اُسے استعمال ہی نہیں کیا گیا ہے۔ غلافوں کے ہٹاتے ہی گلاب کی خوشبو سے وہ مہکنے لگا۔
میں تو بستر پر نہیں سوتی۔ اُس نے اوپر کی ساٹنوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔
اوہ۔ سچ! میں نے کہا۔ تم یہاں نہیں سوتیں تو پھر کس بستر میں سوتی ہو۔
اُس نے میری جانب خشمگیں آنکھوں سے دیکھا۔
تھوڑے فاصلے پر فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ میں وہاں سوتی ہوں۔
کہاں؟ میں نے پوچھا۔
کوئی جواب دیئے بغیر اُس نے کپ بورڈ کھولا اور ایک پتلی چٹائی نکالی۔ چند بلانکٹ اور

ایک چادر۔ انھیں لے کر وہ آگے بڑھی۔ فرش پر اُسے بچھایا۔ وہ چٹائی ایک پتلی چادر کی طرح تھی۔
تم وہاں نہیں سوتی ہو۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم وہاں نہیں سوتیں۔
پھر یہ بستر کس مقصد کے لیے ہے؟
لوگوں کو دکھانے کے لیے! تاکہ وہ میرے بارے میں غلط نہ سوچیں۔
لیکن تمہارے لیے تو تکیہ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا۔
نہیں۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اس کے لیے مجھے عادت ڈالنی پڑی۔
ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کہا۔ کس قدر تکلیف دہ نہ ہوگا۔
اتنا بُرا بھی نہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ کوئی بڑا ایثار نہیں ہے۔ جیسا کہ ٹیلی ویژن پہ کہا جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر لوگ تو اسی طرح سوتے ہیں۔ میں نے یہی سوچا کہ میں بھی اکثریت کا ساتھ دوں۔ اس نے چادر پھیلا کر ہاتھوں کو جھٹکا اور کہا۔ ٹھیک ہے۔ اب تو پلیز سو جاؤ۔
کیا میں بھی اپنے نفس کو اسی طرح مار سکتا ہوں۔ کیا میں بھی زمین پر تمہارے ساتھ سو سکتا ہوں۔
وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔
صبح یہ ساری باتیں تمہیں فضول لگیں گی۔ اس نے کہا۔ جب میں تمہیں یہ باتیں یاد دلاؤں گی تو تمہارا چہرہ کیسا ہوگا؟
پلیز منے۔ میں نے کہا۔
ایڈیٹ۔ تم اس نے ہنس کر کہا۔ تم نشے میں ہو۔ تم سچ مچ ایسا نہیں چاہتے۔ میں ایک معمر عورت۔ تمہاری آنٹی کے برابر۔
میں چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں سچ مچ چاہتا ہوں۔
ٹھیک ہے تو جب مانوں گی جب تم یہ باتیں ہوش میں کروگے۔ اس نے کہا۔ اس وقت تمہارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ ٹھیک ۔۔ اس نے مجھے آہستہ سے بستر کی طرف ڈھکیل کر کہا۔ اب تو سو جاؤ۔
تم مجھ پر ہنس رہی ہو۔ اس کے ہاتھ کو پرے کرتے ہوئے میں نے کہا۔ تمہیں مجھ پر ہنسنا نہیں چاہیے۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

پلیز ایسا نہ کرو۔ اس نے کہا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں ــــ پلیز۔

کیوں نہیں ؟ میں نے کہا۔ اور اس کے رخساروں کا بوسہ لیتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی گردن کے نیچے سے گزار کر اس کی چولی کی گانٹھ تک لے گیا۔

رک جاؤ۔ وہ چیخی اور میرے چہرے کو کھرونچنے لگی۔

کیوں ؟ میں نے کہا اور اپنے بائیں ہاتھ سے دبا کر اسے اپنے جسم سے چمٹا لیا اور مضبوطی سے تھامے رہا۔ تاکہ اس کے ہاتھوں کو مزاحمت کا موقع نہ ملے۔ میرا دایاں ہاتھ اس کے بلوز کے اندر چھاتیوں کو مسلنے لگا۔

اپنے دانتوں کو بھینچتے ہوئے پورا زور لگا کر اس نے اپنے آپ کو مجھ سے آزاد کر لیا اور پیچھے کی طرف چٹائی پر گر گئی۔ چر سے اس کے کپڑے پھٹنے کی آواز آئی اور میرا ہاتھ معلق رہ گیا۔ میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ چٹائی پر جھکی ہوئی تھی۔ چولی کے اندر سے اس کی چھاتیاں اس کی پسلیوں پر لٹکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

حرامزادے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور جھپک کر اٹھی۔ اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ میں نے آواز سنی وہ باتھ روم کی طرف تھی۔ میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں میچ کر۔ ایک لمحے میں گہری نیند میں غرق ہو گیا۔

میں جب صبح اٹھا تو میرے سر میں درد تھا۔ منہ کا مزہ بدلا ہوا۔ رسوئی گھر سے برتنوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سر اٹھایا تو دیکھا مئے واش بیسن کے پاس کھڑی ہے۔ اس نے کاڈرا کا پتلون اور ایک سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ اپنے مہین بھورے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل دے کر اس نے ایک ربربینڈ میں باندھ دیا تھا۔ چٹائی اور بلانکٹس سلیقے سے تہہ کیے ہوئے ایک کونے میں رکھے ہوئے تھے۔

میں اسے بلانا ہی چاہتا تھا کہ رات کا نقشہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ چٹائی پر جھکی ہے اور اپنے برہنہ سینے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اپنا سر تکیہ پر رکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گزری ہوئی شب کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔

وہ جان گئی کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اس نے میرے چہرے پر پسینہ دیکھا۔ اس کی دھیمی آواز مجھے گونجتی سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کیا تم اس وقت ناشتہ کے لیے تیار ہو؟

مئے... میں نے کہنا چاہا۔ میں اس کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

کیا ہے؟۔ اس نے بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ سننے کی خواہش مند ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کس طرح... میں نے پھر کہنے کی کوشش کی۔ میں نے مشکل سے اپنا سر اُٹھایا۔ وہ ابھی تک دیکھ رہی تھی۔ ٹکٹکی باندھے وہ مجھے گھور رہی تھی۔

تمہیں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ کم از کم تم سے اتنی تو توقع ہے۔

میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں یہ ثابت کرنے کے لیے مجھے بڑی ندامت ہے۔

وہ اب بھی میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس دفعہ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

اب تم میں وہ مردانگی نہیں جو رات میں تھی۔ کیا ہمارا قیاس ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

ہاں۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر تھپکی دی۔

چلو۔ اس نے کہا۔ اپنے بستر سے اٹھو۔ اور منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ تب تک میں تمہارے لیے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔

میرے غسل خانے سے نکلنے تک ٹوسٹ، تلے ہوئے انڈے اور ایک گلاس سنتروں کا شربت یہ سب ٹیبل پر رکھے تھے۔ میں شاید بھوک محسوس کر رہا تھا۔ رات میں نے کچھ کھایا ہی نہ تھا۔ مئے ابھی تک رسوئی گھر میں مصروف تھی۔ اسی لیے میں ایک کرسی کی پشت سے لگا کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

میرا انتظار نہ کرنا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ کافی محنت کی ہے نا تم نے!

لیکن تم کیا کر رہی ہو — میں نے کھسیانے پن سے کہا۔ کیا تم ناشتہ نہیں کرو گی۔

اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس کی فکر نہ کرتی۔ اس نے کہا۔ سچ سچ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو

ٹوسٹ اور انڈوں کے ٹھنڈے ہونے سے قبل ناشتہ کرنے کر فکر کرتی ۔ ان دِنوں روٹیوں کی خرابی یہ ہے کہ اگر گرم گرم کھائی نہ جائیں تو کھانے کے قابل ہی نہیں رہتیں۔

مزید کچھ کہے بغیر میں ناشتے پر بیٹھ گیا۔

پلیٹوں کو اپنی جگہ رکھ کر دیوار سے پیٹھ لگائے وہ مجھے ناشتہ کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

کچھ اور ٹوسٹ لو۔ اُس نے کہا۔

دے دو۔ میں بولا۔ لیکن کیا تم ناشتہ نہیں کرو گی؟

اس نے ایک اور سلائس مجھے دی اور نفی میں سر ہلایا۔

کیا تم نے ناشتہ کر لیا ہے۔ میں نے پھر پوچھا۔

میں آج ناشتہ نہیں کروں گی۔ اس نے جواب دیا۔

کیوں نہیں؟

اس نے ہنس کر کہا۔ کلکتے کے لوگ ایک پرانی کہاوت سے بالکل واقف نہیں۔ وہ بے چاری تجسس میں ماری گئی۔ تمہارے سوال کا یہی جواب ہے کہ آج میں ناشتہ نہیں کروں گی۔ کیونکہ آج شنبہ ہے۔

اس کا کیا مطلب ہے۔ میرا تجسس بڑھا۔

میں شنبہ کے دن کچھ نہیں کھاتی۔ اُس نے کہا۔ آسے تم میرے فاقے کا دن کہہ سکتے ہو۔

تمہارے فاقے کا دن؟ میں نے پوچھا۔ تمہارا مطلب ہے کہ تم شنبہ کو فاقہ کرتی ہو۔

اس نے اپنا سر ہلایا۔ بالکل یہی میرا مطلب ہے۔

لیکن کیوں؟ میں نے دریافت کیا۔

یہ تو بظاہر دینی معاملہ لگتا ہے۔ اس نے کہا لیکن میں اس لیے فاقہ کرتی ہوں کہ اس کا کوئی نقصان نہیں۔ پتہ نہیں میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یا تمہاری قسمت میں۔ یا انسانی نسل کی قسمت میں؟ ہم لوگ کوشش کرتے رہیں اور اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے ہفتے کے تمام دن تو ایک جیسے ہوتے ہیں۔ شنبہ کا دن اس مقصد کے لیے بہتر ہوگا۔ تمہارا ٹوسٹ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں آگاہ کر دوں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا — میرا خیال ہے کہ تم مزاق کر رہی ہو۔
اوہ، پلیز۔ اس نے کہا۔ اس کے پیچھے مت پڑو۔ یہ ایسی کوئی اہم بات نہیں۔
مجھے نہیں معلوم کہ دن بھر کا تمہارا کیا پلان ہے۔ اس نے میرا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے تو چندہ جمع کرنے کے لیے سڑکوں پر نکلنا ہے۔ یہ میرے اہم مقاصد میں سے ہے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ میرے ذمے کر دیئے گئے ہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے یہ اہم مقامات ہیں۔ بہت پیسہ جمع کیا جا سکتا ہے تم چاہو تو میرے ساتھ آ سکتے ہو۔
تم چندہ کس لیے جمع کر رہی ہو۔
قحط زدہ علاقوں کے لیے زیادہ تر افریقہ میں۔ لیکن کون جانے کسی دن شاید یہ تمہارے کام آ جائے۔
ٹھیک ہے۔ میں نے شہد اور مسکہ اپنے ہونٹوں پر چاٹتے ہوئے کہا۔ میں تمہارے ساتھ آؤں گا۔ تمہاری کوئی مدد تو نہ کر سکوں گا۔ پھر بھی آنا چاہوں گا۔
بڑی بھیڑ ہوگی، اس نے کہا۔ میں تمہیں آگاہ کروں کہ کوئی تفریح کی جگہ نہیں ہے۔
اوہ۔ میں بھیڑ کا عادی ہوں۔ میں نے کہا۔
ٹھیک ہے۔ ہم دیکھیں گے۔ اس نے کہا۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ یہاں کی بھیڑ کچھ زیادہ ہی ہے۔
اس نے صحیح ہی کہا تھا۔ بغل میں پوسٹرس اور ہاتھوں میں چندے کے ڈبے لیے جوں ہی ہم آکسفورڈ اسٹریٹ کے زیر زمین علاقے میں داخل ہوئے تو ہم نے دکانداروں کا ایک جم غفیر پایا۔ دھکم پیل تھی۔ میں اس ہجوم میں بہائے گیا۔ جب سنبھل کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی تو مجھے ڈپارٹمنٹل اسٹورس کی اونچی اونچی کھڑکیاں نظر آئیں اور روشنیوں کی چمک دمک۔ تب میں نے مینے کی آواز سنی۔ اسے ایک کونے میں کھڑا ہوا پایا۔ وہ مجھ پر ہنس رہی تھی اور میری طرف ہاتھ ہلاتی جا رہی تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے مجھے تھوڑا وقت لگا۔ اپنی پیٹھ کو دکانوں کی کھڑکیوں کی طرف کیے میں اس ہجوم میں آگے بڑھ سکا۔
تو تم بھیڑ کی عادی ہو۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
اس نے مجھے بتایا کہ پوسٹرس کس طرح لگائے جاتے ہیں۔ ان ریلنگوں پر جو فٹ پاتھ سے

الگ کرتے ہیں اور پھر اس نے میرے چندے کے ڈبے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ جاؤ اپنے شکار پر۔
تیزی سے آگے بڑھتے اور ہجوم کو راستہ دیتے ہوئے میں نے اپنا ڈبہ ان کے سامنے کر دیا لیکن پاؤ گھنٹے تک بھی اس میں کسی نے کچھ نہیں ڈالا۔ میں حیرت میں پڑ گیا کہ آیا لوگ مجھے دیکھ بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ میں مَنے کی طرف دیکھتا ہوا۔ ریلنگ سے لگا مایوس کھڑا رہا۔
بہت جلد مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ اس کام میں ماہر ہے۔ اس کا ہمیشہ کا شرمیلا پن چہرے سے غائب تھا۔ اس کی آواز بلند اور تحکمانہ ہو گئی تھی۔ وہ ہجوم میں کسی ایک فرد کے قریب پہنچتی تو اُسے اپنی طرف مائل کر لیتی۔ اپنا ڈبہ اس کے سامنے کر دیتی۔ وہ کچھ نہ کچھ اُس کے ڈبے میں ڈال دیتا۔
میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ بہت جلد میرے ڈبے میں بھی لوگ کچھ نہ کچھ ڈالنے لگے۔ چند گھنٹوں بعد جب میرا آدھا ڈبہ بھر گیا تو میں مَنے کے پاس پہنچا اور اپنے ڈبے کو زمین پر رکھ کر اُس پر بیٹھ گیا۔
تھک گئے ؟ مَنے نے کہا۔
ذرا آرام لے رہا ہوں۔ میں نے اُس سے کہا۔ کیا ہم لوگ کہیں چل کر کافی نہیں پی سکتے ؟
نہیں۔ اس نے کہا۔ ہمیں کام کرنا ہے۔
مجھے بتاؤ۔ میں نے کہا۔ متعصدی کام کے اس ادارے میں تمہارا مقام اونچا ہی ہوگا۔ شاید تم یہ بھی فیصلہ کرنے کی مجاز ہو کہ بہلی کا پیٹروں کو کہاں بھیجا جانا چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہے ؟ تمہیں اس طرح کا کام کرنے کی یقیناً ضرورت نہیں۔ یہ تو چھوٹے آدمیوں کا کام ہے۔
مجھے یہ کام پسند ہے۔ اُس نے کہا۔ یہ کام زیادہ مفید و کارآمد ہے۔
وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ایک ایسی لطیف مسکراہٹ جو اس کے چہرے کی سخت لکیروں کو نرمی میں بدل رہی تھی۔
کیا تم جانتی ہو کہ۔ میں نے کہا۔ جب میں تم سے پہلی بار ملا تھا تو تم بالکل اسی طرح نظر آتی تھیں تمہیں یاد ہوگا اس وقت میں تمہاری طرف ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اب دیکھ رہا ہوں۔
تب تو تمہیں چاہیے کہ ہر شخص کی طرف اسی طرح دیکھو۔ اُس نے اپنا ڈبہ اس عورت کے آگے بڑھا دیا جو ارغوانی رنگ کی ہیٹ پہنی ہوئی تھی۔

لیکن کیا تمہیں یاد ہے ؟ میں نے کہا۔

ہاں بالکل۔ اس نے کہا۔ وہ ہاوڑا اسٹیشن کی بات ہے۔ ہے نا۔

وہ فرانٹیر میل سے وہاں پہنچی تھی۔ میرے باپ، تردیب اور میں اسے لینے کے لیے وہاں گئے تھے۔ ہاوڑا جاتے ہوئے میں بہت فکر مند تھا۔ تم اسے کیسے پہچانو گے۔ میں تردیب سے پوچھتا رہا۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیسی ہے۔ تم نے اُسے اس وقت دیکھا جب وہ ننھی بچی تھی۔ لیکن ترد یب کو کوئی فکر نہ تھی۔ میں اُسے کسی طرح پہچان لوں گا۔ اس نے کہا۔ تم ذرا انتظار تو کرو۔

لیکن میں تو فکر مند تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ انھوں نے آپس میں فوٹوز کا تبادلہ کیا ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں ہی اسے پہلے پہچان لوں گا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے اُس کے نام سے متعلق ایک نظریہ قائم کر لیا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ کیوں اس کا نام مہینوں کے نام پر رکھا گیا ہے۔ پھر میں کہیں پڑھا تھا کہ مئی کے مہینے میں انگریزوں کے پاس بٹر کپ کے پھول کھلتے ہیں۔ اس کے بعد کا مرحلہ آسان تھا۔ یہ بات واضح تھی۔ اُسے مئی اس لیے کہا جاتا ہوگا کہ وہ بٹر کپ کی طرح نظر آتی ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں اُسے پہلے پہچان لوں گا۔ میں ہی ان لوگوں میں ایسا تھا کہ تلاش کرنا جانتا تھا۔

جب فرنٹیر میل دھنواں اڑاتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی تو ہم لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ہجوم کا ہجوم ٹرین سے اترا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ ہم لوگوں نے کوئی نصف گھنٹہ انتظار کیا۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ ترد یب کا چہرہ سُرخ ہو چلا تھا۔ وہ روہانسا ہو کر اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ اُسے میں نے ہی پہلے دیکھا۔ وہ سوٹ کیس کو اپنے دونوں پاؤں کے بیچ رکھے ٹی اسٹال پر بڑے صبر سے کھڑی تھی۔ میں سکتہ میں آگیا۔ وہ میری توقع سے بالکل مختلف تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ تب میرے باپ نے بھی اُسے دیکھا اور جواباً اپنا ہاتھ ہلایا۔

اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ سوٹ کیس کو پلیٹ فارم پر رکھ کر اُس نے میرے باپ سے ہاتھ ملایا۔ پھر میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کسی اونچے مقام

پر کھڑی ہو۔ میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی وہ ایسے سکڑ سی گئی کہ لگا اس کی نیلی آنکھیں ہوا میں پانی کے قطروں کی طرح جھونکے کھا رہی ہیں۔

میں مایوس نہیں ہوا۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ بٹر کپ کے پھولوں کی طرح دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ میرے لیے کافی تھا کہ وہ دوسرے ملک سے آئی تھی۔

سیدھا ہوتے ہوئے اس نے میرے سر کے اوپر نگاہ ڈالی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی نظر تردیب پر پڑ چکی ہے۔ میری نگاہیں اس پہ جمی رہیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ تردیپ سے کس طرح ملے گی۔ پہلی نظر میں اس نے تردیب کو پہچانا ہی نہیں۔ اسے دیکھ کر وہ یہی سمجھی کہ وہ ہمارے ساتھ آیا ہوا کوئی شخص ہے اور اسے دیکھ کر اخلاقاً مسکرا رہا ہے۔ پھر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اپنا ہاتھ اٹھا کر تردیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا تم۔۔۔ کیا تم۔۔۔

میں ایک طرف کو کھسک گیا تاکہ میں ان دونوں کا نظارہ اچھی طرح کر سکوں۔

تردیب اس کی طرف ہتر ماتر ماکر اپنا سر ہلا رہا تھا۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس پر الزام نہیں دیتا۔ وہ لمحہ اس قدر دل دوز تھا کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں خود بھی مسکرا نہ سکتا تھا۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ اس وقت ممے نے کیا کہا تھا۔ ایک سلو موشن پکچر کی طرح یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح اس مصروف پلیٹ فارم پر آوازیں گونج کر پھیل رہی تھیں۔ مجھے اس آدمی کا چہرہ یاد ہے جو ٹی اسٹال کے پیچھے کھڑا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ممے تردیپ کی طرف آگے بڑھی۔ اس کے دونوں گالوں کو چوما۔ پلیٹ فارم کے کونے کونے سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ کورس کی شکل میں آوازیں آئیں۔ ونس مور۔ ونس مور! تردیپ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس ناگہانی صورتِ حال نے اسے خاصا پریشان کر دیا ہے۔

اوہ، مجھے معاف کیجئے۔ ممے نے لجا کر کہا۔ یہ جگہ نہیں کہ ایسی حرکت کی جائے۔

نہیں نہیں۔ تردیب ہکلایا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔۔۔

آپ لوگ یہاں کس لیے جمع ہو گئے ہیں؟ میرے باپ نے غصّے سے ان کی طرف ہاتھ اٹھاتے

ہوئے کہا جو ہمارے اطراف اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر نے کا سوٹ کیس اٹھا کر وہ ہمیں اسٹیشن سے باہر لے آئے۔

گھر واپس لوٹتے ہوئے تردیب نے ہمیں بتایا کہ کس طرح اُس کے لندن کے قیام کے زمانے میں مسز پرائس نے اُسے بُلایا تھا۔ ایک صبح وہ باغیچہ میں بیٹھا تھا کہ مسز پرائس نے اُسے بُلا کر کہا کہ وہ ڈرائنگ روم میں جا کر ایک نظر منے کو دیکھ آئے۔ وہاں پہنچ کر اس نے جھولے میں جو دیکھا تو اُس کے پسینے چھوٹ گئے اور جسم کے بال کھڑے ہو گئے۔ وہ چیختے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ وہ ایک کیڑے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کا چہرہ سیاہ چمکیلا ہو گیا ہے اور اس کا دہن کسی سور کی کالی تھوتھنی کی طرح۔

بعد میں انکشاف ہونے پر وہ خوب ہنسا۔ وہ ایک گیس ماسک تھا۔ ایک شیر خوار بچی کا گیس ماسک۔ اگر جرمن بم پھینکیں تو بچی محفوظ رہ سکے۔ لیکن اسے اطمینان اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ ماسک بچی کے چہرہ سے اُٹھا نہ دیا گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نرم و نازک اور گلابی تھی۔

میں نے نظریں چرا کر منے کو دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ منے کو تردیب کی کہانی یاد نہیں آئی۔ وہ اس قدر خوش تھی کہ اس نے یہ بات ٹھیک سے سنی ہی نہیں۔

گاہکوں کے انبوہ کو اِدھر اُدھر گزرتے ہوئے دیکھ کر منے نے منہ بنا کہا۔ آج ہم نے بہت سا کام کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ان بدبختوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی کمائی سے مطمئن دھن دولت کی چکر میں پڑے رہیں۔ اب چلو یہاں سے۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ بتاؤں گی جہاں ہم کافی پی سکتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ تم اپنا روزہ توڑ دوگی؟ میں نے کہا۔

خواہش تو ہو رہی ہے۔ اس نے کہا لیکن میں تھوڑی دیر اسے اور قائم رکھوں گی۔

ہم نے اپنے پوسٹرس لپیٹ دیئے اور ہجوم سے نکل پڑے۔

آخر میں ریجنٹ اسٹریٹ کی ایک گلی میں ہم نے اپنا راستہ پا لیا۔ منے ایک ایسے سانڈ وچس کی دکان پر لے آئی جہاں کشتیوں میں سلاد، بھنی ہوئی مچھلی اور کباب رکھے ہوئے تھے۔ ان سے پرے ڈبل روٹی

اور دوسری کھانے کی اشیا تھیں۔ یہ ایک چھوٹا اور تنگ کمرہ تھا۔ ایک کونے پر کاونٹر تھا جو اپنی سائز سے بہت بڑا نظر آرہا تھا۔ کیونکہ اس کے پیچھے دیوار سے ایک بہت بڑا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں نے دو ایک اونچے اسٹول اُٹھالیے اور ہم لوگ انھیں لے کر کونے میں پہنچے۔ پھر میں کاونٹر کی طرف گیا کہ اپنے لیے سینڈوچ اور کافی حاصل کروں۔ جب میں واپس ہوا تو میں آئینے میں دیکھتی ہوئی چپکے سے ہنس رہی تھی۔

کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا۔

اس نے اپنا سر ہلایا۔ میں اس فضول کہانی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ جب میں چھوٹی تھی تو گیس ماسک میرے منہ پر لگایا گیا تھا۔

اس نے تردیب سے یہ بات نہیں سُنی تھی۔ پھر بھی وہ ہنس رہی تھی کہ یہ ساری باتیں مزاحیہ تھیں۔ وہ تو دن بھر خوفزدہ تھی۔ ٹرین میں بیٹھی بیٹھی۔ جب سے دہلی پہنچی تھی وہ خوفزدہ تھی۔ اسے یاد نہیں کہ اس کے خوف کی اصل وجہ کیا تھی لیکن اسے خوب یاد تھا کہ کسی خوف کی وجہ اس نے اپنے آپ کو ہوٹل کے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ یہ خوف اس وقت سے تھا جب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے آپ کو سوئمنگ پول کی گہرائی میں پایا تھا۔ وہ خوفزدہ تھی کہ وہ بالکل اکیلی تھی۔ وہ جانتی نہ تھی کہ وہ کیا کرے۔ ایک صبح کسی عورت نے جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اس سے پیسے مانگے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر حیرت میں کھڑی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ صرف اتنا ہی کر سکتی تھی کہ اُسے کچھ پیسے دے دے لیکن یہ مسئلے کا کوئی حل نہ تھا۔ یہ ایک بے چارگی تھی۔ اُسے بے چارگی سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ تو کچھ نہ کچھ کرنا جانتی تھی اور اس نے یہی تو کیا تھا۔

اُس نے سوچا تھا کہ پہلے دلّی جائے اور پھر آگرہ۔ تردیب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اُس کے کہنے پر دلّی نہیں آرہی ہے لیکن دلّی پہنچ کر وہ آگرہ جانے کے موقف میں نہ تھی۔ اس نے دلّی ہی میں ہوٹل روم کے کمرے میں اپنے آپ کو مقفل کر لیا تھا اور بستر پر لیٹی سوچنے لگی تھی کہ وہ ہندوستان کیوں آئی۔ کوئی وجہ نہیں لگی۔ کوئی معقول وجہ ہرگز نہیں سوائے اس کے کہ ایک اشتیاق تھا۔ یہ جاننے کا کہ ویسٹ ہمپسٹڈ سے پرے اس دنیا میں کیا ہے۔ اب یہی اشتیاق ایک

ایک ایسے آدمی سے متعلق ہو گیا جسے اس نے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ لیکن خوف میں بستر میں لیٹے ہوئے اسے اپنے اشتیاق کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ یہ اشتیاق آخر تھا کیا؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی ــــ اس نے بہت کوشش کی۔ اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ اشتیاق ابھی باقی ہے یا کبھی کا ختم ہو چکا۔

اس کے بجائے اس نے اپنے آپ کو تردیب کے بارے میں سوچتا ہوا پایا۔ وہ تردیب کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کلکتہ اسٹیشن پر وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن اسٹیشن کے بارے میں اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ لندن میں بڈنگٹن کی طرح کوئی مصروف جگہ ہوگی تصوّر ہی تصوّر میں اس نے تردیب کو کسی بک اسٹال پر اس کا انتظار کرتا ہوا پایا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چل کر اس کے پاس جا رہی ہے۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے۔ شرما شرما کر یہ کہتے ہوئے کہ تم کیسے ہو۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ اس کی طرف جھکتی اور چبھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوا۔ وہ بالکل ویسا ہی دکھائی دیا جیسا وہ اس تصویر میں تھا جسے تردیب نے اسے بھیجی تھی۔ بوجھل، اداس، نیم پاگل سا۔ پھر وہ سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔ ایسے آدمی سے تنہا ملنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک اجنبی ملک میں۔ تب ہی اس نے میرے باپ کے نام ٹیلی گرام بھیجا تھا کہ وہ اُسے لینے کے لیے اسٹیشن آئے۔

لیکن جب اس نے تردیب کو دیکھا تو وہ میرے پیچھے کھڑا خود اُس کی طرف دیکھ رہا تھا وہ اس تصویر سے مختلف تھا۔ ایک گنوار سا لونڈا لیکن جس کے اندر ایک خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ وہ مضحکہ خیز بھی لگا کیونکہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں موٹے موٹے عدسوں کے اندر متحیر اور پریشان جھانک رہی تھیں۔ وہ اپنی بانہیں تردیب پر ڈالے بغیر نہ رہ سکی۔ تب اسے ایک طرح کا سکون ملا۔ وہ اپنے ہندوستان آنے کا سبب جان گئی۔ وہ خوش تھی۔ اس کا اشتیاق بے سبب نہ تھا۔

مہمانوں کا کمرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ کشادہ ہوادار کمرہ جہاں سے باغ دکھائی دیتا تھا۔ میں بستر پر بیٹھا اُسے دیکھا کرتا۔ وہ خطوط لکھ رہی ہوتی۔ میوزک سن رہی ہوتی۔ بال سنوار رہی ہوتی۔ مجھے اس کی خوشبو پسند آئی تھی۔ شامپو کی، صابن کی اور دوسری چیزوں کی بھی۔ عطریات کی نہیں۔ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے عطریات کی خوشبو سے نفرت

تھی۔ اس کے برخلاف کوئی ٹھنڈک پہنچانے والی۔ ہوا کے جھکڑ کی طرح۔
میں نے جھک کر اس کا سوئٹر اٹھالیا اور اسے سونگھنے لگا۔ وہ چونک کر پیچھے کی طرف ہٹی۔

اب یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے کہا۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟
میں سوچ رہا ہوں کہ آیا تم پہلے ہی کی طرح خوشبو بکھیر سکتی ہو؟
کیا ایسا ہے؟
ہاں۔ میں نے کہا۔ تم بکھیرتی ہو۔ ایک طرح کی خوشبو!
اس نے اپنے سوئٹر کو سونگھ کر منہ بنا لیا۔ پسینہ، گندہ پسینہ؟
نہیں کچھ اور ہے۔
ٹھیک ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ مجھے قبول ہے۔ یہ لیونڈر کا پانی ہے۔

بعد میں جب میں سن بلوغ کو پہنچا تو یہ سوچ کر مجھے شرم آئی تھی کہ میں اُسے کیوں گھورتا رہا تھا۔ اُس کی بو سونگھنے کی کوشش کیوں کرتا تھا۔ اس کے کپڑوں کو اپنی انگلیوں سے کیوں مسلتا تھا۔ میں شرم سے پیچ و تاب کھاتا رہا کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ پھر میں اپنے آپ سے حجت کرنے لگ جاتا۔ ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا کہ اسے کوئی احتراض نہ ہو۔ وہ خود تو مجھے اور میری حرکتوں کو پسند کرنے لگ گئی تھی۔ یا شاید اس نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ شاید میں اُس کے لیے ایک ایسے بچّے کی طرح تھا جو مریخ سے ٹپکا تھا۔ پھر بھی میں شرمندہ رہتا کیونکہ یہ بات سچی نہیں تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ وہ بڑی ہمدرد تھی۔ اتنی رحم دل کہ اُس نے اپنے آپ کو میری آنکھوں سے دیکھنا قبول کر لیا تھا۔

ایک شام ہم لوگ چہل قدمی کے لیے نکلے۔ میں اُسے سدرن ایونیو کے راستے گول پارک لے گیا۔ اس غرض سے کہ میں اسے ہمارا اپنا فلیٹ دکھانا چاہتا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ میں مونٹو کو ایک سبق سکھانا چاہتا تھا۔ اسکول میں میں نے اُسے ہمارے مہمان کے بارے میں بتایا تھا۔ لیکن اُس نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔

راستے میں ہم لوگ ایک روئی دُھنکنے والے سے ملے۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنا کام کر رہا تھا۔

وہ اپنی لکڑی کے فریم پر تانت کی مدد سے روئی دُھنک رہا تھا۔ اس کی شکل ایک تیر کمان کی سی تھی۔ پھر وہ روئی کو غلافوں میں ٹھونسنے لگا۔ اُسے دیکھ کر مئے یکلخت فٹ پاتھ پر ٹھہر گئی۔ یہ کیا آواز ہے؟ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ میں ابھی جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے کہا۔ یہ ایک طرح کا بربط ہے۔ ہے نا! میں نہیں جانتا تھا کہ بربط کیا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے خیال میں اس قدر گم تھی کہ میں نے صرف اپنا سر ہلایا اور وہ خوش ہو گئی اس خیال سے کہ اُس کا اندازہ صحیح نکلا۔ اس نے کہا۔ او وہ پلیز۔ کیا تم اُس سے فرمائش کر سکتے ہو کہ تھوڑی دیر اُسے بجائے۔

میرے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اُس کے نزدیک جا کر میں نے اس سے خواہش کی۔ یہ غیر ملکی خاتون تمہارے اوزار کی آواز سننا چاہتی ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اُس کا تار چھیڑ سکتے ہو؟ وہ پہلے ہچکچایا لیکن اس نے ہاں کر دی اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تانت کو چھیڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک ہم اُس کی گہری لیکن اُکتا دینے والی آواز سنتے رہے۔ مئے کچھ مایوس ہوئی۔ یہ ایک مخصوص آواز ہے۔ اُس نے کہا۔ ہے نا؟ پھر اُس نے روئی دھنکنے والے کو پانچ کی نوٹ دی اور وہ شخص تانت بجاتا ہوا خوشی خوشی چلا گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ اُس دن ہم لوگ گول پارک گئے یا نہیں اس بات کا خیال نہ رہا کہ مجھے مانٹو سے شرط جیتنی ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو روئی دھنکنے والا وہاں موجود تھا اور اس نے ہمارے والدین کو وہ واقعہ سنایا تھا۔ میرے باپ اتنا ہنسے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔ میں منہ بنا بنا کر ان کی طرف دیکھتا رہا تاکہ وہ چپ ہو جائیں لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ راز فاش ہو چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ حقیقت جان کر مئے مجھ سے خفا ہو جائے گی اور شاید مجھے اپنے کمرے میں بیٹھنے بھی نہ دے گی لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے صرف اپنی نیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ تو تم نے میرے ساتھ ایک چھوٹا سا مزاق کیا تھا۔ تم نے کیا تھا نا؟

وہ میرا دل جیت گئی۔

برسوں بعد جب میں نے اِلا سے مئے اور اُس روئی دُھنکنے والے آدمی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ وہ ایسا ہی کر سکتی ہے۔ لندن میں رہ کر بھی غافلوں جیسی

حرکت کرے گی جیسے کسی گاؤں کی ایک امیر عورت چھٹی منانے کے لیے شہر آئی ہو۔

لیکن میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ میرے لیے مِنے کی کشش کا سبب اُس کی معصومیت تھی جو اُسے دوسری تمام عورتوں سے الگ کر دیتی ہے۔ وہ معصومیت لاعلمی کی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک ایسی سچائی تھی جو دنیاداری سے مبرّا تھی۔ ایسی معصومیت مَیں نے کسی دوسری عورت میں نہیں پائی۔ میں جن عورتوں سے واقف تھا ان میں میری ماں اور رشتے کی تمام عورتیں تھیں۔ اُن میں اگر کوئی تنہاپسند تھی تو وہ دنیاوی بھید بھاؤ اور جھوٹ سچ سے بچی نہ تھی۔ بڑے بڑے کنبوں کی یہی تو دین ہوتی ہے کہ ان میں کی عورت جس قدر تنہا ہو گی اتنی ہی دنیادار ہو گی۔

مِنے جب بھی تردیب کے ساتھ باہر جاتی تو اکثر اور خاص طور پر اس کی آمد کے ابتدائی دنوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی۔ ایک صبح مِنے کی خواہش پر تردیب ہم لوگوں کو اپنی پرانی اسٹوڈ بیکر میں لے کر وکٹوریہ میموریل چلا۔ مِنے کا اصرار تھا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ مجھے تو خوشی ہوئی۔ وکٹوریہ میموریل کا چاٹ اور آئس کریم مجھے بے حد پسند تھے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو میں نے اپنی اگلی سیٹ کی طرف جھک کر مِنے کو ان تمام اچھی چیزوں کے بارے میں بتایا جنھیں وہ کھانا پسند کرے گی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر جب ہم لوور سرکیولر روڈ اور چورانگی کے پاس پہنچے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لے۔ اُس نے ویسے ہی کیا اور جب سنگ مرمر کی وہ شاندار عمارت ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ مِنے: دیکھو کہ سامنے کیا ہے؟

مجھے یاد ہے کہ اُس نے چلاّ کر کہا تھا۔ میرے خدا— اس قدر اونچی آواز میں کہ تردیب نے اچانک بریک لگائے اور اسٹوڈ بیکر اس سیاہ بلند قامت مجسمے کے قدموں کے پاس رک گئی جو کوئین وکٹوریہ کا تھا۔ ہم لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے رہے جیسے کسی دربار میں بادشاہوں کو دیکھا جاتا ہے۔ میں اور تردیب ہنسنے لگے کیونکہ اس مجسمے کے نام پر ہی اِلاّ کی ماں کا نام رکھا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں کو آرام کرسی پر رکھ کر اسی طرح بیٹھتی تھی جس طرح یہ مجسمہ دکھائی دے رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنا پرانا لطیفہ دہرانا چاہا لیکن بات پوری طرح بن نہ پائی۔ تب مَیں نے اور تردیب نے دیکھا کہ مِنے نے اپنے چہرے کا رُخ بدل دیا ہے اور اب وہ مجسمے یا عمارت کی طرف دیکھ نہیں رہی ہے۔

مِٹے نے دیکھ لیا کہ ہماری نظریں کس کی طرف ہیں۔ اُس نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا۔ آؤ اسس میموریل کو ذرا اچھی طرح دیکھ لیں۔

ہم لوگ زنگ زدہ لوہے کی گیٹ تک گئے اور چھوٹے سے گنبد اور چھوٹے میناروں کو دیکھنے لگے۔ تب اس نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور کہا۔ یہاں سے چلیں پلیز — میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

پھر وہ پھیکی پڑ گئی تھی۔ تردیب نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالا۔ واپس کار تک لے جاکر اس میں بٹھایا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں مجھ سے کہا کہ میں پیچھے کار میں بیٹھ جاؤں۔ بے خیالی میں اس کے ہاتھ کار کی چابی تک گئے لیکن پھر اس نے اپنے ہاتھ کو نیچے ہٹا لیا اور مِٹے کو دیکھنے کے لیے پلٹا۔ وہ اپنی سیٹ میں دھنسی ہوئی خالی خالی نظروں سے ڈیاش بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور مِٹے کو ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ مِنے۔ اُس نے چپکے سے کہا۔ کیا بات ہے مِٹے؟

وہ اپنے دانتوں کو بھینچے بیٹھی تھی۔ اس نے تردیب کی طرف نہیں دیکھا۔

کیا بات ہے؟ مجھ سے کہو۔

یہاں نہیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ یہ تشدد ہے۔ یہ عریانیت ہے۔

تردیب ہنسا اور اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ تردیب کو دیکھ رہی تھی۔

نہیں۔ ایسا نہیں۔ اس نے کہا۔ یہ ہمارا کھنڈر ہے۔ ہمیں اُسی کی تو تلاش ہے۔

تب وہ ہنسنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ تردیب کے ہاتھ میں دیا۔ اس کی ہتھیلی کو اوپر کیا اور اُس کا ایک پیار لیا۔

ہاں۔ اُس نے کہا۔ میرے ہاتھ میں پانچ روپے کی نوٹ تھماتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پسند کی چیز خرید کر کھاؤں — وہ لوگ وہیں پر میرا انتظار کریں گے۔

مجھے یہ واقعہ کیوں یاد رہا جب کہ میں دوسری بہت ساری چیزیں بھول چکا ہوں۔ میں

نہیں جاتا۔ شاید اس لیے کہ جس انداز سے انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ تردیب نے جس طرح سے اسے چھوا تھا۔ اور مٹے نے جس طرح سے اس کی ہتھیلی کا پیار لیا تھا۔ جس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور سوچتے رہے کہ اُن کا یہ راز میں کبھی سمجھ نہ پاؤں گا۔ میں حسد کرنے لگا۔ بے انتہا حسد جو ایک بچّہ ہی کر سکتا کیونکہ تردیب کو سمجھنے کا حق صرف میرا تھا اور اس دن وکٹوریہ میموریل کے پاس مٹے نے مجھ سے یہ حق چھین لیا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مٹے نے اس دن سے میرے لیے اُس جگہ کی کیفیت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ میں پھر اس مقام پر خوشی خوشی کبھی نہ گیا۔ میرے لیے اس جگہ کے معنی و مطلب بدل چکے تھے۔ اب میں اس کے معنی کی گہرائی تک پہنچ نہ سکا باوجود اس یقین کے کہ میرے بغیر بھی اس جگہ کا مفہوم قائم تھا۔ لیکن میرے لیے وہ جگہ آسیب زدہ ہوگئی۔ اس کے بعد میں وہاں جب بھی گیا مجھے تردیب کی نرم نرم آواز ہمیشہ سنائی دی جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ یہ ہمارا کھنڈر ہے۔ یہیں تو ہم ملتے ہیں۔ ان الفاظ کو سن کر مجھے تعجب ہوتا۔ وہ میرے کانوں میں گونجتے رہتے۔ میں اُنھیں نکالنے کی کوشش کرتا۔ ان کا مفہوم جاننے کی کوشش کرتا۔ مجھے ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ لیکن ایک دن دوپہر کی وہ گھڑی آئی جب سیانڈ وجیس کی دکان پر مٹے نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے مجھ سے اُس خط کا ذکر کیا تھا۔ وہی خط جو کھنڈروں کے بارے میں تھا۔

ایک دن میرے باپ نے طے کیا کہ مٹے کو ڈائمنڈ ہاربر دیکھنا چاہیے۔ چونکہ وہ خود مصروف تھے اس لیے انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ تردیب اتوار کے دن ہم دونوں کو کار میں لے کر جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ تردیب نے کیا کہا تھا لیکن اُس نے مجھے ساتھ لینے سے انکار کیا تھا۔

میں چلوں گا۔ میں نے ضد کی۔ تم میرے بغیر نہیں جا سکتے۔

تب مٹے نے مجھے گود میں اُٹھا لیا۔ مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ تم ہمارے ساتھ آؤ گے۔ میں تمہارے بغیر جانے کا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی۔

تردیب کے لیے راضی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اتوار کی صبح وہ ہم لوگوں کو لینے آیا تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے اور بے کلی کا عالم تھا۔

گھر سے نکل کر وہ غلط راستے پر مڑ گیا اور اُسے خیال تک نہ آیا۔ اگر میں اس کی اس غلطی کی نشاندہی نہ کرتا تو ہم ڈلہوزی پہنچ چکے ہوتے۔

دیکھو تو۔ مٹے نے مجھے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔ تمہارے بغیر ہم یہاں پہنچ نہ سکتے تھے۔

بہت جلد ہم لوگ شہر سے باہر نکل آئے۔ اتنی ہی تیزی سے جتنی تیزی سے کہ وہ کھٹارا اسٹوڈبیکر دوڑ سکی۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے دوستوں کے بارے میں بڑبڑ جاری رکھی۔ مانٹو اور دوسرے دوستوں اور اپنے اسکول کے بارے میں کہتا رہا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ مٹے نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا تاکہ اُس کے بالوں کو ہوا کے تھپیڑے لگیں۔ وہ ہرے ہرے خوبصورت دھان کے کھیتوں کی تعریف کرتی رہی جن سے ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ تردیب اپنی پرانی اسٹوڈبیکر کے ہینڈل کو ادھر اُدھر گھمانے میں مصروف رہا۔

ہم لوگ کوئی گھنٹہ بھر اسی طرح ڈرائیو کرتے رہے۔ ہمیں دور سڑک کے بیچوں بیچ کوئی چیز پڑی ہوئی دکھائی دی۔ تردیب بہت تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اُس نے اسی تیزی سے گاڑی موڑی۔ مٹے اور میں نے کار سے اپنے اپنے سر باہر نکالے۔ سڑک پر زخمی جانور کی طرح کوئی چیز پڑی تھی۔ اس سے خون رِس رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ کتا ہے! یہ ابھی زندہ ہے!

اوہ؟ تردیب نے کار کے شیشہ کے اندر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے دیکھا ہی نہ تھا۔

اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔

کیا تم اپنی کار نہیں روکو گے؟ مٹے نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔

کار کو روکوں؟ تردیب نے بیزاری کا اظہار کیا۔ کیوں؟ اس سے کیا حاصل؟

وہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے چِلّا کر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ہمیں اس کی خاطر پیچھے جانا پڑے گا۔

کیوں؟ تردیب نے کہا۔ ہم اُس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔

کار کی رفتار اور بھی بڑھ گئی۔

مٹے نے اپنے ہاتھ باندھ لیے اور اپنے آپ کو سیٹ کے اندر دھنسا لیا۔ جیسا کہ وہ سوچا تا

چاہتی ہو۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں پلٹ کر تردیب سے کہا۔ اگر تم فوراً ہی کار کو نہ روکو گے تو میں اس کا دروازہ کھولنے والی ہوں۔

تردیب نے کاندھے ہلائے۔ کار کو روکا۔ اسے پلٹایا۔

تمہارا شکریہ۔ مئے نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا لیکن اس نے مئے کا ہاتھ پرے ہٹا دیا اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

اُس نے کار کو کُتے سے قریب لاکر بے ڈھنگے پن سے روک دیا۔ مئے کار سے کود کر سڑک کے اُس پار بھاگی۔ تردیب اور میں اُس کے پیچھے ہو لیے۔

کُتا ایک پہلو پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کا پچھلا حصہ اس طرح مڑا ہوا تھا کہ زاویہ قائمہ بن گیا تھا۔ وہ بسور رہا تھا اور اُس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ شاید کسی کار سے ٹکرا گیا تھا۔

مئے رنجیدہ ہو گئی۔ اس نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ ایک کپکپاہٹ اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اُسے دوبارہ دیکھنے کے لیے اپنے پر جبر کیا۔ پھر وہ کار تک آئی۔ چمڑے کا وہ بیگ لیا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اُسے کھول کر اُس میں سے ایک چھوٹا چاقو اور ایک رومال نکالا۔

یہ کیا کرنے والی ہے؟ میں نے گھبرا کر تردیب سے پوچھا۔ اسے روکو۔ اُسے کچھ مت کرنے دو۔

تردیب نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ تم یہ نہیں کر سکتیں۔ بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ ابھی کاٹ سکتا ہے۔ وہ دیوانہ کُتا ہو سکتا ہے۔

مئے نے ایک بھی لفظ کہے بغیر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اُس نے رومال کھولا۔ اسے اپنے بائیں ہاتھ پر باندھا اور کُتے کی طرف جُھکی۔ کُتا اس کی طرف جھپٹنے لگا اور اپنے سر کو بار بار اُٹھانے لگا۔ اس کی آنکھیں خون آلود اور وحشت زدہ تھیں۔ مئے نے رومال سے لپٹا ہوا ہاتھ اس کی تھوتھنی کی طرف کیا۔ کُتا اچانک اسے اپنے کف آلود جبڑوں میں لینا چاہا۔ مئے نے بر وقت اپنا ہاتھ ہٹا لیا پھر بھی اس کا رومال کُتے کے دانت لگنے سے پھٹ گیا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس کے چہرے پر پسینہ بہنے لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گر پڑی اور تیزی سے سانس لینے لگی۔ کُتے کا سر سڑک

پر ٹنگ گیا لیکن اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دھیرے دھیرے غرا رہا تھا۔ اس قدر کمزور آواز میں کہ شاید اُسے غراہٹ نہ کہہ سکیں۔ حلق کے اندر ہی اندر۔

مجھے اسے رہنے دو۔ تردیب نے التجا کی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

مجھے نے تردیب کی طرف انداز غلط سے دیکھا ــ کیا تم تھوڑی سی مدد نہیں کر سکتے۔ اُس نے کہا۔ صرف تم زبانی ہمدردی جتاتے ہو۔ تم کبھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتے۔

تردیب اُٹھا اور گھوم کر اس طرح کھڑا ہوا کہ کتا اسے دیکھ نہ سکے۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کی طرف کیکڑے کی طرح ہاتھ بڑھایا۔ کتے نے اس کی آواز سنی اور اپنے سر کو موڑنا چاہا لیکن ایسا نہ کر سکا اور غر غر کرنے لگا۔ تب تردیب نے جھپٹ کر اُس کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اسے زمین سے دبائے رکھا۔ کتے نے وحشت سے اپنے اگلے دونوں پاؤں مارنے شروع کیے لیکن وہ کمزور ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے پکڑے رہنے میں تردیب کو زیادہ مشکل نہ ہوئی۔

مجھے آگے کی طرف جھکی اور اپنے بائیں ہاتھ سے جس پر میٹا رومال لپٹا ہوا تھا ہوا تھا کتے کے منہ کو پکڑے رہی۔ تب اس نے اپنے انگوٹھے سے چاقو کا بٹن دبایا۔ اُس کی آری نکل آئی۔ اُسے اس نے کتے کی شہ رگ پر رکھا اور اُسے گھمایا۔ آری کتے کے بالوں اور چمڑے پر سے گزر کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ کتے کا اگلا جسم شدت سے پاؤں مارنے لگا۔ مجھے نے آخری بار طاقت سے چاقو چلایا۔ خون کا ایک فوارہ کتے کی گردن سے پھوٹ نکلا۔ اس کا جسم آخری بار تڑپا اور تڑپ ٹھنڈا پڑ گیا۔

مجھے نے چاقو کو زمین پر پھینک دیا اور کھڑی ہو گئی۔ اس کی کلائیوں اور بازوؤں پر خون جم گیا تھا۔ وہاں سے وہ دھان کے کھیتوں کے منڈیروں پر سے گزرتی ہوئی گہرے پانی کے پاس جا کر رکی۔ اپنے ہاتھوں کو پانی کی گہرائی میں ڈبو دیا۔ وہ دیر تک وہاں اپنے ہاتھوں اور چہرے کو دھوتی رہی۔

جب وہ کار کے قریب آئی تو تردیب اور میں پہلے ہی سے اُس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی آکر ہمارے ساتھ بیٹھ گئی اور کار کے دروازے آہستہ سے بند کیے اور کہا۔ اس زحمت

کی معافی چاہتی ہوں۔ وہ چاق و چوبند دکھائی دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُس کی آواز بھاری تھی۔ تردیب نے کار اسٹارٹ کرنا چاہی۔ مٹے نے کہا۔ چلو سب کچھ ہو چکا ہے۔ اب تمہیں جہاں چلنا ہے چلو۔

مٹے کی طرف دیکھے بغیر تردیب نے کہا۔ تمہیں معافی چاہنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے ٹھیک ہی کیا۔

اُس نے کار کی چابی گھمائی۔ جب اسٹارٹنگ کی آواز آنے لگی تو اُس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔

کیا؟ یہی کہ میں آئندہ کسی مرتے ہوئے کتّے کو اس طرح نہیں ماروں گی۔ مٹے نے کہا۔

نہیں یہ نہیں۔ تردیب نے مسکرا کر کہا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے اپنی انگلیاں گردن پر پھیریں بالکل اُسی طرح جس طرح نائی استرا گھماتا ہے۔

وعدہ کرو۔ اس نے کہا اگر مجھے ایسی کوئی ضرورت پڑے تو تم میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرو گی۔

میرا خیال ہے کہ اس پر وہ ہنسی تھی۔ کچھ تکلف کے ساتھ۔

جب ہم کلکتہ واپس پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ تردیب نے مجھے ہماری گیٹ تک چھوڑا اور کہا۔ اپنے ماں باپ سے کہو کہ مٹے اور میں شام کا کھانا باہر کھانے جا رہے ہیں۔ واپسی پر میں اُسے گھر پہنچا دوں گا۔

مجھے بھی اب کافی کی ضرورت ہے۔ مٹے نے کہا۔ آج میں نے بہت فاقہ کیا ہے۔

وہ کاؤنٹر تک گئی اور کافی اور سینڈوچ لے کر واپس آئی۔

کافی ہاتھ میں لیے آئینے میں میری طرف دیکھتی ہوئی اس نے کہا۔ اُس دن ہم لوگ اُن کے قدیم مکان میں گئے تھے۔

سیدھے ہم اس کے کمرے میں گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ایک ساتھ تنہا تھے۔ وہ بلب جلا کر بیچ کمرے میں اکیلا کھڑا رہا اور مجھے تکتا رہا۔ وہ کمرہ عجیب خانقاہوں جیسا تھا۔ صرف ایک معمولی سا بلب۔ کچھ کتابیں اور اخبارات فرش پر بکھرے ہوئے۔ چند چٹائیاں اور تکیے ایک۔

دوسرے پر پڑے ہوئے۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ کسی معقول آدمی کے رہنے کی جگہ ہے۔

وہ کھڑکی کی طرف گیا اور اُس کے کُنڈے کو آگے پیچھے کرتا ہوا بڑی مشکل سے اُسے کھول پایا۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔ اس وقت وہ ایک بچّے جیسا لگ رہا تھا۔ چھوٹا سا منحنی تیکھا چہرہ، چھوٹے چھوٹے بال اور سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اُس نے اپنا چہرہ غمگین بنا کر کچھ باتیں کہیں کہ کس طرح وہ ایک طویل عرصے سے امید لیے بیٹھا ہے...

مجھے کچھ کہنا نہیں تھا۔ میں اس کے قریب گئی اور اپنے ہاتھ اس کے کندھے پر ڈالے۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اور پھر ہم لوگ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ تکلیف دہ حد تک شرمیلا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید محبت یا کسی ایسی ہی بات کا موضوع اور میں اسے کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔ میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اور تم ؟ میں نے سوال کیا۔

اس نے پلاسٹک کا چمچہ اپنی پیالی سے نکالا۔ اسے اپنی انگلیوں میں گھمایا اور کہا۔

تم میرے بارے میں پوچھ رہے ہو ؟

کیا تم اس سے محبت کرتی تھیں ؟

میں نہیں جانتی۔ اس نے کہا۔ تم کیوں توقع رکھتے ہو کہ مجھے معلوم تھا۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ایسا سوال تم مجھ سے کرو۔ تم سمجھتے نہیں کہ گذشتہ سترہ سال سے یہ سوال میں اپنے آپ سے کر رہی ہوں ؟ میں نہیں جانتی کہ ان میں سے کوئی بھی بات صحیح ہے۔ آیا میں اس سے محبت بھی کرتی تھی یا محض اس کا احساس شکست میرے لیے کشش کا باعث تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ جو کچھ ہوا وہ میری غلطی تھی۔ یا اگر میں اُس سے محبت کرتی تو میرا سلوک مختلف ہوتا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس وقت سے میں کیا کر رہی ہوں۔ سوائے اس غلطی سے نمٹتے رہنے کے۔ میں نہیں جانتی، میں بالکل نہیں جانتی ـــ میں کیسے جان سکتی تھی جب کہ وقت بہت تنگ تھا اور سوالات بے شمار ؛ میں نو خیز تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

اور اس کے بعد ؟ میں نے پوچھا۔

وہ پلٹ کر کھڑی ہو گئی تاکہ میں شیشے میں بھی اس کی آنکھیں دیکھ نہ سکوں۔

جو کچھ مجھے یاد ہے۔ اُس نے کہا صرف یہ کہ وہ کہتا رہا۔ تم میری محبت ہو تم میری ہو، سچی محبت، سمندر پار کی میری محبت۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا۔ یہ باتیں وہ مجھ سے چپکے سے کہتا رہا۔

اس نے پوسٹرس اور بیسوں کے ڈبے ایک ساتھ کر لیے اور جانے لیے کھڑی ہو گئی۔ جو سینڈوچ بچ رہا تھا اسے میری طرف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ یہ تم کھا لو۔ اسے کاغذ میں لپیٹ کر گھر لے جا سکتے ہو۔ اب مجھے جانا چاہیے ۔۔۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے ایک میٹنگ میں بھی جانا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سارے پیسے بھی داخل کر دینے ہیں

ہم لوگ کافی بار سے نکل کر گلی میں چل پڑے۔ خاموش ہی خاموش۔ اب مجھ سے وہ بے تعلق ہو رہی تھی۔ مجھ سے بد دل۔ جوں ہی ہم ریجنٹ اسٹریٹ کے ہجوم میں گھر گئے وہ مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اُسے زیر زمین اسٹیشن پر جا پکڑا۔

وہ مجھے دیکھنے کے لیے رکی۔ بیسوں کے ڈبے اس کے ہاتھوں میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اور جب پوسٹرس تیزی سے گزرتے ہوئے راہ گیروں کی پسلیوں میں گھسنے لگے تو وہ کھسیانی مسکراہٹ سے اُن سے معافی مانگ لیتی۔ وہ کچھ فکر مند اور بے چین لگ رہی تھی لیکن جب اس کی نیلی آنکھوں پر روشنی پڑی اور جب ہوائیں اس کے بھورے مہین بالوں کو اُس کے چہرے پر بکھیرنے لگیں تو وہ یکدم جوان عورت لگی۔ اسی مئے کی طرح جسے میں نے برسوں قبل ہاوڑا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا۔

جب میں اُس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا۔ میں نے تمہیں یہ ساری باتیں کیوں بتائیں۔ اس سے پہلے تو میں نے کسی اور کو نہیں بتائی تھیں۔

بالکل ٹھیک۔ میں نے کہا۔ کوئی اور شخص ایسا تھا ہی نہیں جس سے تم کہتیں۔ کوئی دوسرا شخص تردیب کو اس قدر نہیں جانتا تھا جتنا میں اسے جانتا رہا۔

ایک پوسٹر اُس کی باہوں سے پھسل کر نیچے گرا تو میں نے اسے اُٹھا کر پھر سے اُس کی بغل میں رکھ دیا۔

ٹھیک۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ اب مجھے جانا چاہیے۔ مجھے دیر ہو گئی۔ شاید میٹنگ شروع ہو چکی ہو گی۔

ٹھہرو۔ میں نے کہا۔ پہلے میں اپنا حلق تو صاف کر لوں۔

مئے۔ میں نے پھر کہا۔ رات کے واقعے کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔

وہ سب ٹھیک ہے۔ اس نے ترشی سے کہا۔ میں اس وقت گھبرا گئی تھی۔ ورنہ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ کوئی شخص میرے بارے میں اس طرح سوچ سکتا ہے۔

سچ؟ میں نے کہا۔

ہاں سچ۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس نے میرا ہاتھ موڑا۔ ڈبوں سے پیسوں کی جھنجھناہٹ کی آواز آئی — اور پھر وہ چلی گئی۔

دلّی واپس ہونے سے چند دن قبل میں لیمنگٹن روڈ گیا تاکہ آخری بار مسز پرائس کو خدا حافظ کہہ سکوں۔

اسی ہفتہ ایک دن سویرے سویرے میرے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

ایک بار پھر وہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ برطانیہ کے گرما کے موسم کا مختصر وقفہ گزر چکا تھا۔ فلہام کے گنجان علاقے کے اس مکان میں جہاں میرا کمرہ تھا کڑاکے کی سردی تھی۔ دستک کی آواز لحافوں کی کئی تہوں سے گزر کر آئی۔ میں نے اسے نظر انداز کیا اور بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ میرا چھوٹا سا گیس کا چولہا کبھی کا بجھ چکا تھا۔ اس کا حساب پانچ پنس کے سکے پر تھا۔ وہ اسٹاک رات کے تین بجے ہی ختم ہو چکا تھا۔ باہر دستک جاری تھی۔ آخر کار مجھے اپنے بستر سے اٹھنا پڑا۔ کمرہ ریفریجریٹر کی طرح سرد تھا۔ نہایت ٹھنڈا۔ کمرے کی کھڑکی برف کی وجہ سے آئس ٹرے

کی طرح بند تھی۔ میں نے اپنا اوور کوٹ پہنا اور کپکپاتے ہوئے دروازے تک پہنچا۔

وہ کیری تھی، امریکن لڑکی جو میرے پہلو کے کمرے میں رہتی تھی۔ وہ سیٹل سے آئی ہوئی آرٹ کی طالبہ تھی۔ اُسے روم اور پیرس جانے سے قبل چھ مہینے لندن میں گزارنے تھے۔ چند ہی مہینوں میں ہم ایک دوسرے کے قریبی دوست ہو چکے تھے گو اسی مکان میں کوئی آدھی درجن اور لوگ بھی رہتے تھے۔ ان میں طالب علم اور سیاح تھے۔ اکثر لوگ تنہا پسند تھے۔ بعض کا قیام ایک مہینے سے زیادہ کا تھا۔ جولائی کی ایک رات ہمارے کمروں کے ورانڈے پر کیری کی اور میری ملاقات ہوئی تھی۔ ہماری منزل کے تیسرے کمرے میں کسی چیز کے پیٹنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کمرے سے نکل پڑے۔ اس کمرے میں اسکانڈینیویا کا ایک نوجوان حال میں منتقل ہوا تھا۔ وہ ڈاڑھی رکھتا تھا۔ آواز لوگوں کے آرام میں مخل تھی۔ تکلیف دہ بھی تھی۔ ایسی جیسے لکڑیوں کو تڑکایا جاتا ہو۔ بیچ بیچ میں ہلکی سسکیوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلانے کا مشورہ دیا لیکن کیری تجھ پر مسکرائی اور دانشمندانہ انداز سے اپنا سر ہلایا۔ پھر کہا۔ ڈاکٹر کو بلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ لوگ تو شاید اپنے آپ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں نے پھر وہی آواز سنی۔ اب یقین ہو گیا کہ کیری سچ کہہ رہی ہے۔ پھر ہم لوگ رسوئی گھر میں گئے جہاں اس نے چائے بنائی۔ میری آنکھوں کو دیکھ کر پہلے تو اُس نے مجھے ایک چینی باشندہ سمجھا۔ پھر جب میں نے اسے بتایا کہ میں ہندوستانی ہوں تو اُسے کچھ مایوسی ہوئی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چینیوں سے اُسے اس لیے دلچسپی ہے کہ وہ دودھ نہیں پیتے۔ اُس نے کہیں پڑھا تھا۔ خود کیری کے لیے دودھ اور دودھ سے بنی اشیاء کا پرہیز تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ دودھ مجھے بھی پسند نہیں ــــ اور ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن گئے۔

اس وقت کیری نیوٹرال سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ میرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے وہ جوگنگ بھی کر رہی تھی۔ اُس کی بندھی ہوئی مٹھیاں اُس کے رانوں کو مس کر رہی تھیں۔ وہ مجھ سے کوئی آٹھ انچ لمبی تھی۔ جسم بھی مضبوط۔ اس کا جبڑا چوڑا اور چہرہ کشادہ تھا۔

اُس نے کہا۔ نیچے تمہارے لیے آیا ہے کال کسی خاتون کا۔ وہ میرے اوورکوٹ کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی۔ میرے خدا۔ اس نے کہا۔ کیسے بے چارے آدمی ہو۔ تمہیں سچ مچ سردی لگ رہی ہے

۔۔۔ ہے نا؟ اُس نے اپنی جوگنگ روک کر گلے لگایا۔

تمہیں ایسے غیر مہذب ملک میں رہنا نہیں چاہیے۔ اس نے کہا۔ تمہیں کسی ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں سنٹرل ہیٹنگ اور گرم پانی کا انتظام ہو جیسے اسٹیٹس میں ہے۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے کہا اور جب وہ رسوئی گھر کی طرف چلی تو میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہمارے لئے فون دیوار سے لٹکایا گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک عجیب و غریب لفظ سکھایا۔ شاشیڈر۔ اور اب جب بھی میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مجھے سینتل کے قریب سمندر کے کنارے شاشے کہتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ٹیلی فون پر اِلاہتی۔ وہ زِنک کے ساتھ ہی مون سے تین ماہ قبل لوٹ کر پہلی بار مجھے فون کر رہی تھی۔

تمہیں اتنا وقت کیوں لگا؟ اس نے کہا

میں وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے میری بات کاٹی۔

سنو۔ آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا۔ کل میں نیند سے اٹھی تو مجھے احساس ہوا کہ تمہیں ایک ہفتے کے اندر اپنے وطن واپس ہونا ہے۔ ہے کہ نہیں؟

ہاں۔ میں نے کہا۔ پھر میں نے آنے اور جانے سے متعلق کچھ اور جملے کہے۔

اس کی فکر نہ کرو۔ اس نے سانس روکے بغیر کہا۔ تم نے اپنا سامان باندھ لیا ہوگا۔ سارا انتظام کر لیا ہے نا۔ تمہیں سینکڑوں کام کرنے ہوں گے۔ میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتی ہوں؟

اس کی باتوں میں عجلت تھی۔ میں نے کہا۔ تمہیں پچھلے کئی دنوں سے یہ معلوم ہے کہ میں اگلے ہفتے واپس ہو رہا ہوں۔ اس وقت اِس عجلت کی کیا ضرورت تھی۔

یہ سچ ہے۔ اُس نے اعتراف کیا۔ میرا خیال ہے میں واقف ہوں۔ لیکن میں نے اس کے بارے میں نہیں سوچا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ کل نیند سے بیدار ہوئی تو یاد آیا اور اگر خود میں وطن واپس ہونے والی ہوتی تو سب سے پہلے یہی خیال آتا کہ مجھے کیا کیا کرنا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی میں بوکھلا گئی اور فوراً تمہیں فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن تم گھر پر نہیں تھے۔ تب میں نے سوچا کہ آج صبح ہی صبح تمہیں فون کر لوں۔

میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ ان معدودے چند لمحات میں جب اس کی خود محویت کے بادل چھٹتے تو دوسروں کی زندگی کی ناگہانی ضروریات کی جھلکیاں اُسے میسّر ہوتیں۔ تب وہ ایک لمحے کے لیے ان کی شدّت کو ایسے ہی محسوس کرتی جیسے وہ اپنے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دن صبح تک کے ناشتے کی خرابی ہوئی ہوگی۔ میرے وطن کو واپسی کی پریشانی میں اُس نے آملیٹ میں بجائے نمک کے شکر ڈال دی ہوگی۔

کیا تم نے بُک کلب کے اپنے تمام بل ادا کر دیئے؟ اس نے کہا۔ اور ہاں وہ تمام کریڈٹ کارڈ بھی۔ میں پھر ہنسا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میرے پاس کریڈٹ کارڈ نہیں تھے۔

کیا تمہارا سامان شپ کر دیا گیا؟ اس نے کہا۔ سارا انتظام ہو گیا کہ نہیں۔ مجھے موقع دو کہ میں تمہاری مدد کروں۔ میں اس طرح کے کاموں سے اچھی طرح واقف ہوں۔

میرے پاس کچھ زیادہ لگیج نہیں ہے۔ میں نے کہا۔

اوہ! اُس نے کہا تو پھر میرے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

اس وقت میں اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹیلی فون ہوگا۔ وہ اپنی تھوڑی کھجا رہی ہوگی۔ آزردہ چہرہ۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ جیسے میں اُس سے انتقام لے رہا تھا۔ آخری بار لندن سے رخصت ہوتے ہوئے میں اُسے اپنے کسی کام میں شامل نہیں کر رہا تھا۔

تب میں نے کہا۔ ہاں، ایک ایسا کام ہے جس میں تم میری مدد کر سکتی ہو۔ میں مسز پرائس کو خدا حافظ کہنے کے لیے اُن کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ شاید اُس میں وہ میری مدد کر سکتی ہے۔ کیا یقین کہ وہ میرے ساتھ وہاں آنا پسند کرے گی کہ نہیں۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں۔ وہ مسز پرائس سے بات کرے گی اور مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دے گی۔

بات اس طرح طے ہوئی کہ میرے انگلینڈ کے قیام کے آخری شنبہ کے دن جو بھائی ایر ویز کے جہاز سے دہلی روانہ ہونے کے تین دن قبل پڑتا تھا میں اور الا دونوں مسز پرائس کے پاس چائے پر جائیں گے۔ جب ٹیلی فون پر بات ہوئی تو میں نے کہا کہ کیا نک ہمارے ساتھ نہیں

آ ئے گا۔ اِلا نے اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ بعد میں لیمنگٹن روڈ آئے گا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہم سے وہیں پر ملے گا۔ پھر اُس نے قہقہہ لگایا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کے شوہر کے پہنچنے سے قبل تھوڑی دیر وہ میرے ساتھ اکیلی رہے۔

تو پھر ہم لوگ کہاں ملیں گے ؟ میں نے پوچھا۔ اور جب وہ ملنے کی جگہ کے بارے میں سوچ رہی تھی تو میں نے فوراً کہا۔ ٹرافلگار اسکیور جہاں سینٹ مارٹن۔ ان۔ دی۔ فیلڈ کی سیڑھیاں ہیں ۔۔ کیسی رہے گی۔ وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔ کوئی بھی شخص یہی سوچے گا کہ تم کسی فرسودہ فلم کی اسکرپٹ لکھنے میں لگے ہو۔ اس نے کہا پھر خود ہی راضی ہو گئی اور بولی ۔۔ ٹھیک ہے۔ میں تم سے وہیں پر ملوں گی۔

میں مقرّرہ وقت سے پہلے ہی سینٹ۔ ان۔ دی۔ فیلڈ پر پہنچ گیا۔ میں ایک آخری نظر ٹرافلگار اسکیور پر دیر تک ڈالنا چاہتا تھا۔ ایسی نظر جو میری آنکھوں میں برس ہا برس قائم رہے۔ میں نے سیڑھیوں کے پاس ایک صاف ستھری جگہ تلاش کی جہاں سیّاح زیادہ نہ آتے ہوں۔ میں جوں ہی وہاں پہنچ کر بیٹھ گیا۔ آسمان سے بادل چھٹ گئے اور سنہری دھوپ کی شعاعیں اسکیور پر ایسی پڑنے لگیں جیسے انھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی ہو۔ اُدھر ٹرافک بھی بکھرنے لگی۔ سیّاح لوگ اسکیور کے چاروں طرف پھیل کر اپنے اپنے سینڈوِچیس کھانے لگے اور ان کبوتروں کو بھی کھلانے لگے جو نلسن کے کھمبوں پر جھنڈ کی شکل میں بیٹھے تھے اور جن کے ستونوں پر شیر ببر کے نقشے اُترے ہوئے تھے۔ یہ کبوتر فوّاروں کی مُنڈیروں پر بھی ناچ رہے تھے۔ اسی لمحہ میں نے اِلا کو وہاں آتے دیکھا۔ نیشنل گیلری کے پاس سے گذرتے ہوئے وہ ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک موٹا اور لانگ کوٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس پر طلائی بوٹے تھے اور اُس کا کالر نمایاں تھا۔ دُھندلی دُھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ سیاہ دھبّے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ کی طرف دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔ لوگوں سے بے نیاز جو اُسے گھور رہے تھے۔ میں ایک کھمبے کے پیچھے ہو گیا۔ تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے وہ میری نگاہوں سے بے خبر اُسی طرح چلتی رہے اور میں اُسے دیکھتا رہوں۔ زیبرا کراسنگ کے پاس وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکی۔ کچھ سوچ کر اور کچھ یاد کرتے ہوئے اُس نے اپنے کوٹ کی جیب

سے دھوپ کی عینک نکالی اور اپنے چہرے پر لگا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اُس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں کے اندر تھے۔ اُس نے چرچ کی طرف دیکھا۔ نظریں مجھ پر پڑیں تو وہ مسکرائی۔ پاس ہی کھڑے ہوئے سیاحوں نے حیرت سے لمبی سانس کھینچی۔ اُس کے حسن میں ایک غیر روایتی اور انوکھی کشش تھی۔ میں ہنستے لگا۔ ہنستا ہوا سٹریٹ عیول تک گیا۔ اُسے اچھی طرح دیکھنے کے لیے میں نے اس کے اپنے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا پھر اُس کے چہرے سے عینک اُتار لی۔

اس نے عینک چھین لینے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے اُس کی آنکھیں دیکھ لیں۔ وہ سوجی ہوئی اور سرخ تھیں جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔

کیا ہوا۔ میں پریشان ہو کر پکار اٹھا۔ الا کیا معاملہ ہے؟

کچھ نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا۔ ہمیں دیر ہو گئی ہے۔ اب فوراً یہاں سے چلو۔

ہم لوگوں کو لیمنگٹن روڈ تک پہنچنے میں پون گھنٹہ لگا۔ مسز برالنس نے دروازہ کھولا۔ وہ گذشتہ کے مقابلے میں اور بھی دبلی اور کمزور لگ رہی تھی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی اور الا چائے بنانے کے لیے رسوئی گھر میں داخل ہوئی۔ ہمارے لیے سینڈوچیں رکھے ہوئے تھے۔ ان پر ایک گیلا کپڑا اڑھا نک دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کیک بھی تھا جسے خود اس نے بنایا تھا۔ بڑے سائز کا کارنیشن کیک۔ جو اُس کے باپ کو بہت پسند تھا۔ ہمارے لیے کیک کاٹتی ہوئی اس نے مجھ سے مایا دیبی اور صاحب کے بارے میں پوچھا۔ کہنے کے لیے میرے پاس کچھ زیادہ نہ تھا سوائے اس کے کہ مایا دیبی اپنے پرانے رائے [illegible] والے مکان میں اکیلی ہی منتقل ہو رہی ہے کیونکہ صاحب کا ارادہ نہیں کہ کلکتے سے دور ہو کر کلب کی مصروفیات چھوڑ دیں۔ وہ غور سے سنتی رہی لیکن بہت جلد وہ تھک گئی۔ اُس کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح وہ ہمارے ساتھ مزید نصف گھنٹہ گزارے۔ جب الا چائے لے کر آئی تو اس نے بھی محسوس کر لیا۔ جوں ہی ہم لوگوں نے چائے پی اس نے تکلف سے پوچھا کہ کیا میں گھر اور باغیچہ کو ایک آخری بار دیکھنا چاہوں گا۔ میں نے ہاں کی اور مسز برالنس نے اسے غنیمت جان کر ہم لوگوں کو خدا حافظ کہا۔

ہال میں پہنچ کر اِلا نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں تھوڑی دیر کے لیے باغیچے میں جانا پسند کروں گا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

نہیں۔ میں نے کہا۔ ہم لوگ نیچے سیلر میں جائیں گے۔

ایک لفظ بھی کہے بغیر ہم لوگ ہال سے نکلے۔ سیلر کا دروازہ کھولا اور بتی جلائی۔ کیمپ کی پلنگیں ویسے ہی پڑی تھیں جیسے ہم لوگوں نے کرسمس کے موقع پر چھوڑا تھا۔ واپس ہوتے ہوئے انھیں فولڈ کرنا ہم لوگ بھول گئے تھے۔ اب ان پر گرد کی مہین تہہ جم گئی تھی۔ اِلا پاؤں پر پاؤں ڈالے ان میں سے ایک پر بیٹھ گئی اور مجھے اپنے بازو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تو اب ہم یہاں ہیں ـــ لوٹ کر رائے بازار میں۔ اس نے کہا۔

میں پلنگ کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور سیلر کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پرانے صندوقوں اور سوٹ کیسوں کے ڈھیر کی طرف۔ پیپر بکس اور باغیچے میں کام کرنے کے اوزار بھی ویسے ہی کونے میں پڑے تھے۔ ان اوزار پر زنگ چڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں چاروں طرف دیکھنے لگا روشن بلب کی اس روشنی میں یہ بات مجھ پر عیاں ہوگئی کہ وہاں رکھی ہوئی تمام کی تمام اشیاء اپنے وجود کی معنویت کھو چکی ہیں۔ اب ان کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا ہے۔ جیسے وہ دیواروں سے لگا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ایک آسیب تھا جسے وقت نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ نو سال کا زوبی آسیب بن کر کیمپ کی پلنگ پر اُسی طرح بیٹھا ہے جیسے اب میں بیٹھا ہوں۔ اُس کے چھوٹے سے چہرے پر تناؤ ہے اور وہ بموں کی آواز سن رہا ہے۔ شب خوں مارنے والا آسیب جو ایک کونے میں چھپا بیٹھا ہے۔ اُس کی دوائیوں کے ڈبّے کے پاس۔ اپنے مضبوط دانتوں کی نکر کرتے ہوئے۔ آٹھ سال کی اِلا کا بھی آسیب ہے اور وہ رائے بازار کی اُس میز کے نیچے بیٹھا ہے جس کے نیچے کبھی ہم اپنے بچپن میں بیٹھتے تھے۔ میرے چاروں طرف یہ سارے احباب ہیں۔ آخر کار ہم سب یہی ہو گئے ہیں۔ وقت اور فاصلے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر آسیب بن جاتے ہیں۔ یہی تو آسیب ہے۔ وقت سے باہر ایک وجود۔

اِلا جب میری طرف پلٹ کر اپنے چہرے کو میری باہوں میں چھپا لیتی ہے تو یہ وہی آٹھ سال

کی اِلا ہے۔ اور میں بھی اسی عمر میں پہنچ گیا ہوں۔ ہم دونوں رائے بازار کے ٹیبل کے نیچے بیٹھے ہیں۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے کاندھے پر ڈال دیئے ہیں۔ وہ رو رہی ہے کیونکہ نِک پرائس اور مگدا کی کہانی وہ مجھے سُنا چکی ہے۔ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے اس کی وجہ میں سمجھ نہیں سکتا۔ تہہ خانے کے اندر دوسری طرف دروازہ کھلنے کی آواز ہمیں سنائی دے گئی ہے۔ میں اس سے منت کرتا ہوں کہ وہ رونا بند کردے ورنہ لوگ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔ اسے کتنا ہی سمجھاتا ہوں لیکن وہ اپنی سسکیوں کو روک نہیں سکتی۔ پھر دروازہ بند ہو جاتا ہے پر اسرار طور پر۔ خوف سے وہ رونا بند کر دیتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں اس لیے کہ کمرے میں ایک تیسرا شخص بھی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔

وہ تردیب ہی تھا۔ ہماری طرف دیکھتا اور مسکراتا ہوا پوچھ رہا ہے کہ ہم اس گر دکے درمیان کیا کر رہے ہیں۔ میں کہنے لگتا ہوں کہ ہم ہوزس کھیلنے لگے ہیں۔ ہم رائے بازار میں نہیں۔ ہم لندن میں ہیں۔ لیمنگٹن روڈ پر مسز پرائس کے مکان میں۔ میں اسے گیلاس کے درخت سے ہوکر باغیچے کی طرف نکلنے کا راستہ بتاتا ہوں۔ اُسے مشکل ہو رہی ہے لیکن جب میں اُسے سامنے کے دروازے سے گزار کر ڈرائنگ روم میں لاتا ہوں تو وہ اچھی طرح جان جاتا ہے کہ کہاں جانا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ اس گھر کے چپّہ چپّہ سے واقف ہے کیونکہ اُس نے اپنا بچپن یہاں گزارا ہے۔

اب ہم ڈرائنگ روم میں ہیں تو اِلا پھر رو رہی ہے۔ کیا بات ہے؟ تردیب پوچھتا ہے۔ لیکن وہ جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی بند مٹھیوں سے آنکھیں رگڑ رہی ہے۔ سسکیاں لے رہی ہے۔ تب تردیب نے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہے پھر وہ ہمیں باغیچے میں لے آیا ہے اور لوگ گیلاس کے درخت کے نیچے گھاس پر الکت پلکت مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ پھر پوچھتا ہے۔ اِلا اب تو بتاؤ کہ تم کیوں رو رہی ہو۔

اِلا اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے اور میں اسے دلاسا دیتے ہوئے کہتا ہوں کہ اُس کے رونے کا سبب اُس کی گڑیا اور نِک پرائس کا وہ واقعہ ہے۔ پھر میں وہ واقعہ جسے اِلا نے مجھے سنایا تھا من وعن تردیب کو سنا دیتا ہوں۔ اِلا پھر بھی رو رہی ہے۔ میں اسے چپ کرانے کی کوشش

کرتا ہوں کہ وہ نادان لڑکیوں کی طرح نہ روئے۔ وہ تو صرف کہانی تھی۔ ایک چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی۔ وہ پھر بھی رو رہی تھی جیسے وہ خود کہانی میں زندہ موجود تھی۔

تردیب ہنستا ہے اور میری گردن کو جھنجھوڑ کر مجھ سے کہتا ہے کہ میں اِلاسے بازپُرس نہ کروں۔ ہر شخص کسی نہ کسی کہانی میں جیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری دادی، میرا باپ، اس کا باپ، لینن، آئنسٹائن اور بہت سے نام جو میں نے پہلے کبھی سنے نہیں تھے ۔ وہ تمام کے تمام کہانیوں میں زندہ ہیں کیونکہ کہانیاں اسی لیے ہیں کہ اُن میں ہم زندہ ہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ کس کہانی کو ہم منتخب کرتے ہیں...

لیکن اس سے اِلا کی تشفی نہیں ہوتی۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔

تردیب اپنا سر کھجاتا ہے۔ وہ کیا کرے؛ پھر وہ اچانک کہتا ہے۔ ٹھیک ۔ چلو ۔ اندر چلو شیلٹر کے نیچے۔ ہم سب لوگ ایک کہانی سنیں گے۔ ایک عمدہ کہانی ۔ دنیا کی سب سے اچھی کہانی۔

کہانی کے نام ہی سے اِلا چونک جاتی ہے۔ اور وہ اپنا رونا بند کر دیتی ہے۔ ہم لوگ اُٹھ کر سامنے دروازے کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ راستے میں وہ کہتا ہے۔ آج کا دن بڑا خاص دن ہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۰ء۔ اس کی نویں سالگرہ کا دن۔ اسی لیے ہم لوگوں کو ایک کہانی سنائی جائے گی۔ سالگرہ کے تحفے کے طور پر۔ یہ کہانی اس نے اسنائپ سے سنی تھی۔ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اسے انعام دیا جائے گا۔ کہانی کے سنانے کا اور یہ اُن تمام چکروں کا بدل تھا جو اس نے ویسٹ اینڈ لین پر ڈنٹے سیو، سنٹوجن اور اینٹی کے ہاتھے کی گولیاں خریدنے کی تلاش میں کیے تھے۔ اس دن کی خاص اہمیت کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگلے ہفتے وہ لوگ روانہ والے ہیں۔ تردیب، اس کا باپ اور اس کی ماں۔ وہ لوگ کلکتہ واپس ہونے والے ہیں۔ اس کا باپ بالکل صحت مند ہو چکا ہے۔ تردیب لندن چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن اس کا بس نہیں چل سکتا۔ وہ سب کے سب اگلے ہفتے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے گھر جا رہے ہیں۔

لیکن آج کی رات تو اسنائپ کی کہانی سننی ہے۔ اسنائپ نے کہا ہے کہ یہ ایک طویل اور مزے دار کہانی ہے۔ بڑی دلچسپ۔ قرونِ وسطیٰ کے دور کی انگریزی کہانی۔ اسنائپ اس کہانی

سے اچھی طرح واقف ہے کیونکہ وہ اپنے طالب علموں کو اکثر یہ کہانی سناتا رہا ہے۔
تردیب سمجھتا ہے کہ ایک کہانی اُس کو صلے میں ملے گی۔ آج کا دن اس کے لیے اچھا نہیں ہے۔
آج صبح صبح اس کی ماں نے کہا کہ وہ کسی بھی صورت گھر سے باہر نہ نکلے لیکن جب اس نے پوچھا کہ کیوں تو ماں نے جواب دینا پسند نہ کیا۔ اس نے کہا۔ میں جو کہتی ہوں وہی کرو۔ یہ غیر معقول بات تھی۔ وہ کیسے توقع کرتی ہے کہ تردیب کچھ کیے بغیر ہی دن بھر گھر میں پڑا رہے خاص طور سے جب کہ باہر اتنا کچھ ہو رہا ہے۔
ناشتہ کے فوراً بعد اس کی ماں جب اس کے باپ کو شیو کرنے میں مدد دینے کے لیے گئی تو وہ سامنے کے دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ پھر وہ وکٹ گیٹ سے ہوتا ہوا بائیں طرف مڑ کر الوانیلے گارڈن کے کرکٹ فیلڈ کی طرف دوڑا۔ اگر آپ پولیلین کی جانب سے بولنگ کریں تو جہاں اسکیبور آگے پڑتا ہے وہاں ایک توپ رکھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک آدمی نے جو دیو ہیکل طیارہ شکن توپ چلانے پر مامور تھا وہ فوج کے ساتھ ہندوستان میں رہ چکا تھا اسی لیے چند تامل لفظ بول سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور تردیب کو یہ بھی نہیں بتاتا تھا کہ اس نے وہ الفاظ کس طرح سیکھے۔ اس نے تردیب سے کہا کہ جب تک وہ لوہے کی ہری رنگ کی گن کو پالش نہیں کر لیتا وہ چپ رہے۔ گن تو ایک درخت کے برابر تھی۔ دو راتوں قبل ہی گن کے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ایک بم گرایا گیا تھا اور وہاں کرکٹ فیلڈ پر پندرہ فٹ کا گہرا گڑھا بن چکا تھا۔ اگر آپ پولیلین کی طرف منہ کیے بیٹنگ کر رہے ہوتے تو وہ ایکسٹرا کاور کی جگہ ہوتا۔
وہ باڑھ کے نیچے سے رینگتا ہوا آگے بڑھا اور پھر کھیت میں سے بھاگتا ہوا اُس گڑھے تک پہنچا۔ ایک رات میں وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ بارش کی وجہ اس میں پانی بھر گیا۔ مٹی کے تودے جو ادھر اُدھر بکھر گئے تھے وہ کیچڑ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ اپنے گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا گڑھے کے کنارے تک پہنچا۔ وہ حیرت میں پڑ گیا۔ گڑھے میں گرنے سے بچ گیا۔ پھر وہ ہنسا۔ خود اپنا چہرہ پانی کے اندر سے اُسے گھور رہا تھا۔
تب اُس نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ سڑک پر دوڑتی ہوئی اور اس کا نام لیتی ہوئی۔

اس نے جواب دیا اور فوراً افسوس کرنے لگا کہ ماں اُس کے پیچھے ہی بھاگ کر آ رہی ہے۔ وہ اس کا کان پکڑ کر واپس گھر لے گئی ہے۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا ہے پھر پلٹ کر زوردار طمانچہ مارا ہے۔ اس نے کبھی طمانچہ نہیں مارا تھا۔ اُسے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رو بھی نہ سکا۔

مسز پرائس نے طمانچے کی آواز سنی۔ رسوئی گھر سے وہ دوڑ کر آئی۔ اوہ! بے چارہ تردیب اُسے اپنا گال سہلاتا ہوا دیکھ کر اُس نے کہا اور اُسے رسوئی گھر میں لے گئی۔ پھر اس کے کان میں کہا۔ تمہاری ماں یہ نہیں چاہتی تھی وہ تو آج کے سفر کے بارے میں فکر مند ہے۔

آج تو سفر پہ روانہ ہونا ہے۔ اس کی ماں کو اسی کی فکر ہے۔ مسز پرائس نے اس سے کہا۔ اس کے علاوہ اسے ٹافی کے ڈبّوں کی بڑی فکر ہے۔ ٹافی کے ڈبّے؟ تردیب نے سوال کیا۔ ہاں مسز پرائس نے وضاحت کی۔ ٹافی کے ڈبّے۔

ایک دن قبل اسنائپ نے انھیں ہوائی حملوں سے بچنے کے اعلان کے بارے میں بتایا تھا۔ اعلان تھا۔ دشمن ہوائی جہاز سے ٹافی کے ڈبّے پھینک رہا ہے۔ ان کی شکل ہینڈ بیگ جیسی ہے اور رنگوں کے ڈیزائین بھی ہیں۔ ان پر لکھا ہے۔ لیانس اسٹارٹڈ ٹافی اور اسکاچ کمپنی کا نام ہے۔ جے۔ لیانس اینڈ کو

اگر اے آر پی کی نوٹس نہ ہوتی تو اس پر وہ لوگ زیادہ دھیان بھی نہ دیتے۔ اسنائپ جیسا آدمی جسے افواہوں پر یقین نہیں تھا اے آر پی کے اعلان پر متوجہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بچّوں کے متاثر ہو جانے سے ساری آبادی کی ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ مایا دیبی کو پکا یقین تھا کہ تردیب کوئی نہ کوئی ٹافی ٹن لے کر ہی لوٹے گا۔ لیمنگٹن روڈ پر وہی ایک بچہ تو رہ گیا تھا۔ باقی تمام بچّوں کو لندن سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ اُسے فکر لاحق تھی کہ کسی نہ کسی ٹافی ٹن پر تردیب کی نظر پڑ جائے گی اس لیے کہ وہ دن دن بھر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ اسی لیے اس نے تردیب کو ان ڈبّوں کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہ تھا ورنہ وہ ان کی تلاش میں پہلے ہی نکل پڑتا۔

جب اسنائپ کام پر باہر گیا تو تردیب کو گھر ہی پر رہنا پڑا تھا۔ اس کا باپ ڈاکٹر کی تلاش

میں گیز ہاسپٹل گیا ہوا تھا۔ تب ہی مسز پرائس بھی رات کا کھانا حاصل کرنے کی تلاش میں باہر چلی گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد وہ تھکی تھکائی گھر واپس ہوئی۔ وہ کسی طرح ایک ڈبل روٹی، درجن انڈے ایک پونڈ بکرے کی کلیجی حاصل کر سکی تھی۔ اپنی تھیلی کچن ٹیبل پر رکھ کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ تمہاری سالگرہ کا ڈنر کس طرح تیار کریں۔ یہ چیزیں تو ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی کافی نہیں ہیں۔

کوئی بات نہیں۔ تردیب نے کہا۔ اسنائپ مجھے سالگرہ پر ایک نایاب تحفہ دے رہے ہیں۔ مسز پرائس نہیں جانتی تھی کہ وہ تحفہ کیا ہے۔ تب تردیب نے بتایا کہ اسنائپ نے اسے ایک کہانی سنانے کا وعدہ کیا ہے۔

وہ تو تب ہوگا جب تردیب کو سالگرہ کا ڈنر اور دوسرے تحفے مل جائیں گے۔ مسز پرائس نے نعمت خانہ ٹٹول کر کچھ اور چیزیں نکالیں اور کسی طرح سب کے لیے عمدہ کھانا تیار کر دیا۔ ڈیڈ پر آج کے لیے گوبی کا ابلا ہوا پتہ نہیں ہے) اور ایک کارنیشن کیک بھی (اسنائپ نے کہا موم بتیاں دکھائی نہیں دیتیں)۔ پھر اُسے اپنے ماں باپ کی طرف سے ایک جیکٹ اور ایک شرٹ ملا۔ مسز پرائس نے تانبے کے فریم کا بنا ہوا قدیم اوپرا عدسیہ دیا تاکہ وہ ہوائی جہازوں کو اُڑتا ہوا دیکھ سکے۔ اسنائپ نے اُسے برتھومیو کا ایک نیا اٹلس بھی دیا۔ اس طرح کہانی کا وقت آنے سے پہلے ہی اُس کی خوشی کا سامان کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے تحفوں کو دیکھ کر ابھی خوش ہو ہی رہا تھا اور لوگ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ہوشیار کا سائرن سنائی دیا۔

جوں ہی انھوں نے پہلے ہوائی جہاز کی آواز سنی انھیں محسوس ہو گیا کہ آنے والی رات بڑی خوفناک ہوگی۔ ہوائی جہازوں کے انجنوں کی ایک ساتھ آوازیں۔ اُن کا گھروں پر منڈلانا انھیں اندیشوں کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کے فوراً بعد الوانلے گارڈن کے پاس نصب کی ہوئی توپ چلنے لگی۔ اور ساتھ ہی دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں اور ٹیبل پر رکھے ہوئے کپ کھڑکھڑانے لگے۔ اسنائپ فوراً ان سب کو لے کر سیلر میں گیا۔ منے اس کی گود میں تھی اور وہ لوگ بستروں پر بیٹھے ہوئے آئیل لیمپس کی روشنی میں چھت کی طرف دیکھنے لگے اور سوچنے لگے

کہ ہوائی حملے کب ختم ہوں گے۔ قریب ہی کہیں ایک زوردار دھماکہ ہوا جس نے سیلر کے فرش کو دہلا کر رکھ دیا اور آئیل لیمپس گرتے گرتے بچے۔ منے رونے لگی۔ تردیب کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کب سے منے کو گود میں لیے ہوئے ہے۔ اُسے رونا نہیں آیا بلکہ اس نے اسنائپ کو یاد دلایا۔ اسنائپ پلیز وہ کہانی جس کا تم نے وعدہ کیا تھا؟

کیسی کہانی؟

میں اپنے چاروں طرف اس سیلر میں گھرے ہوئے آسیبوں کے چہروں پر وہ کہانی پڑھ رہا ہوں۔ وہ کہانی اسنائپ نے تردیب کو سنائی تھی اور تردیب نے اِلا کو رائے بازار میں وہی کہانی سنائی تھی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تین سال بعد میں منے کو لے کر رائے بازار کے مکان گیا ہوں۔ وہ واقعہ ہے ایک دن قبل کا جب وہ میری دادی اور تردیب کو لے کر ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ اُسی پرانے مکان کے تہہ خانے میں میں اسے لے کر جا رہا ہوں وہ ٹیبل اُسے بتا رہا ہوں جس کے نیچے میں اور اِلا بیٹھے تھے جہاں اُس نے پہلی بار نِک کا تعارف مجھ سے کروایا تھا۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ کس طرح اُس دن لگا کی کہانی سنا کر اِلا روئی تھی۔ میرے کاندھے پر سر رکھے رو ہی رہی تھی کہ تردیب کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اِلا کیوں رو رہی ہے۔ میں اسے اِلا کے رونے کا سبب بتا دیتا ہوں۔ تردیب اسے روکنے کے لیے لیمنگٹن روڈ کے اس مکان میں رینگ کر داخل ہوتا ہے اور وہ کہانی سناتا ہے جو کہانی کہ اس نے کبھی اسنائپ سے سنی تھی۔

کون سی کہانی؟ منے نے کہا۔ میں نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یاد نہیں آئی — لیکن بعد میں کلکتہ واپس ہو کر تردیب کے بالی گونجے پیلیس والے مکان میں تردیب نے جب مجھ سے پوچھا کہ میں نے رائے بازار والے مکان میں منے کو کیا چیز دکھائی تو میں نے جواب دیا تھا: میں اُسے اُس تہہ خانے میں لے گیا تھا۔ کیا تم جانتے ہو وہ کہاں...

جہاں میں نے اِلا کو روتے ہوئے پایا تھا اور تم اس کے بازو بیٹھے تھے۔ اس نے کہا۔

اور اس کے رونے کو روکنے کے لیے تم نے ایک کہانی سنائی تھی۔ یاد آیا؟

وہ کہانی کیا تھی منے نے پوچھا۔ میں سننا چاہتی ہوں۔ مجھ سے کہو۔

ترددیب چٹائی پر الکٹ پلکٹ مار کر بیٹھ گیا۔

وہ بڑی عجیب غمگین کہانی ہے۔ اُس نے کہا۔ اور جب وہ کہانی سنانے لگا تو میں ہوائی حملوں کو بالکل بھول گیا۔

یہ کہاں ہوا تھا؟ کون سا ملک۔ میں نے پوچھا۔

آہ! ترددیب نے کہا۔ یہی تو گھپلا ہے۔ دیکھو تو۔ ہر جگہ ہوا ہے۔ تم جس مقام کو چاہو لے لو۔ یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ یورپ کی دلچسپ کہانی۔ اسنائپ نے کہا۔ جب یورپ ایک سہانا مقام تھا۔ ایسا مقام جس کی سرحدیں تھیں نہ جس میں ممالک۔ یہ ایک جرمن کہانی تھی۔ جرمنی کی زبان میں شمال میں نارڈک کہلاتی تھی، فرانس میں فرانسیسی، ویلس میں ویلش، کارنیوال میں کارنیش۔ یہ کہانی ہے ایک ہیرو کی جس کا نام تھا ترستان۔ ایک غمگین کہانی۔ ایک ایسے آدمی کی جس کا کوئی ملک ہی نہ تھا۔ جو ایک ایسی عورت کی محبت میں گرفتار تھا جو سمندر پار رہتی تھی۔

اور میں نے دوبارہ اس سیلر میں اُسی کی آواز سنی جب کہ اِلاکیمپ بڈ پر میرے بازو بیٹھے رو رہی تھی۔ زور زور سے رو رہی تھی۔ میں نے پہلے کبھی اُسے اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سسکیوں سے اس کا سارا جسم اُتھل پتھل ہو گیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے رومال ہی میں اُلٹیاں کر دے گی۔

میں نے اسے ایک ہاتھ سے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ ٹرافلگار اسکیور میں جیسے ہی میں نے اسے دیکھا تھا مجھے خیال ہوا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ اس بات کی منتظر تھی کہ میں اس کا سبب پوچھوں۔ لیکن میں پوچھنا نہ چاہتا تھا۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں ایسی کوئی ہمدردی جتانا نہیں چاہتا تھا جو میرے دل میں نہ تھا۔

اس کا رونا رُکے تھوڑی دیر ہوئی تھی پھر بھی اس کا سر میرے سینے سے لگا ہی تھا۔ وہ ہچکیاں لینے لگی تھی اور بات کرنے کے لائق نہ تھی۔

میں معافی چاہتی ہوں۔ آخر کار اس نے کہا۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔

میں خاموش ہی رہا۔

اس کا سبب نِک ہے۔ اس نے کہا۔
میں نے کہا۔ کہتی جاؤ۔ اس نے کیا کیا ہے؟ تمہارے لیے گلاب کے پھول خریدنا بھول گیا۔
یا اس نے تمہارے لیے صبح کی چائے نہیں بنائی۔
تم حرامی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی تم نے ہمت کیسے کی؟
کہتی جاؤ۔ بات مکمل کر ڈالو۔ جو کچھ ہوا تم مجھے بتاؤ گی۔ کیا تم کسی دوپہر غیر متوقع اپنے گھر واپس ہوئیں اور اپنے بستر پر اسے کسی دوسری عورت کے ساتھ سوتے پایا؟
پہلے تو حواس باختہ ہو کر وہ میری طرف دیکھی پھر مڑ کر اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔
میں سوچ بھی نہیں سکی تھی۔ اس نے کہا۔ کہ میں اِلا دتّا چودھری ایک آزاد منش و آزاد خیال عورت کسی ایسے حالات میں زندگی گزار سکتی ہوں جہاں آنے والے واقعات کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی جیسے ٹیلی ویژن کے خراب سیریل میں بعض وقت چھیڑ خوانی ہوتی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ لیکن وہ تم ہو۔ تم کم و بیش ٹھیک ہی کہتے ہو۔ تم نے اسے ٹی۔ وی پر دیکھ لیا ہے۔ کم و بیش یہی سب کچھ ہوا ہے۔
ہنی مون کے بعد افریقہ سے واپس ہو کر ایک دوپہر اس نے نِک کو گھر پر فون کیا۔ اسے خود اپنے آفس میں رہ کر نِک سے دور رہنے کا شدید احساس تھا۔ سارا سارا دن اس کی آواز، اس کی خوشبو، ان سب سے وہ محروم تھی۔ لیکن اس نے اُصول بنا لیا تھا کہ وہ بار بار گھر پر فون نہیں کرے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر محسوس کرے کہ وہ حد سے زیادہ اس پر اپنا قبضہ جتانا چاہتی ہے۔
لیکن اس دوپہر اس نے اپنا اصول توڑا۔ آفس کے دوسرے لوگ جب تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تو اس نے فون اٹھایا اور یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ابھی کسی کام پر نہ لگا تھا اور یہ کہ وہ گھر پر ہی ہوا کرتا تھا، خود اس نے بھی یہی کہا تھا۔ گھنٹی تھوڑی دیر بجتی رہی اور جب وہ فون رکھ دینے کو تھی اُسے کسی عورت کا جواب سنائی دیا تیزی سے سانس لیتی ہوئی آواز جیسے وہ کسی سے گتھم گتھا ہو کر آئی ہو ــــ آواز آئی ــــ آلو ــــ لہجہ فرانسیسی تھا۔ اِلا سکتے میں پڑ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ کیا میں نِک پرائس سے بات کر سکتی ہوں۔ وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے کسی

بنک منیجر سے اپائنٹمنٹ لینے کے لیے اُس کے سکریٹری سے بات کر رہی ہو۔ دوسری طرف آواز کھل کھل ہنسنے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔ کی ون۔ بول رہیو پلیز؟

اُن کی بیوی۔ الا نے جواب دیا اور فون پٹک دیا۔

میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اوہ! الامتی بے چاری۔ میں نے کہا۔ آخر تمہارے کرتوت رنگ لانے لگے۔

کاش ایسا ہی ہوتا۔ اپنے تھکے ماندے سر کو ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔ کاش میں اپنے آپ سے کہہ سکتی۔ میں ایسا کیوں کرتی رہی۔ اس کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ تم ایسا سمجھ نہ سکے۔ جب ہم کالج میں تھے تو تمہیں شاک پہنچانے کے لیے میں ایسی باتیں کیا کرتی اس لیے کہ تمہارا خیال میرے بارے میں ایسا ہی تھا۔ میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ میں ویسی ہی اچھوتی ہوں جیسا کہ تم کسی اور عورت کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔

میں شرمندہ ہوا۔ میری آنکھیں جھک گئیں اور میں نے کہا۔ کیا تم نے اس سے اس بارے میں پوچھا ہے؟

ہاں۔ اس نے کہا۔ میں جب گھر پہنچی تو وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور مطمئن۔ ظاہر ہے اس نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ مجھے اپنے طور پر ساری باتیں معلوم ہو جائیں۔ اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ میں اس عورت سے فون پر دریافت کرلوں گی۔ وہ مجھے جتانا چاہتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ جیسا چاہوں ویسا سلوک نہیں کر سکتی محض اس لیے کہ میرے باپ کے خریدے ہوئے فلیٹ میں ہم رہتے ہیں یا پھر یہ کہ میں کماتی ہوں اور وہ کچھ نہیں کرتا۔

وہ مجھے دیکھنے کے لیے مڑی۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور وہ مسکرانا چاہتی تھی۔

اس نے مجھ سے کہا تھا۔ الا نے اپنا بیان جاری رکھا۔ کہ وہ عورت جس نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی تھی وہ مارٹی نک کی شہری تھی۔ اس کی ملاقات اُس عورت سے کسی پب میں ہوئی تھی۔ ہماری شادی کے ایک سال قبل ہی سے وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے۔ انڈونیشیا کی ایک دوسری عورت بھی اُس کے ملنے والوں میں ہے۔ میں تو ان سب میں ایک عورت ہوں۔

وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ میں نے پوچھا۔

اس نے ہنسنا شروع کیا۔ وہ دانت پیس رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہی تو میں نے اس سے دریافت کیا تھا۔ اِلا نے کہا۔ اس کا جواب تھا وہ تغیّر چاہتا ہے۔ اسی طرح وہ سفر کرتا ہے۔

میں اُس سے کیا کہتا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جو اس انکشاف پر اُسے دلاسہ دے سکے کہ ٹھاٹ باٹ کی سطحی زندگی کی گندگی جس سے اس کو اتنی نفرت تھی اس آزاد دنیا کا بھی ایک جزو تھی جسے وہ اپنے لیے تعمیر کرنا چاہتی تھی۔

تمہیں اسے چھوڑ ہی دینا چاہیے اِلا۔ میں نے کہا۔

میں نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ نہیں ہو سکتا۔

کیوں نہیں؟

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس طرح ہنسنے کا اُن کے خاندان کا خاص انداز تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

کیا تم نہیں سمجھتے؟ اس نے کہا۔ اگر وہ بنکاک کی ساری عورتوں کو بھی اس گھر میں لے آئے جن سے اُس کا یارانہ رہا ہو تب بھی میں اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔ اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اُسے یقین ہے کہ میں اُسے اس طرح ٹوٹ کر چاہتی ہوں کہ کبھی چھوڑ نہیں سکتی۔

تب مجھے پتہ چلا کہ اِلا نے اسے سزا دینے کے لیے کچھ اپنے طریقے ایجاد کر لیے ہیں

آدھے گھنٹے کے بعد جب نِک وہاں پہنچا اور سیدھے اپنی ماں کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اِلا نے ہنستے ہوئے اعلان کیا۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ نِک کے ذہن میں ایک اور پلان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے ویرہاوزنگ بزنس میں پارٹنرشپ دلانے کے لیے میرے باپ سرمایہ فراہم کریں۔

اِلا نے دیر تک نِک کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایسی سختی پھیل رہی تھی کہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ پھر اس نے کہا۔ ویسے اس بزنس میں کامرانی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر نِک میں...

نِک کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور وہ اپنا سر جھکائے غالیچے کی طرف دیکھنے لگا۔

مَیں اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ خود وہ بھی یہی سوچتا رہا ہو گا کہ وہ کس قدر بے بس ہے۔ ایک ایسی محتاجی جو کبھی کبھی بغاوت پر آمادہ ہو لی ہے۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میں نے اسے سہارا دینا چاہا۔ سینے سے سینہ لگائے۔ کاندھوں سے کاندھا لگا کر۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے پاس اس کا مقام کیا ہے۔ لڑکپن سے وہ میرے بازو ایک آئینے کے سامنے کھڑا ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بات وہ سمجھ نہیں پائے گا۔

مجھے یاد ہے کہ رائے بازار کے تہہ خانے میں مٹّے نے مجھ سے اُس کے بارے میں کیا کہا تھا۔

وہ مختلف ہے۔ وہ ہماری طرح کا آدمی نہیں۔

یہ اُسی دن کی بات ہے جس کے دوسرے دن وہ لوگ ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

۲ر جنوری ۱۹۶۴ء کے دن یعنی اُن کے ڈھاکہ پہنچنے سے ایک دن قبل میری دادی کو ایک خط ملا۔ مایا دیبی کا لکھا تھا۔ خط کو کلکتہ پہنچنے میں دس دن لگے تھے کیونکہ اسے دہلی کے ڈپلومیٹک چینل سے گزر کر آنا تھا۔

مایا دیبی نے لکھا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پرانے مکان جا نہیں پائی ہے۔ وہ کسی کام میں مصروف ہے۔ اس کے علاوہ ان کا موجودہ مکان جندرا بہار لین سے بہت دُور کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور یہ کہ ہندوستانی ڈپلومیٹس کی حیثیت سے ان لوگوں پر گھومنے پھرنے کی پابندی ہے۔ تاہم وہ کھوج کر رہی ہے حُسنِ اتفاق کہ ہائی کمشنر کا ایک ڈرائیور ایک ایسے شخص کو جانتا ہے جو اُن کے پرانے میں رہتا ہے۔ اس کا نام سیف الدین ہے۔ اس نے پرانے مکان کے صحن میں ایک کارخانہ کھول رکھا ہے۔

ایک کارخانہ! میری دادی نے لمبی سانس کھینچی۔ ہمارے مکان کے آنگن میں! اس پھنس کے درخت کا کیا انجام ہوا ہوگا؟

سیف الدین کو لے کر ڈرائیور اس کے پاس آیا تھا۔ اچھا آدمی لگا۔ شائستگی اور تہذیب سے بات کرنے والا۔ اس کا تعلق بہار کے گاؤں موتی ہری سے ہے۔ وہ مشرقی پاکستان خالی ہاتھ پہنچا۔ ایک بڑا کنبہ اس کے ساتھ تھا۔ اب اس کا کاروبار چل پڑا ہے۔ ڈرائیور نے کہا کہ اس وقت اس کا شمار ڈھاکہ کے بہترین میکانیکوں میں ہوتا ہے۔

بابا دیبی نے سیف الدین سے اپنے بزرگ جیتھ موشائی کے بارے میں پوچھا ہے۔ جب بابا دیبی نے گوشتو بی ہری لوس کا نام اُسے بتایا تو اُس نے پہلے تو پہچانا نہیں کیونکہ لوگ اُسے وکیل بابو کے نام سے جانتے تھے۔ وہ آخر آخر تک بھی وصیت ناموں اور حلف ناموں کے مسودے تیار کرتا رہا ہے اور کبھی کبھی ہائی کورٹ بھی جاتا رہا ہے۔ سیف الدین نے اُس کے بارے میں بتایا کہ وہ مکمل فرلیش ہے اور اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔ اب وہ ایسے لوگوں کو بھی نہیں پہچانتا جنھیں وہ برسوں سے جانتا تھا۔ خوش بختی سے ایک ایسا شخص اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے جس نے ایک زمانے تک اس سے سہارا پایا تھا۔ لیکن وہ لوگ بھی بہت غریب ہیں۔ اُن کی آمدنی صرف سائیکل رکشہ پر ہے۔ زیادہ دنوں تک وہ لوگ اُس ضعیف آدمی کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ سیف الدین نے کہا کہ خدا کی مہربانی ہوئی کہ اس کے رشتہ دار ڈھاکہ آئے ہیں۔ شاید اس بوڑھے کے آخری دن چین و سکون میں گزریں جس کا وہ مستحق ہے۔

پھر بابا دیبی نے دیکھا کہ میری دادی کا قیاس صحیح تھا۔ اب تو انھیں اس ضعیف آدمی کے لیے کچھ کرنا ہے۔ یہ تو تب ہی ہو سکے گا جب سب لوگ ڈھاکہ میں اکھٹے ہو جائیں۔

یہ بھی لکھا تھا کہ اُس نے ایک چھوٹا سا تحفہ سیف الدین کو لا دیا ہے۔ اس لیے کہ سیف الدین نے بڑی ہمدردی دکھائی ہے۔ یہ تحفہ شاید ہندوستانی ساڑی ہوگی جو اس کی بیوی کے لیے دی گئی۔

میری دادی نے اُس خط کو ہم سب لوگوں میں گھمایا۔ اُس کے چہرے پر خاموشی تھی اور فاتحانہ مسکراہٹ۔ یہی اس کا ہمیشہ کا وصف تھا۔ لیکن جب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ

گئے تو اس نے خوشی سے پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا اور کہا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مایا دیبی ابھی تک ہمارے پرانے مکان کو گئی نہیں۔ میں چاہتی بھی نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے جائے۔

شام ہوئی تو اس نے حکم جاری کیا کہ رات میں اسی کے کمرے میں گزاروں۔ اس نے کہا کہ وہ ہمیشہ میری کمی محسوس کرتی رہی ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ رات اُسی کے کمرے میں سوؤں اور اُس سے کہانیاں سنوں۔ ایک اور اہم کام اُس رات کے لیے باقی رکھا گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ رات جب وہ اکیلی ہو گی تو میں اُن ہدایات کو پھر سے دہراؤں جو ہوائی جہاز کے سفر سے متعلق تھے۔ پچھلی دفعہ مجھے بے کیفی کا احساس ہوا تھا کہ اُس نے میری باتیں دھیان سے نہیں سنی تھیں۔

رات جب وہ بستر پر لیٹی تو میں نے اپنی فہرست کا پہلا عنوان لیا۔ کیا اُسے یاد ہے کہ سیٹ بلٹ کو کس طرح باندھنا چاہیے۔ آکسیجن کا بیاگ کس طرح اپنے پہلو میں رکھنا چاہیے۔ کیا اُسے یاد ہے کہ پائلٹ کی سیٹ کے نیچے پیراشوٹ رکھا جاتا ہے۔ اس پر وہ ہنسی اور کہنے لگی کہ میں چپ ہو کر سو جاؤں۔ میں نے اصرار کیا کہ کہانی سُنے بغیر میں سوؤں گا نہیں۔ تب اس نے اپنے ڈھاکہ کے زمانے کی ایک کہانی شروع کی۔ اپنے پرانے مکان سے متعلق اور ان لوگوں سے متعلق جو اس گلی میں رہتے تھے۔ لیکن بہت جلد اس کی آواز دھیمی ہوتی گئی اور جب اس نے کنا بابو کی مٹھائی کی دکان کا ذکر شروع کیا تو مسہری ہٹا کر وہ بستر سے اٹھ گئی اور کھڑکی سے لگی اپنی آرام کرسی پر بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔ جب میں سو چکا تو تب بھی وہ بیٹھی رہی۔ اور خشک ہوتی ہوئی سیاہ جھیل کی طرف دیکھتی رہی۔

میں جب جاگا تو دیکھا کہ گھر میں ہر طرف اُن کے سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میری ماں مصروف تھی۔ وہ تین طرح کے سینڈوچس بنا رہی تھی جنھیں ہم ان کے ہمراہ بھیجنے والے تھے۔ میری دادی تو بہت خوش تھی۔ اپنی الماریوں کو مقفل کرنے سے قبل وہ سیف الدین کی بیوی کے لیے ساڑی کا انتخاب کرنے اور ساتھ لے جانے والی دوائیوں کو نکالنے میں مصروف رہی۔ متے اکیلی ہی ایسی تھی جو اس سفر سے بے نیاز تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح معمول کے مطابق صبح سے اپنے کمرے میں ریکارڈ بجا کر سن رہی تھی۔

ڈم ڈم ایئرپورٹ کے لیے ہم لوگ دوپہر میں روانہ ہوئے۔ تردیب کو لینے کے لیے ہم بالی گنج پیلیس پر پہنچے تو میری دادی ایک اسکول کی لڑکی کی طرح ہنس رہی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ سچ مچ ہوا میں اڑنے والی ہے۔

ڈم ڈم پر جب لوگ کسٹمس کی کارروائیوں کے لیے اندر غائب ہونے والے تھے تو ہم لوگوں نے انھیں خداحافظ کہا اور دوسرے راستے سے عمارت کی چھت پر پہنچے تاکہ ہوائی جہاز کو اڑتا ہوا دیکھ سکیں۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ہم لوگوں نے تین ننھی جسموں کو کولتار کی راہ داری پر دیکھا۔ انھیں بھی معلوم تھا کہ ہم لوگ دیکھنے والے ہیں۔ وہ لوگ جہاز کی طرف شرما شرما کر ایسے چل رہے تھے جیسے کوئی نو وارد اداکار اسٹیج پر اپنے آپ کو پہلی بار پیش کر رہا ہو۔ جب وہ فاکر فرنڈشپ طیارے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو اچانک میری دادی نے ہماری طرف مڑ کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ اس کی سفید ساڑی سیاہ کولتاری کی راہ داری کے مقابلے میں روشنی کی طرح چمک رہی تھی۔ ہم نے بھی ہاتھ ہلائے یہ جانتے ہوئے کہ وہ لوگ ہمیں دیکھ نہ سکیں گے۔

طیارے کے دروازے سے لگی ہوئی ایک ایئر ہوسٹس ان کی طرف جھکتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے بعد وہ ہماری نظروں سے غائب ہو گئے۔ لیکن چند ہی منٹ بعد میں نے دیکھا کہ ایک چہرہ کھڑکی میں جھانکتا ہوا بے قرار ہو کر ہماری طرف ہاتھ ہلا رہا ہے۔ وہ یقیناً میری دادی تھی۔ دروازہ بند ہو گیا تو طیارے سے لگائی ہوئی سیڑھیاں ہٹا لی گئیں اور وہ دھیرے سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ آہستہ سے مڑا اور پھر بڑی تیزی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہلانا روک دیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ بے مایہ سست رفتار شے اس بے باکی کے ساتھ آسمان کی طرف بڑھے گی۔ وہ ایک چوکور راستے پر پہنچ کر پھر مڑا۔ اس کے بعد اس کا منہ ران وے کی طرف سیدھا ہو گیا۔ کچھ دیر وہ وہیں ٹھہرا رہا۔ پھر ایسا لگا کہ اس کے اندر سے طاقت خارج ہونے لگی ہے۔ ایئرپورٹ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ جہاز کے پنکھے پھر سے تیز چلنے لگے۔ یکلخت وہ اتنے تیز ہو گئے کہ ان کی رفتار کی گرمی سے کولتار پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں ابھی تک اپنی دادی کی طرف کھڑکی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ وہ کھڑکی کے پچھلے دروازے سے تیسرے نمبر پر تھی۔

مجھے یقین تھا کہ میں اُسے مسکراتے ہوئے کھڑکی میں سے اپنے ہاتھ ہلاتے دیکھ رہا ہوں۔ پھر ایک تھرتھری پورے جہاز کے ڈھانچے میں محسوس ہوئی اور اب وہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ انجن کی گرج اور دوپہر کے سورج کی تمازت میں طیارہ چمکنے لگا تھا۔ اب وہ بے مایا نہیں تھا۔ انجنوں کی طاقت نے اب اس ڈھانچے کو ایک ایسے طاقتور بگلے کی شکل دے دی تھی کہ وہ اب ہوا میں اُڑنے کے لیے تیار تھا۔ میری دادی کی کھڑکی سفید اور پھیلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب طیارہ کا منہ اوپر کی طرف بڑی نزاکت سے اُٹھا اور پھر یقین نہیں آتا کہ اچانک یہ وزنی دھات کا جسم آسمان پر سواری کرنے لگا۔

جب طیارہ ہماری طرف سے گھوم کر آگے بڑھنے لگا تو میری ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس وقت تک اُسے یقین نہ تھا کہ میری دادی ڈھاکہ کے لیے پرواز کرے گی۔

میرے باپ نے بھی اطمینان کا سانس لیا لیکن اُن کا اندازہ کچھ اور تھا۔ انھوں نے کہا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ لوگ چلے گئے۔

ان کی آواز ایسی تھی کہ میری ماں پوچھنے پر مجبور ہوئی۔ کیوں؟ کیا خاص بات ہوئی:

انھوں نے اپنا کان کھجایا اور کہا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں کچھ مصیبت آنے والی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ لوگ دوسرے ملک کو جا چکے ہیں۔ خاص طور پر مٹے۔ اس مقام سے وہ لوگ دور ہی رہیں، اچھا ہے۔

کیا مصیبت؟ میں نے پوچھا۔

میرے باپ نے فوراً میرا رُخ موڑتے ہوئے جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ نہیں۔ تم ابھی سمجھ نہ سکو گے۔

ہم لوگ اس وقت تک طیارے کو گھورتے رہے جب تک کہ وہ دُور افق میں غائب نہ ہوا۔

کئی برسوں کے بعد روبی نے مجھ سے کہا کہ جب میری دادی مایا دیبی اسے ایئر پورٹ پر ملی تو اُس نے پہلا سوال یہی کیا — ڈھاکہ کہاں ہے؟ مجھے ڈھاکہ نظر نہیں آرہا ہے۔

تب میں اس کی کھڑکی سے لگا بیٹھا ڈھاکہ کو اُسی طرح دیکھتا رہا جس طرح دادی نے اُس رات دیکھا ہوگا۔ لیکن میں کبھی ڈھاکہ نہیں گیا تھا۔ جو بھی ہو اس کا اپنا ڈھاکہ تو اس کے ماضی کی یادوں میں کھو گیا تھا۔ میں تو انھیں یادوں کو دُہرا رہا ہوں۔ یہ یادیں جن میں اس کے برسوں پہلے کا سفر بھی شامل ہے میرے سامنے ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جس کے دھند لکے کے بیچوں بیچ دھنواں پھینکتا ہوا ایک بڑا کالا انجن اور جس کی داہنی طرف دُور دُور تک بنڈلیوں کی قطاریں۔ سامنے ایک اونچا پلیٹ فارم۔ اس پر آواز دیتے ہوئے خوانچے والے۔ پھر اپنے رشتہ داروں کے استقبال کو آنے والوں کا ہجوم۔ لوگ ہنسی خوشی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے۔ ان سب کے پس منظر میں مسجد کا ایک مینار — یہی یادیں تو میرے ذہن میں بسی تھیں۔ لیکن اس ماحول سے پھیلتی ہوئی بو اور وہاں کی آوازوں کا کوئی اندازہ تو مجھے نہ تھا۔ شاید وہ برصغیر میں موجود ہزاروں اسٹیشنوں سے کسی طرح مختلف نہ تھا۔ اگر تھا تو اس طرح کہ یہاں کی لمبی چوڑی ندیاں۔ پانی کے بہنے کی آوازیں اور وہ ناگوار بو بھی ان میں شامل تھی جو کارخانوں سے نکلتے ہوئے فاسد مادّے ان میں شامل ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی ماحول میں وہ طاقت تھی کہ ان ہی کی تصویر اس کی یادوں پر چھائی رہی اور شاید یادوں کی اس ماندگی ہی کو ہم "واپسی" کا نام دیتے ہیں۔

ایک اور منظر جسے قبول کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھی وہ تھا شیشوں اور لینولیم سے سجایا ہوا وہ ایئرپورٹ جو کسی طرح اس ایئرپورٹ سے مختلف نہ تھا جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اسے اس بات کی توقع نہ تھی کہ صاحب کے گھر تک ایک ایسی سیدھی سڑک ہوگی جس کے دونوں طرف یوکلپٹس کے درخت ہوں گے اور مضافات میں کہیں کہیں بنگلے۔

اُس نے کہا تھا کہ مئے نے اسے پسند کیا۔ بڑی خوبصورت سڑک تھی۔ کلکتے کی سڑکوں کے مقابلے میں بہت کشادہ۔ لیکن میری دادی یہی کہتی رہی کہ اس نے پہلے تو سب کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ڈھاکہ کہاں ہے؟

اُس کے خیال میں ڈھاکہ وہی شہر تھا جس کے بیچوں بیچ ان کا قدیم مکان تھا۔

اُس مکان اور گلی کا مجھ سے اُس نے اس کثرت سے ذکر کیا تھا کہ میں بھی انھیں تصوّر ہی

تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ کہ یادداشت کی روشنی ان پر ایسی ہی پڑتی تھی جیسے ایک لائٹ ہوز کی شعاعِ نور وقفے وقفے سے کسی شئے کو منور کرتی ہے۔ میں اس گلی کے نکڑ پر کنّا بابو کی مٹھائی کی دکان واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہاں تک ٹرے میں سجائے ہوئے گلابی جامن اور کشتیوں میں رکھا ہوا ڈھیر سارا قلاقند بھی دھندلے شیشوں کے اندر سے میری نظروں سے چھپا نہ تھا۔ میں وہاں مکھیوں کی بھنبھنانے کی آواز سن سکتا تھا اور کنّا بابو کو پیسوں کے ڈبے سے لگا ہوا اپنا سر کھجاتے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ کبڑی لیے بیٹھا ہے۔ یہ وہی کنّا بابو تھا جس نے اُن کے ایک کزن کو ایک دن رس گلّا چراتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور اُس پر ہانڈی بھر گاڑھا شیرہ ڈال دیا تھا۔ یہ سب میں اس لیے دیکھ سکتا تھا کہ میری دادی ان لوگوں میں سے تھی جن کا اپنا کوئی مکان نہیں ہوتا ہے لیکن جو اپنی یادوں کو تازہ رکھنے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ میرے لیے کنّا بابو کی مٹھائی کی دُکان ایسے ہی تھی جیسے ہمارے گھر کے سامنے کی گلی۔ تاہم میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس گلی پر فٹ پاتھ بھی تھا کہ نہیں۔ یا یہ کہ وہ گلی سیدھی تھی یا کسی طرف مڑتی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ گلی کے ساتھ موری بنائی گئی ہے کہ نہیں۔

مایادیبی کا نیا مکان شہر کے دوسرے کونے پر تھا۔ دھن منڈی کے علاقے میں۔

روبی نے اس کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا اور دھن منڈی کا نام میرے بچپن کی یادوں کا راز بن چکا تھا ایسے ہی جیسے گرمیوں کی دوپہر میں بندر نچانے والے کی ڈگڈگی یا گلنو یا آئس کریم کی بنڈی والے کی ٹن ٹن کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی ہوئی دنیا کے نقشے میں میرے لیے ایسا راز تھیں جس کی چابی صرف میرے ہی پاس تھی اور تخیل کی اس دنیا کا کوئی کوڈ ایسا نہ تھا جیسا ایک بینکر کا اپنی تجوری کے لیے ہوتا ہے۔

میں اگر چاہتا بھی تو دھن منڈی کے نام سے چھٹکارا نہ پا سکتا تھا۔ ساتویں دہے کی ابتدا میں اس کا نام ہر جگہ لیا جانے لگا۔ کتابوں میں، روزناموں میں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ نئے نئے بنگلادیش کے دارالخلافے میں جو کچھ ہوا تھا وہ دھن منڈی ہی سے نکلا ہوا پلان تھا۔ وہیں سے تو وزراء اپنا بیان جاری کرتے تھے۔ وہ ایسے رپورٹرز اور ڈپلومیٹس پر بھروسہ کرتے تھے جن سے وہ واقف بھی نہ ہوتے۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں

شیخ مجیب الرحمٰن رہتے تھے اور وہیں تو انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی ۔ وہ اپنی بالکونی سے چل کر آرہے تھے تاکہ یونیفارم میں ملبوس اپنے قاتلوں کا سامنا کرپائیں تب انھیں اس کا شبہہ نہیں تھا کہ جس شخص نے انھیں یونیفارم اور آزادی دلوائی ہے اسی پر بروہ اپنی بندوقیں خالی کریں گے ۔ روزناموں میں خبریں پڑھ کر میں حیرت میں پڑ جاتا کہ روبی جو تیرہ سال کا تھا اگر وہیں ہوتا تو وہ بندوق کی پہلی آواز پر بھاگ کر اپنی چھت پر پہنچ جاتا یہ دیکھنے کے لیے کہ شیخ کس طرح اپنے ہی باڈی گارڈس کے نشانوں کا شکار ہوئے اور اس بوڑھے آدمی کا جسم کس طرح خون میں لت پت راستے میں پڑا ہوگا ۔ تب نیتا نندا یا اس کی ماں روبی کے پیچھے سیڑھیوں پر بھاگ کر آتے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کو ڈھانک لیتے اور پھولتی ہوئی سانس سے اس کے کان میں کہتے اُدھر مت دیکھو ـــ مت دیکھو ـــ یہ صرف ایک تماشہ ہے ۔

لیکن ۱۹۶۴ء میں تو دھن منڈی فیشن پرست شہریوں کے لیے ایک بلو پرنٹ ہی کی طرح تھا ۔ اُفتادہ زمین پر گڑھے کھدے ہوئے ۔ کہیں چار دیواری گھاس اور دھول کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ۔ ان کے اندر دور سے نظر آتی ہوئی اونچی اونچی عمارتیں اور ان کے احاطے کی گلیاں جو میدانوں سے مل کر خلط ملط ہو گئیں تھیں ۔ اس پس منظر میں میری دادی شاید مٹھائی کی دکان اور گلیوں کی تلاش میں تھی ۔ وہ دھن منڈی میں صاحب کے مکان کو دیکھ کر پکار اُٹھی ۔ یہ تو غیر ملکیوں کے رہنے کی جگہ ہے ۔ ڈھاکہ کہاں ہے ؟ تب تردیب کی جہل عود کر آئی اور اس نے کہا ۔ اب تو تم غیر ملکی ہو ۔ یہاں مئے کی طرح تم بھی غیر ملکی ہو ۔ مئے سے بھی زیادہ اس لیے کہ اسے تو یہاں آنے کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں ۔

تب میری دادی مئے کو حیرت سے دیر تک تکتی رہی ـــ ہاں ۔ میں سچ مچ یہاں غیر ملکی ہوں ۔ ایسے ہی جیسے مئے ہندوستان کے لیے اور ٹیگور ارجنٹائن کے لیے غیر ملکی ہیں ۔ پھر اس نے ایک اور اُچٹتی نظر مکان پر ڈالی ، اپنا سر ہلایا اور کہا ـــ تم لوگ کچھ بھی کہو ۔ یہ تو ڈھاکہ نہیں ہے ۔

تاہم وہ ایک سجا سجایا مکان تھا ۔ روبی کے لیے تو بہت عمدہ ۔ اونچی چھت کشادہ اور

ہوادار ایسی کہ پتنگ اُڑانے کو جی چاہے۔ ہاتھ میں پتنگ پکڑے رہو تو ہوا خود اُسے لے اُڑے اور دیکھتے دیکھتے افق میں آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور آپ اس کی ڈور ہاتھ میں تھامے رہیں

دھن منڈی کے دوسرے مکانوں کی طرح ان کا مکان بھی چاروں طرف سے اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ عقب میں تھوڑے سے فاصلے پہ ایک پانڈ تھا جہاں دوپہر میں مچھیرے اپنی قسمت آزمانے کے لیے آجاتے۔ عام طور پر تو اس پانڈ میں کوئی ہلچل نہ ہوتی لیکن کبھی کبھی مانسون کے موسم میں جب خلیج بنگال میں طوفان آتا تو اس پانڈ کا رنگ جامنی ہو جاتا اور ہواؤں کے جھکڑ کے ساتھ پانڈ کا پانی اس قدر اوپر اٹھتا کہ مکان کی دیواروں سے لگ کر سڑک اور گلیوں میں پھیل جاتا۔ جب بھی ایسا ہوتا تو ان کا باورچی نیتا نندا کوئی پرانی ساڑی لیے وہاں پہنچتا اور مچھلیوں کو اُن کے گریج کے گڑھے کی طرف ہنکالاتا۔ پھر انھیں کئی دنوں تک کسی مٹی کے گڑھے میں رکھتا۔ جب بھی مچھلی کی ضرورت پڑتی وہ اسی طرح گریج میں لاکر اُسے پکڑ لیتا۔

مکان کے پچھواڑے میں ناریل اور پپیتے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ نیتا نندا نے وہاں چند بطخ اور مرغ پال رکھے تھے جہاں وہ ہفتہ میں ایک بار روبی کے لیے ناٹک کرتا۔ کسی ایک مرغ کو وہ ہاتھ میں پکڑے کہتا کہ اس ہفتہ یہ بچہ بڑا شریر ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ درانتی کو اوپر اُٹھا کر کچھ منتر پڑھتا۔ جئے ماجگدجنانی۔ پلک جھپکتے ہی خون سے بھرا مُرغ کا سر روبی کے قدموں میں پڑا ہوتا۔ اُس کی چونچ حیرت سے کھلی ہوتی۔ تب روبی سیڑھیوں کی طرف بھاگتا لیکن ریلنگ تک پہنچ کر ٹھہر جاتا اور صحن میں پڑے پھڑ پھڑاتے بے سر والے دھڑ کو دیکھتا۔ نیتا نندا واقف ہوتا کہ روبی یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ وہ پلٹ کر اُکڑوں بیٹھ جاتا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بیڑی سلگاتا۔ پھر وہ روبی کی طرف اپنی سیاہ اور چمکدار آنکھوں سے دیکھتا اور کہتا۔ دیکھا تم نے شریر بچوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔

سامنے ایک صحن تھا۔ اس سے روبی کو واقف کروانے والوں میں نیتا نندا بھی ایک تھا۔ اس نے روبی کو سکھایا تھا کہ کس طرح گنا لٹی کی ڈنٹھل کو توڑ کر اس کا رس چوسا جاتا ہے

اور یہ کہ کس طرح تتلیوں کے پروں کو انگوٹھے اور انگلیوں سے پکڑے رہنا چاہیے کمال کی بات اس نے جو سکھائی وہ آم کے درخت پر چڑھنا تھا۔ درخت باغیچے کے بیچوں بیچ تھا۔ بہت بڑا تھا۔ اس کا پیڑ ہی زمین سے آٹھ فٹ اونچا تھا۔ سیدھا تھا۔ اوپر شاخیں پھیل گئی تھیں۔ اس کام میں بڑی محنت لگی لیکن ٹھیک وقت پر اُس نے اس کرتب میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ماں باپ مہمانوں کو لے کر جوں ہی گھر میں داخل ہوئے تو اس نے پہلا کام یہی دکھایا۔ وہ پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا اور جب سب سے اونچی شاخ پر پہنچا تو اُس نے چلاّ کر میری دادی سے کہا: دیکھو ماشی۔ دیکھو میں کہاں ہوں!

اُس نے نظریں اٹھا کر جب اُسے دیکھا تو حیرت سے کہا: کاش میں بھی درخت پر چڑھ سکتی۔ شاید اس اونچائی سے میں ڈھاکہ دیکھ سکتی۔

اس شام باغیچے میں بیٹھ کر ڈنر کا انتظار کرتے ہوئے میری دادی نے مایا دیبی سے پوچھا کہ انکل کو لانے کے لیے انھیں اپنے قدیم مکان کب جانا ہے۔

جب آپ چاہیں۔ مایا دیبی نے جواب دیا اور میری دادی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ کل۔ ہم لوگ کل ہی جائیں گے۔ جس قدر جلد ہو سکے جانا بہتر ہوگا۔

صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا — نہیں۔ وہاں جانے کا یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ وہ مکان قلبِ شہر میں واقع ہے اور ہم نے سُنا ہے کہ جیانسری کے علاقے میں کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان دنوں وہاں نہ جائیں۔ میری دادی خفّت محسوس کرتی اگر وہ صاحب کی بات سُن لیتی۔ وہ آگے جھکی، اس کے گھٹنے کو جھنجھوڑا اور کہا۔ اگر وہاں گڑبڑ ہونے والی ہے تو بہتر یہی ہے کہ اس سے قبل ہی انھیں وہاں سے نکال لیا جائے۔ انھیں کی خاطر تو میں ڈھاکے سے یہاں آئی ہوں۔ اور اب کسی طرح کی تاخیر مناسب نہیں ہے تھوڑی سی گڑبڑ سے میں گھبرانے والی نہیں ہوں۔ جس قدر جلد ہو سکے ہمیں یہ کام کر لینا ہے۔

آپ نہیں سمجھتیں۔ صاحب نے وہسکی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے احتجاج کیا۔ سچ سچ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تاکہ مایا دیبی ان کی حمایت کر سکے۔

ماما دیبی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ہم لوگ بہت جلد وہاں جائیں گے۔ بس تھوڑے ہی دنوں بعد۔ ایک آدھ ہفتے کا کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

میری دادی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ٹھیک ہے ہم اگلے ہفتے تک انتظار کریں گے۔ جمعرات کے دن تک۔ جمعرات کا دن بڑا اچھا ہوگا۔ لیکن اس کے بعد ایک دن کی تاخیر نہ ہوگی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس واقعے کو گزرے کتنے دن بیت گئے۔ لیکن ایک دن خبر ملی کہ کلکتہ میں کچھ شور بپا ہوگیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس دن میری ماں بہت مصروف تھی۔ ہمیشہ کی طرح میرے باپ کو اُس دن بھی جلد ہی اپنے کام پر جانا تھا۔ اس دن میری ماں ریڈیو کی خبر نہ سن سکی تھی۔ معمول کے مطابق اس نے بستہ اور پانی کی بوتل میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے اسکول کی بس پکڑنے کے لیے روانہ کر دیا۔

کئی برسوں بعد یاد کر کے تعجب ہوتا ہے کہ اس چھوٹے سے ٹرانسسٹر ریڈیو کے ساتھ ماں کا کیسا اٹوٹ رشتہ تھا۔ اس کے کمرے میں صرف اسی ایک چیز کی اہمیت تھی۔ یہ وہیں پر تھا جہاں پر اس کے مرحوم ماں باپ کی تصویریں فریم میں لگی رکھی تھیں۔ جہاں تک ہو سکے اس نے کبھی صبح کی خبریں سننے کا موقع نہیں گنوایا۔ ہم سب کے لیے ناشتہ کے ساتھ ساتھ خبریں سننا عبادت کی طرح تھا۔ میں اپنے کالج میں بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا کہ میری ماں کو سیاست سے سچ مچ دلچسپی ہے۔ صبح کی خبریں سننے کا اس نے کبھی موقع نہیں کھویا۔ میں تو تب بھی جانتا تھا کہ ریڈیو پر سنی جانے والی سیاست سے ماں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی یہ خصلت ایسی تھی کہ میں نے اس میں کوئی خوبی تلاش نہیں کی۔ میرے ذہن کو صرف اس بات پر آمادہ کیا جاتا تھا کہ تعلیم پاؤں اور کوئی بڑا عہدہ حاصل کر دوں۔ ویسے خبریں سننے کو جیتے رہنے کی علامت پر محمول کیا گیا۔

لیکن اس صبح میری ماں نے خبریں نہیں سنی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں روز کی طرح بس کا انتظار کرنے کے لیے سڑک پر آگیا۔

مجھے بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ ان دو بچوں پر رشک آنے لگا جو روز تو آتے تھے لیکن اس دن نہیں آئے تھے۔ مجھے حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ اس دن انگلینڈ کے خلاف ۱۹۶۴ء کا ٹسٹ سیریز مدراس میں کھیلا جانے والا تھا۔ ان بچوں نے اپنے ماں باپ کو آمادہ کرلیا ہوگا کہ انھیں دن بھر ریڈیو کمنٹری سننے کا موقع دیا جائے۔ میں اپنی ماں کے رویّے سے واقف تھا۔ میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

میں بس کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ مجھے میچ کی بھی فکر تھی۔ صبح کے اخباروں میں خبر چھپی تھی کہ فاروق انجینئر زخمی ہوکر کھیل میں حصّہ نہیں لے رہا ہے۔ اُس کی جگہ بدھی کندیران کھیل رہا ہے۔ مجھے فکر ہوئی۔ انجینئر ہمارا ہیرو تھا۔ زوردار بیٹنگ کرنے والا۔ اس کے بغیر ہمارے جیتنے کی کوئی امید نہ تھی۔ بس میں بات کرنے کے لیے ہم سفر بھی نہ ہوں گے اور یہ سوچ کر میرے دکھ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ہماری اودے رنگ کی بڑی بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ ایونیو سے گزر کر وہ سیدھے میری ہی طرف آرہی تھی۔ پانی کی بوتل اُٹھاکر اشارہ کرتے ہوئے میں بس کی طرف بھاگا۔ لیکن بس کے قریب پہنچ کر میں ٹھٹھکا۔ بس تو ہماری ہی تھی۔ ہمارے اسکول کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا لیکن کہیں نہیں بگاڑ تھا۔ ہمیشہ اس کی کھڑکیوں میں سے کوئی نہ کوئی جھانکتا تھا لیکن ...... بات یہ تھی کہ اس دن کوئی سر کھڑکی میں دکھائی نہ دیا۔

بس رکی اور میں اس میں چڑھ گیا۔ صرف ایک دو ہی بچے اس میں نظر آئے۔ وہ پشت کی بنچ سے لگے بیٹھے تھے۔ باقی بس خالی تھی۔ ان میں میرا کوئی دوست نہ تھا لیکن میرے اضافے سے وہ خوش ہوئے۔ ہم لوگ پہلے کبھی قریب نہیں ہوئے تھے لیکن اس بار جوں ہی انھوں نے مجھے دیکھا اپنے درمیان میں میرے لیے جگہ بنادی۔

جیسے ہی میں وہاں بیٹھا بچّے میرے کاندھوں کی طرف اجنبی نظروں سے دیکھنے لگے۔ مجھے ناگوار لگا۔ میں نے پوچھا تم اس طرح سے مجھے کیوں گھور رہے ہو۔ پھر میں نے اپنی پشت پر نظر

ڈالی - میری پانی کی بوتل اُن کی توجہ کا سبب تھی۔

میری سیدھی جانب ایک موٹا سا لڑکا تھا۔ اس کا نام تھا طبلو جو کبھی کبھی ہمارے ساتھ پارک میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کیا بات ہے ؟ کیا تم نے پہلے کبھی پانی کی بوتل نہیں دیکھی۔

اُس کا منہ بری طرح سے کھل گیا۔ اس نے کہا۔ تو تم بھی ایک لائے ہو۔ ایک چھوٹے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے میرے کان میں چپکے سے کہا۔ وہ آج کوئی بوتل نہیں لایا ہے۔ اس کی ماں نے اُسے آج سوڈے کی بوتل دی ہے۔

بچہ شرمیلا ہو کر نیچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ طبلو نے اُسے حکم دیا کہ پانی کی بوتل نہ لانے کا سبب بیان کرے۔

مجھے یاد ہے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اُس نے ممیاتی ہوئی آواز میں کہا کہ اُس کی ماں نے اسے صبح سے پانی پینے نہیں دیا ہے اُس نے کسی سے سنا کہ ٹلا ٹینک کے پانی میں انھوں نے زہر ملا دیا ہے اور سارے کلکتے کا پانی زہر آلود ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگوں نے دہرا دہرا کر اُس کی باتیں سنی تھیں۔ اس دُھندلی یادوں کے پیچھے ایک اور یاد بھی چھپی ہے۔ اس یاد کی تھوڑی سی تفصیل۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ایسے سوال کہ وہ لوگ کون تھے۔ یہ کہ انھوں نے کیوں اپنے پینے کے پانی میں زہر گھول دیا۔ کسی سوال کی ضرورت نہ تھی۔ جواب سے ہم واقف تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو کسی کی بیان کی ہوئی تھی۔ اس بیان پر آپ کو یقین ہو کہ نہ ہو۔ اہم بات تھی کہ وہ بیان کی گئی تھی کہ نہیں۔ اس کے بعد ساری باتیں واضح تھیں۔ گلیوں کا سنسان ہونا۔ دوسرے بچوں کا غیر حاضر رہنا۔ ساری باتیں صاف تھیں۔ مزید کسی سوال کی ضرورت نہ تھی۔

تب طبلو نے اونچی آواز میں کہا۔ ہمیں گول پارک پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

کیسے ؟ کسی نے سوال کیا۔

اس لیے کہ وہاں مانٹو بس میں سوار ہوگا۔ وہ جانتا ہی ہوگا۔ وہ مسلمان ہے۔

میری طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔ پھر اس نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ مانٹو تو تمہارا دوست

ہے۔ ہے کہ نہیں؟

مجھے یاد ہے کہ میں نے جواب دینا چاہا تو میرا حلق سوکھ رہا تھا۔

نہیں — جب سے ہم لوگوں نے محلہ بدل دیا ہے۔ میں نے جھوٹ کہا۔ میں مانٹو سے کئی مہینوں سے ملا نہیں ہوں۔

جب ہم گول پارک پر پہنچے تو میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹیوب ویل سے متصل جگہ کی طرف جہاں مانٹو بس کے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے اس کے گھر کی گلی کی طرف جھانکا تو وہ پردے کے پیچھے کھڑا ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ نہیں آیا تھا۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے ہم لوگوں نے اپنی اپنی بوتلوں کے ڈھکن کھولے اور پانی کو باہر بہا دیا

اس دن ہماری پہلی کلاس ریاضی کی تھی۔ ہماری ٹیچر ایک اینگلو انڈین خاتون تھی جس کا نام تھا مسز انڈرسن۔ وہ اونچے قد کی خاتون تھی اور اسکرٹ پہنتی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ کلاس روم میں بہت تھوڑے بچے تھے۔ مسز انڈرسن نے ہمیشہ کی طرح ہماری حاضری لینا مناسب نہ سمجھا۔ ہم لوگوں کی تشویش بڑھتی کہ یہاں بھی معمول میں فرق آگیا ہے۔ ہم لوگ خاموش ہی خاموش منتظر رہے کہ ہر کام معمول کے مطابق ہو تب مسز انڈرسن نے ہاتھ میں پنسل اٹھا کر میز پر ٹک ٹک کیا۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی کاپیاں کھولیں۔ وہ کہہ رہی تھیں "ولا" کا تناسب ہم کسی بھی عدد سے متعین کر سکتے ہیں۔ بہت ہی جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ دن بھی ہمیشہ کی طرح کا ایک دن تھا۔ ہمارا سبق مختلف نہ تھا۔

کلاس روم میں میری میز سے لگی ایک کھڑکی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے کوئی آواز سنی ہے۔ دور سے آتی ہوئی آواز۔ وہ پھیل کر معدوم ہو گئی۔ ایسے ہی جیسے شارٹ ویو ریڈیو اسٹیشن کی ٹوٹتی ہوئی آواز۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں نے کوئی آواز سچ مچ سنی تھی۔ لیکن جب میں نے اپنے بازو بیٹھے طبلوکی طرف دیکھا تو وہ بھی اوپر کی طرف دیکھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس نے چہرہ بناتے ہوئے اپنے کاندھے جھٹکائے۔

مسز انڈرسن کی نظروں سے بچتے ہوئے میں نے اپنا سر اٹھایا اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اب کی دفعہ آواز زور کی تھی۔ کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ کسی جلوس کی آواز تھی۔ ہمارے اسکول کے سامنے سے گزرنے والے جلوسوں کی آوازوں کے ہم عادی تھے۔ آئے دن ایسی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان پر ہم نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ کسی کے چلّانے کی آواز تھی۔ پھر کوئی دوسرا چلّا رہا تھا۔ ایک آواز کے ساتھ دوسری آواز۔ تسلسل کے ساتھ۔ پھر اچانک خاموشی اور مکمل سکوت۔ پھر کوئی ایک آواز۔ اس کے ساتھ ہی کوئی درجن دوسری آوازیں۔ پھر لمحہ بھر کا سکوت۔

ان آوازوں میں ایک طرح کی گھبراہٹ تھی۔ غیر معمولی یا گونج جیسی بھی نہیں جو غصّہ میں نکالی جاتی ہیں۔ وہ پھٹی پھٹی آوازیں، نکیلی آوازیں، چڑھتے ہوئے سُروں کی آوازیں۔ ایسی آوازیں جو آپ کے اندر کسی خوف کے پیدا ہونے سے نکلتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کے دل میں اختلاج کی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے۔

اب یہ آوازیں دوسرے لوگ بھی سن رہے تھے۔ کلاس روم میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ کھڑکیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

مسز انڈرسن نے پوری کوشش کی کہ یہ لوگ ان آوازوں کی طرف دھیان نہ دیں۔ وہ بلند آواز میں پڑھنے لگیں۔ ہماری توجہ اپنی طرف کرنے کے لئے انھوں نے میز تھپتھپایا۔ ان کی آواز کلاس روم میں گونجنے لگی۔ باہر کی آوازوں کی گونج بھی بڑھتی گئی۔ ہم نے انھیں اسکول کی دیواروں کے اوپر سے گزرتے سنا۔

مسز انڈرسن ابھی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے کتابیں میز پر رکھیں اور کلاس روم میں ٹہلتے ہوئے کھڑکیوں کو بند کیا۔ ان کے شیشوں کو سبز رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا کہ دھوپ کی تمازت سے لوگ محفوظ رہیں۔ کھڑکیاں بند کی گئیں تو ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ہرے اندھیرے میں گھِرا ہوا محسوس کیا۔ اب مسز انڈرسن کی آواز کلاس روم میں گونجنے لگی تھی۔ وہ پھر سے الجبرا کے اصول سمجھا رہی تھیں۔

جب اسکول کی گھنٹی بجی تو مسز انڈرسن نے چھٹکارا محسوس کیا۔ کلاس چھوڑنے سے قبل

انھوں نے سختی سے تاکید کی ہم لوگ تاریخ کی کتاب کو جی لگا کر پڑھیں اور شور نہ مچائیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کلاس سے باہر چلی گئیں۔

جوں ہی وہ کلاس روم سے باہر نکل گئیں ہم لوگوں نے اپنی کھڑکیاں کھول لیں۔ ہمیں دور تک اس لیے نظر نہیں آتا تھا کہ ہمارے اسکول کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ہجوم جا چکا تھا۔ ہر چیز ساکت ہو گئی۔ تب ہم نے آگ بجھانے والے انجن کی آواز سنی۔ ایک ہی منٹ میں وہ ہمارے پاس سے گزر گیا۔ کسی نے آسمان میں دور کی طرف اشارہ کیا اور ہم نے دیکھا کہ وہاں دھنویں کی لکیر اٹھ رہی ہے۔ ہمیں اس کا علم نہ ہو سکا کہ آگ کہاں لگی ہے۔

کسی نے کہا۔ سوچو تو اس وقت کون پٹنگ کر رہا ہوگا۔ اس کا جواب کسی نے بھی نہ دیا۔ ہم سب پیٹنگ کو بھول چکے تھے۔

پھر مسز اینڈرسن ہماری طرف آئیں۔ ہم لوگ اپنی اپنی میزوں سے جا لگے۔ ہاتھ ہونٹوں پر رکھے وہ ہماری طرف گھورنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے خفا نہیں تھیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے تھا۔ میز تھپتھپاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ باقی دن کے لیے کلاس منسوخ کر دی گئی ہے اور ہمیں بسوں میں اپنے اپنے گھر بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔

کیوں؟ کسی نے دریافت کیا۔ وہ اس پر خفا ہوئیں اور کہا کیا تمہیں تعطل نہیں چاہیے؟

ہم لوگ خاموشی کے ساتھ کلاس روم سے نکل آئے اور کھیل کے میدان میں اکٹھے ہو گئے۔ اسکول کے سارے بچے باہر قطاریں کھڑے رہے۔ لوہے کی بڑی بڑی گیٹیں کھل گئیں۔ پھر اچانک ماحول ہراسان ہو گیا۔ اگلی قطاروں کے بچے سر اٹھا اٹھا کر تعجب سے ادھر ادھر دیکھنے لگے جب ہم گیٹ کے پاس پہنچے تو ہم لوگوں نے دیکھا کہ وردی پہنے پولس کی ایک ٹولی ہمارے اسکول کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ میں نے ٹبلو سے پوچھا۔

تم ایڈیٹ۔ اس نے کہا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ لوگ ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔

ہم لوگ خاموشی سے اپنی اپنی بسوں میں سوار ہو گئے۔ اس دفعہ ہر شخص کھڑکی سے لگ کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ جوں ہی بس روانہ ہوئی ہمیں احساس ہو گیا کہ ان پیار گھنٹوں میں ان

گلیوں کا نقشہ بدل چکا ہے۔ ہر روز ہم اُن گلیوں کو دو بار دیکھتے تھے۔ اب وہ گلیاں ہمیشہ کی طرح نظر نہیں آرہی تھیں۔ فٹ پاتھوں پر سے لوگ گزرتے رہتے اور وہاں خرید و فروخت بھی ہوتی۔ اب یہ گلیاں ان سے خالی تھیں۔ صرف پولس کے چند پہرہ دار تھے۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ کونوں میں لگی پان کی دکانیں بھی بند تھیں۔ ہم میں سے کسی نے انھیں کبھی بند نہیں دیکھا تھا۔ تب بس ایک ایسی تنگ گلی میں مڑی جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس گلی میں تھوڑی سی چہل پہل تھی۔ لوگ دیواروں کے کونے سے لگے کھڑے تھے اور ہماری بس کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ خاموش ہی خاموش انھیں کسی انہونی حادثہ کا انتظار تھا۔

شکر خدا کا میں نے اپنے آپ سے کہا تھا "اّا اور منے اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔

طبلو نے میری کہنی کو جھٹکا مارا اور گلی کے نکڑ پر ٹھہرے ہوئے رکشہ کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے دیکھا اور اُسی کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ ہماری نگاہیں اُسی پر جمی رہیں گو ہم لوگ بہت آگے نکل چکے تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم اسے اس طرح گھورتے۔ ہم لوگ جب بھی باہر نکلتے رکشاؤں کو بے ترتیب رکھا ہوا پاتے۔ ہم ایک رکشہ کو دیکھتے رہے۔ جس انداز سے رکشہ وہاں رکھی گئی تھی وہ سب کی دلچسپی کا سبب تھا۔ ہم اس مقصد کو سمجھ نہ سکے جس مقصد سے رکشہ وہاں رکھی گئی تھی۔ اس لمحے ایک لاوارث پڑے ہوئے رکشہ کے صد درجہ معمولی زاویے میں ہم اپنی کائنات کی بے ترتیبی کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔

اس کے بعد ہماری بس پارک سرکس کی طرف مڑی اور پھر اچانک ۔ وہی آوازیں ہمارے چاروں طرف پھیل گئیں۔ ویسی ہی بھونڈی گونجتی ہوئی آوازیں۔ میں نے سرکس کے پاس جمع ہوئے لوگوں کو اس بس کے شیشے کے اندر سے دیکھا۔ اتنے میں مجمع کے چند لوگ آگے بڑھتے ہماری طرف آئے۔ بس کے اچانک بریک لگانے سے زور کا دھکا لگا تو میں اپنے پاؤں کے بل اُچھل پڑا۔

اسٹیرنگ سے کشتی کرتے ہوئے ڈرائیور نے بس کو موڑا۔ اس کے دو پہئے فٹ پاتھ پر چڑھ گئے اور ایک زوردار جھٹکا پڑا۔ لیکن پھر اُسے سڑک پر لا دیا گیا۔ گیروں کے بدلنے کی آواز کانوں میں چُبھ رہی تھی۔ اس کے بعد بس آہستہ سے آگے بڑھنے لگی۔

جو لوگ پیچھے دوڑ کر آ رہے تھے وہ لوگ بس سے چند منٹ کے فاصلے پر رہ گئے۔ جب بس پر پتھروں کی بارش ہونے لگی تو ہم لوگ اپنی اپنی کرسیوں کے اندر گھس گئے۔ پھر بس کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور ہم لوگ انھیں چھوڑ کر بہت آگے نکل گئے۔ جب ہم لوگوں نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا تو چند لوگ ایک دوسرے کے کاندھوں پر ہاتھ ڈالے ہنس رہے تھے۔

ایک اور نکڑ پر ڈرائیور نے بس کو ایک ایسی گلی میں گھسا دیا جسے ہم پہچان نہ سکے۔ طبلو ڈرائیور کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور ڈرائیور سے کہنے لگا کہ وہ اس کے گھر کا راستہ نہیں ہے۔ وہاں سے وہ اپنے گھر واپس نہ ہو سکے گا۔

بس کی رفتار میں کمی کیے بغیر ڈرائیور نے طبلو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور دبا کر اُسے اپنی سیٹ پر بٹھا دیا۔

ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھا۔ ہم لوگ ان گلیوں کو پہچان نہ سکے جن پر سے ہم گزر رہے تھے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم اپنے اپنے گھر کی طرف جا رہے ہیں کہ نہیں۔ گلیاں خود اپنا راستہ بھول چکی تھیں۔ خود ہمارا شہر ہمارے خلاف ہو گیا تھا۔

اب طبلو رونے لگا۔ ہم لوگ ایک ایک کر کے اس کے اطراف جمع ہوئے۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ہم اُس کا مذاق اڑاتے۔ لیکن اس وقت ہم خاموشی سے اُس کی باتیں سنتے رہے۔ وہ بہت رو رہا تھا۔ ہم اُسے کچھ نہ کہہ سکے۔ اُس سے پوچھ بھی نہ سکے کہ اُس کی تکلیف کیا ہے۔ اُس کی ہچکیوں میں بے پناہ درماندگی تھی۔

وہ گھر پہنچنے تک اُسی طرح روتا رہا۔ وہ ہم سب کے لیے روتا رہا۔

یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ ہم سب خائف تھے۔ ہم خوف سے حواس باختہ ہو چکے تھے۔

وہ ایک ایسا خوف تھا جسے نہ تو آپ بھول سکتے ہیں اور نہ ہی اُس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ یہ خوف ان لوگوں کے خوف جیسا تھا جو زلزلے کی زد میں آتے ہیں۔ ان لوگوں کا خوف جو زمین کے استقلال میں اپنا یقین کھو چکے ہیں۔ لیکن یہ بالکل ویسا بھی نہیں تھا۔ اس کی مثال ہی نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس کا مقابلہ کسی فطری خوف سے نہیں کیا جا سکتا جو

آفاقی ہے۔ اس کا موازنہ حکومت کے جبر سے بھی نہیں کیا جا سکتا جو موجودہ دنیا میں عام ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسا خوف ہے جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ معمول کی زندگی تو محض ایک اتفاق ہے اور ہمارا ماحول اور وہ گلیاں جن میں ہم رہتے ہیں وہ ہمیں خبردار کیے بغیر اچانک ہماری مخالف ہو جاتی ہیں اور ایسے ریگستان میں بدل جاتی ہیں جہاں اچانک سیلاب آ گیا ہو۔ اسی سبب برصغیر کے رہنے والے ہزاروں لاکھوں انسان دنیا کے دوسرے انسانوں سے مختلف ہیں۔ اس کا سبب نہ زبان ہے، نہ غذا، نہ موسیقی — یہ تو تنہائی کا ایک خاص وصف ہے جو اس ڈر سے پھلتا پھولتا ہے کہ آپ کو ایک جنگ لڑنی ہے اپنی ذات اور اپنے ہی اس عکس کے درمیان جو آپ کو آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔

جمعرات کی صبح جب روبی جاگا تو وہ دیر تک بستر ہی میں پڑا رہا اور آم کے درخت پر بیٹھی چڑیوں کی چہک کو غور سے سنتا رہا۔ ساتھ ایئرپورٹ جاتی ہوئی ٹریفک اور گلی میں سے گزرتی ہوئی سائیکلوں پر سے دودھ کی کپانوں کی آواز بھی آتی رہی۔ باہر ان آوازوں نے اس کے ذہن کو سلب کر لیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی کے قریب پہنچا۔ اگر کہیں کوئی آفت آئے تو وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے وہ دیکھے۔ آفت کی نوعیت کس طرح کی ہوگی اسے یقین نہ تھا۔ شمالی ہند کے بورڈنگ اسکول کے علاوہ کناڈا اور رومانیہ دو ہی جگہیں ایسی تھیں جہاں وہ رہ چکا تھا۔ وہاں تو ایسی کوئی آفت نہ تھی۔ اگر کوئی آواز سنی بھی تھی وہ بورڈنگ اسکول کے دیواروں تک محدود تھی۔

پرانے مکان تک پہنچنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ اس صبح وہ علاقہ اندیشے سے پاک ہو۔ اسے اس بات کی پروا نہ تھی کہ ان آفتوں کا سامنا کرنے کے لیے وہ گھر میں بیٹھے رہیں یا گھر سے باہر جائیں۔ دونوں صورتوں میں یہ تماشہ ہی تھا۔ انھیں بہرحال باہر جانا ہوگا۔

گذشتہ کئی دنوں سے ایسی کوئی بات اُدھر نہیں ہوئی تھی اور اس دوران ماشی کی بےچینی بڑھتی جارہی تھی۔ گذشتہ رات کھانے پر اس کے باپ کو راضی ہونا ہی پڑا۔ اس نے کہا تھا۔ ٹھیک ہے وہ لوگ جا سکتے ہیں لیکن انھیں اپنے ہمراہ سکیورٹی گارڈ کو لے جانا پڑے گا۔

روبی نے کھڑکی میں سے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ سرما کے سورج کی کرنوں سے باغ دمک رہا تھا۔ بڑی مکھیاں پر پھیلائے پھولوں پر بیٹھی ان کا رس چوس رہی تھیں۔ نظر ہٹا کر اس نے سڑک کی طرف دیکھا۔ مسٹر حق اُن کا پڑوسی ہمیشہ کی طرح ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے گلاب کے پھول سونگھ رہا تھا۔ آفت جیسا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ماحول سے مطمئن ہوکر وہ نیچے گیا۔ پھر ترویب اور ممّی کو اطلاع دی کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اب لوگ باہر نکل سکتے ہیں۔

کئی دنوں کے بعد روبی کو جو بات یاد رہی وہ یہ تھی کہ میری دادی نے اس دن باہر نکلنے سے پہلے دوبار اپنی ساڑی بدلی تھی۔ جب وہ ناشتے پر آئی تھی تو وہ استری کی ہوئی سادہ اور سفید ساڑی میں ملبوس تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ فوراً نکلنا چاہتی ہے لیکن جب آفس سے سیکورٹی گارڈ کو لے کر مرسیڈیز کار آپہنچی تو اس نے اپنے پر گہری نظر ڈالی۔ پھر وہ اُوپر گئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس ہوئی تو دوسری سفید ساڑی پہنی ہوئی تھی جس کا بارڈر سبز تھا۔ سب تیار ہوکر کار میں بیٹھ گئے۔ تب میری دادی کو یاد آیا کہ وہ میکانک کی بیوی کے لیے جو تحفہ لائی تھی وہ گھر میں بھول آئی ہے۔ اور جب وہ دوبارہ واپس ہوئی تو وہ سُرخ بارڈر والی سفید ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ اس کی ماں اس بات پر خوب ہنسی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایسے جارہی ہے جیسے کوئی دُلہن پہلی بار اپنے گھر جاتی ہے۔ اُسے یہ بھی یاد تھا کہ دادی نے کس طرح مسکرا کر اُسے جواب دیا تھا۔ تم غلط کہہ رہی ہو۔ میں پہلی بار اپنے گھر ایک بیوہ کی حیثیت سے جارہی ہوں۔

کار میں بیٹھا روبی گلیوں کو دیکھتا رہا کہ کوئی آفت تو آنے والی نہیں ہے۔ بہت جلد اُسے مایوسی ہوئی۔ نئی مارکٹ کی ساری دُکانیں کھلی تھیں اور گلیوں میں ہمیشہ کی بھیڑ تھی۔ کاریں، سائیکل رکشائیں اتنی تھیں کہ کسی کے سی۔ ڈی نمبر پلیٹ کی طرف دوبارہ دیکھنے

کی فرصت نہ تھی۔

کار چلاتا ہوا ڈرائیور میری دادی کو مختلف مقامات کے نام بتاتا جا رہا تھا۔ پلازا پکچر پیلیس۔ اس پر بن ہر کا پندرہ فٹ کا اشتہار لگا ہوا تھا۔ گلشن پیلیس ہوٹل۔ رمنا ریس کورس وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب تو خوب ہے۔ اس نے کہا۔ لیکن ڈھاکہ کہاں ہے؟

جب وہ آگے بڑھتے ہوئے پل پر سے گزر گئے تو مناظر میں تبدیلی نظر آئی۔ گلیاں تنگ ہوتی جا رہی تھیں اور بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ مکانات پرانے اور بوسیدہ۔ میری دادی اپنی سیٹ کے کونے سے لگی جو کس بیٹھی تھی۔ وہ بیٹھی دیکھ رہی تھی اور ہوا کے مزے لے رہی تھی۔ کار ایک مصروف چوراہے کی طرف مڑی۔ اچانک اس نے مایا دیبی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ دیکھو صدر بازار، وہ رہی رائل اسٹیشنری۔ کیا تمہیں یاد نہیں؟ مایا دیبی نے اسے اپنے داہنے بازو سے سمیٹا۔ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے ہنستے اور آنسو بہاتے رہے۔ انھوں نے مجھے کو بتایا کہ جب وہ اسکول جاتی تھیں تو اسی بازار سے اپنی کتابیں خریدتی تھیں۔ وہ تو اس وقت بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا۔ آگے نکلتے ہوئے مایا دیبی نے کہا کہ صرف دکانوں کے نام بدلے ہوئے ہیں۔ میری دادی اس تبدیلی کے لیے بھی تیار نہ تھی۔ اس نے ترش ہو کر کہا ــــ نہیں مجھے ابھی ان کے نام یاد ہے۔ یہ وہی نام ہیں۔

چند منٹ بعد ان کی کار ایک تنگ گلی میں مڑی۔ گلیوں کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔ میری دادی کے لیے مشکل آن پڑی کہ وہ کس کس طرف دیکھے۔ یو نہی اچانک محسوس ہوا کہ جیسے کسی پرانی تصاویر کے البم کو دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنی سیٹ پر پہلو بدل کر بیٹھی اور تمام چیزوں کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ یہ تو وہی جگہ ہے جہاں فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ یہاں شیام الہری رہتا تھا۔ وہ رینا کا مکان ہے جس سے میں کچھ ہی دن پہلے پارک میں مل چکی ہوں۔ اس جگہ اُن سلاخوں کے پیچھے جواہرات کی دکان پر نریش بابو بیٹھا کرتا تھا اور اپنی دھونکنی سے سونے کی دھول صاف کرتا تھا۔

ایک تنگ، تنگ گلی پر پہنچ کر ڈرائیور نے کار روکی۔ گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس

نے مایا دیبی سے کہا۔ وہ رہا آپ کا مکان۔ یہیں تو سیف الدین کا کارخانہ ہے۔

میری دادی اس اچانک انکشاف پر بوکھلا کر احتجاج کرنے لگی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری گلی نہیں ہو سکتی۔ کانا بابو کی مٹھائی کی دکان کہاں ہے؟ وہاں اُس دکان میں تو لوہا بیچا جا رہا ہے۔ مٹھائی کی دکان کہاں چلی گئی؟

ڈرائیور نے افسوس کے ساتھ اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور کہا۔ وہاں مٹھائی کی دکان اب نہیں ہے۔ وہ سب جا چکا۔ اب صرف یہی ہے۔

پھر کار پر کوئی دھکا سا محسوس کرتے ہوئے ڈرائیور نے فوراً کار کا پٹ کھولا اور اس بچے کو جو مرسڈیز کے بانیٹ پر لگے ستارے کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا بھگا دیا۔ لڑکا بھاگ کر چند نوجوانوں اور بچوں کے جھرمٹ میں شامل ہو گیا۔ ان کی طرف شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے سیکوریٹی گارڈ کو کار کے پچھلے حصے کی حفاظت کے لیے کہا اور خود بانیٹ کی نگرانی کرنے لگا۔

وہاں! میری دادی نے گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلّا کر کہا۔ دیکھو! وہ ہمارا مکان۔ دیوار کی منڈیروں پر کائی جمع ہو گئی تھی اور بڑ کے درخت کی شاخیں ان پہ پھیل گئی تھیں لیکن مکان کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسے میری دادی کو یاد تھا۔ بہت پھیلا ہوا جیسے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ میری دادی نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور اُس وقت تک وہاں سے حرکت نہیں کی جب تک کہ روبی نے اس کا ہاتھ تھام کر یہ نہیں کہا۔ چلو ہم چل کر دیکھیں — آؤ تو۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ آگے بڑھتے ڈرائیور بھاگ کر مایہ دیبی کے قریب پہنچ گیا۔ اُس کے کان میں کچھ کہہ کر وہ ویسے ہی بھاگتا ہوا کار کی طرف لوٹ گیا۔ اس نے کیا کہا؟ روبی نے پوچھا۔ لیکن وہ تو ایک خواب کی طرح مسکراتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جواب پانے کے لیے اسے اپنا سوال دہرانا پڑا۔ اُس نے جواب دیا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم لوگ جلد لوٹ کر واپس چلیں ورنہ کوئی آفت نہ آن پڑے۔

وہ لوگ گلی کے اندر گئے۔ بچوں کا ایک ہجوم انھیں پیچھے سے گھیرے ہوئے تھا۔ ان میں

تو اکثر مٹے کے پیچھے لگے تھے ۔ مٹے کے بارے میں وہ کانا پھوسی کر رہے تھے جسے روبی سن رہا تھا۔ ایک چھوٹی بچی نے اپنے ہاتھوں سے مٹے کے ہاتھوں کو چھو لیا۔

اب وہ اپنے مکان کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے ۔ رنگ برنگی ساڑیاں ٹریس پر سکھانے کے لیے پھیلا دی گئی تھیں ۔ کھڑکیوں میں سے دیواریں، آن میں ٹھونسے ہوئے کیلے اور ان پر چھوٹے مچھر دان نظر آرہے تھے ۔ کچھ کپڑے بھی دیواروں سے لٹک رہے تھے ۔ کھڑکی سے لگے ایک سائن بورڈ پر لکھا تھا ۔ لطف اللہ اسمٰعیل ۔ بی اے، ایم اے (پٹنہ) جس سے آپ "ٹائپسٹ اور شارٹ ہینڈ کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں ۔

گیٹ کی تلاش میں روبی آگے بڑھتا گیا ۔ وہ دوڑتا ہوا واپس آیا ۔ منہ بنا کر کہنے لگا ۔ موٹر سائیکلس ۔ ہر طرف موٹر سائیکلس ۔

بابا دیپ اور میری دادی نے جس حیرت اور بے یقینی سے اس خبر کو سنا کہ صورت حال کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی ۔ انھیں کارخانے کا علم تھا لیکن اس چھوٹے سے باغیچہ میں جہاں وہ اپنے بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتی تھیں ایسی بات نہیں ہو سکتی ۔

یہ سچ نہیں ۔ میری دادی نے کہا ۔ یہ جھوٹ ہے ۔ لیکن جب وہ گیٹ کے قریب پہنچی تو سورج کی کرنوں کو اپنے ہاتھ کی آڑ میں کرتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو تمازت سے بچاتے ہوئے اس نے جو کچھ دیکھا اس سے روبی کی بات کی تصدیق ہوتی تھی ۔ پورٹیکو پر ٹین لگا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے نیچے موٹر سائیکل کے مڈگارڈ کو ٹھیک کر رہا تھا ۔ دھوپ سے اس کا عکس دور تک پڑ رہا تھا ۔ اس کے اس حصے پر جو باغیچہ میں تھا تیل پھیلا ہوا تھا ۔ اس پر پرانے ٹائر ٹیوب اور پائپس پڑے ہوئے تھے ۔

ہر چیز بدل چکی تھی ۔ اب میری دادی بھی ان سے بے تعلق ہو گئی ۔ یہ وہ مکان نہیں تھا جس کی یادیں اس کے ذہن میں تازہ تھیں ۔ وہ مکان جسے اس نے میرے لیے کلکتے میں بنایا تھا اس سے ملتا جلتا تھا ۔

میں اسے دیکھ سکتا ہوں صحن میں وہ گھوم رہی ہے ۔ گریز اور پرانے ٹائروں کی اسے پروا نہیں ہے ۔ بالکونیز کی طرف گھورتی ہوئی ۔ ان پر زنگ آلود لوہے کے پائپ ہیں ۔ لیمو کے اس

درخت کو دیکھتی ہوئی جسے اس کی ماں نے لگایا تھا۔ وہ اپنے ٹخنوں سے ہینڈ بارس کو چھوتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ آخر کار سیف الدین میکانک بڑے احترام سے اسے ایک جگہ بٹھا دیتا ہے۔ تب وہ اس کے آئیل بھرے چہرے کو دیکھتی ہے اور اس پر تعجب کرتی ہے کہ یہ نیا رشتہ دار جس کا چہرہ اسے یاد نہیں ہے گھر کے کس حصے سے نکل کر آیا ہے۔ اس حیرانی کو دور کرنے کے لیے مایا دیبی بڑی نرمی سے اس سے کہتی ہے کہ یہ سیف الدین میکانک ہے جو ان کے چچا کو ہندوستان منتقل کرنے میں ان کی مدد کرنے والا ہے۔ میری دادی جو چچا کے بارے میں سب کچھ بھول چکی ہے اسے پھر سے یاد کرتی ہے اور قوتِ ارادی پر زور دیتے ہوئے اسی اہم فرض کی طرف لوٹ آتی ہے۔ وہ اس لیے یہاں نہیں آئی کہ نسٹالجیا کا شکار ہو۔ وہ نسٹالجیا سے نفرت کرتی ہے ـــــ میری دادی ـــ اس نے کئی سال مجھے یہ بتانے میں بتائے کہ نسٹالجیا ایک کمزوری ہے۔ تضیع اوقات۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائے اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں آگے بڑھے۔ اب وہ اپنے آپ آہستہ سے دہرا رہی ہے کہ وہ کس فرض کی انجام دہی کے لیے یہاں آئی ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے کہ وہ اپنے چچا کو یہاں سے نکالے اور اسے اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگا دے۔

ہاں ٹھیک۔ جیتھو موشائی۔ اس نے سیف الدین سے کہا۔ وہ اب کیسے ہیں۔

سیف الدین جو گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا آدمی تھا اور چالیس دپچاس سال کی بیچ کی عمر کا آدمی تھا اس نے اپنی ہندوستانی زبان لیکن بنگالی لہجے میں بتایا کہ ان کی صحت خراب ہے۔ ان کے لیے جلد سے جلد کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔

میری دادی نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا اور اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ ایک خاکی رنگ کا پیپر پیکٹ تھامے ہوئے تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اسے وہ اپنے ساتھ کیوں لے آئی۔ سیف الدین سے باتیں کرتے ہوئے اچانک اس پیپر پیکٹ کا مقصد یاد آیا۔ تب اس نے اسے سیف الدین کے ہاتھوں میں تھمایا اور کہا ـــ یہ ساڑی تمہاری بیوی کے لیے ہے۔

سیف الدین کے سیاہ روغنی چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ پھر اس نے میری دادی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اپنی بیوی کو

آواز دے کر کہا کہ وہ ہندوستان سے آئے ہوئے مہمانوں کے لیے چائے لے آئے۔

لیکن کیا ہمیں وہاں جاکر اُن سے بات نہیں کرنا ہے؛ بابا دیبی نے کہا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

آپ لوگ چائے پیے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔ میکانک سیف الدین نے اصرار کیا۔ آخر آپ لوگ ہندوستان سے ایک لمبا سفر کر کے تو یہاں آئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ لوگ وکیل بابو سے ملنے کے لیے اپنے سے نہیں جائیں گے۔ آپ کو خلیل کا انتظار کرنا ہوگا۔

اور خلیل کون ہے؟ میری دادی نے کہا۔

خلیل اور اس کا خاندان وکیل بابو کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سیف الدین نے وضاحت کی۔ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ وہ بھی ہندوستان سے آیا ہے۔ بنگال میں مرشد آباد کے علاقے سے۔ کچھ احمق سا آدمی ہے لیکن دل کا بڑا اچھا۔ یہی تو میں سب سے کہتا ہوں کہ وہ احمق سہی لیکن دل کا اچھا ہے ورنہ وہ اس بوڑھے آدمی کی دیکھ بھال میں کیوں لگا رہتا۔ ایک ہندو کی۔ وہ چاہے تو اس بوڑھے کو نکال باہر کر سکتا ہے اور دونوں کمرے اپنے اہل و عیال کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

پھر وہ تردیب سے مخاطب ہوا۔ صاحب کیا آپ ہمارے کبھی موتی جھری گئے ہیں، میری پیدائش وہیں کی ہے۔

تردیب نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

سیف الدین نے مایوسی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس نے کہا۔ آپ جب واپس جائیں تو موتی جھری ضرور جائیں۔ بہت عمدہ مقام ہے۔ ویسے اب اسے کئی آفتوں کا سامنا ہے۔

خلیل کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ میری دادی نے سوال کیا۔

وہ سائیکل رکشہ چلاتا ہے۔ سیف الدین نے کہا اور ادھر اُدھر تھوڑا سا کام بھی کر لیتا ہے۔ اس قدر کہ اس کی بیوی بچوں کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ وکیل بابو جب تک کماتے تھے ان کے لیے ٹھیک ہی تھا لیکن اب تو وہ بستر پہ بیمار پڑے ہیں۔ نہ جانے اب یہ لوگ کس طرح

گزارہ کر رہے ہوں گے۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی ٹھوڈی کو ہاتھ لگایا۔ موتی ہری میں ہوٹلیں تو ہوں گی۔ اس نے تردیب سے پوچھا۔ میں نے سُنا ہے کہ اُس شہر میں کئی درجن سنیما ہال ہیں۔

کیا خلیل کی جورو ان کے لیے بھی پکاتی ہے۔ میری دادی نے آہستہ سے سوال کیا۔

کیوں نہیں سیف الدین نے کہا۔ اگر وہ نہ پکائے تو بڑے میاں کے لیے کھانا کہاں سے آئے۔

میری دادی اور مایا دیبی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیا تم جانتے ہو۔ دادی نے روبی سے کانا پھوسی کی۔ ایک زمانہ تھا کہ بڑے میاں کسی مسلمان کے سائے کو اپنے کھانے سے دس فیٹ کے فاصلے تک پڑنے نہیں دیتے تھے؟ اب انھیں دیکھو۔ اپنی گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔

دس فیٹ؟ روبی نے منّے کے کان میں چپکے سے کہا اور دس فیٹ کے ناپ پر حیرانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کس طرح سے فاصلہ ناپا ہوگا؟ اس نے دادی ماں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کیا وہ کھاتے وقت اپنی جیب میں ٹیپ رکھتے تھے؟

نہیں نہیں۔ میری دادی نے فوراً جواب دیا۔ اس زمانے میں کئی لوگ اپنے اصولوں کی پابندی اسی طرح سے کرتے تھے۔ ان میں ایک حس تھی۔

علم مثلث! روبی نے منّے سے فاتحانہ کہا۔ وہ لوگ ٹریگونامڑی سے واقف رہے ہوں گے۔ شاید اسے ریاضی کی طرح برتتے رہے ہوں گے۔ اگر کوئی مسلمان بیس فیٹ اونچی عمارت کے نیچے کھڑا ہو تو اس کا سایہ کتنی دور تک پڑتا ہوگا۔ تم دیکھو تو ہم لوگ آپ لوگوں کے مقابلے میں کتنے ہوشیار ہیں۔ شرط لگا لو کہ تمہارے دادا یہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ اُن کے کھانے پر دس فیٹ کے فاصلے سے گزرنے والے کسی جرمن کا سایہ پڑ سکتا ہے۔

لیکن کیسے؟ تردیب نے سیف الدین سے پوچھا۔ کیا خلیل اُن کے گھر میں رہنے آیا تھا یا حکومت نے اسے حاصل کر کے تقسیم کر دیا تھا؟

نہیں۔ سیف الدین نے کہا۔ وہ بھی ہم سب کی طرح یہاں آیا۔ لیکن ذرا دیر میں۔ کیا آپ نہیں جانتے تقسیم کے بعد وکیل بابو لوگوں کو اپنے گھر میں لانے کے لیے ان کے پاس دوڑتے پھرے تاکہ اُن کے خاندان والے اپنا حصّہ مانگنے کے لیے واپس نہ آئیں۔ وہ اپنی گیٹ کے پاس

کھڑے رہتے اور لوگوں کو خوش آمدید کہتے۔ خود ان کے بچے بہت پہلے جا چکے تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کہاں گئے۔ ایک بار اُن کا ایک لڑکا آیا تھا۔ لیکن وکیل بابو نے اُسے واپس کر دیا۔ خلیل ہمارے آنے کے کئی دنوں بعد یہاں آیا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ خالی ہاتھ آیا اور وکیل بابو نے اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اس وقت سے خلیل اُن کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

اُس نے کنکھیوں سے سب کی طرف دیکھا ـــ اور ہاں۔ اس نے کہا۔ آج کل وہ پریشان حال ہے۔ اب وہ ان کی دیکھ بھال سے قاصر ہے۔

بے چارے بڑے میاں۔ میری دادی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ تمہارا خیال ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ چلنا پسند کریں گے۔

کون جانے۔ سیف الدین نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کا ذہن بھی برابر کام نہیں کرتا ہے۔ لوگوں کو ٹھیک سے پہنچانتے بھی نہیں۔ اسی لیے تو اُن سے ملنے کے لیے آپ کو خلیل کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ بہیں پر بوڑھے ہوئے ہیں۔ میں اپنے باپ کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ موتی ہری چھوڑ کر ہمارے ساتھ پاکستان آئیں۔ وہ بھی تو وہیں پر بوڑھے ہوئے ہیں.... لیکن اب آپ کو کوشش کرنا ہے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

باہر گلی میں ربر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک رکشہ گیٹ میں سے گزر کر تیزی سے صحن میں آ رہا۔ اس کا ڈرائیور رکشہ کے ایک پیڈل پر کھڑا اُترنے لگا۔

یہی خلیل ہے۔ سیف الدین نے کہا۔ اکثر وہ اپنے سر کے بل گر پڑتا ہے۔ ڈِھشوم! اس کا سر بڑا مضبوط ہے۔

خلیل رکشہ سے کود پڑا۔ رکشہ ابھی بھی حرکت میں تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین پر آ رہا لیکن پھرتی سے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ مضبوط پنڈلیاں۔ کشادہ کاندھے۔ چہرہ پر بھرپور جوانی۔ اپنی لنگی کو پیٹتا ہوا بڑی عزت سے اُس نے اپنا سر سیف الدین کے آگے جھکایا اور کہا۔

کیا ہے صاحب؟ اس کے سر کے زاویے سے یہ واضح تھا کہ وہ میکانک کی بڑی عزت کرتا ہے۔

خلیل۔ یہ لوگ وکیل بابو کے رشتہ دار ہیں۔ سیف الدین نے کہا۔ میں نے تمہیں ان کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ لوگ اتنی دور کا سفر کر کے ہندوستان سے آئے ہیں کہ انھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ وکیل بابو کو منانے کے لیے تم سے جو کچھ بن پڑے کر ڈالو۔

خلیل نے اُن کی طرف دیکھ کر منہ کھول دیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ اُس کے سامنے کے دانتوں میں بڑا گیپ تھا۔ مٹے نے بعد میں بتایا کہ اُس کی بے ساختہ ہنسی نے اُس کا دل جیت لیا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادھی شرمیلی ہنسی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ یہ بتا سکتی تھی کہ وہ کوئی گنوار ہنسی نہیں تھی۔ اس کے برخلاف اس کے ذہن کی ایک خرابی تھی۔

خلیل نے اپنا سر ہلاتے ہوئے ڈوبتی لیکن گہری آواز میں کہا۔ وہ نہیں جائیں گے۔ اُن سے بات کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ وہ نہیں جائیں گے۔

خلیل۔ میکانک نے فوراً کہا۔ تمہیں یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا۔ انھیں آمادہ کرنے کے لیے تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اُن ہی کی خاطر۔ اب وہ یہاں زیادہ محفوظ نہیں ہیں۔

خلیل نے کاندھے ہلائے۔ ٹھیک۔ اس نے کہا۔ آپ کوشش کریں لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ اس کا کوئی حاصل نہیں۔ وہ نہیں جائیں گے۔

اُس نے اشارے سے اُن لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میری دادی کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مشکل نہ ہوئی۔ تردیپ نے اس کی مدد کی۔ مایا دیبی نے ہاتھ پکڑا اور وہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رُکے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

آخر کار ہم لوگ گھر کی اچھی بُری حالت دیکھ سکیں گے۔ میری دادی نے کہا۔

خلیل نے دھکیل کر دروازہ کھولا اور انھیں اندر لے گیا۔

کمرہ بہت بڑا تھا اور کچرے سے بھرا ہوا تھا۔ صفائی نہ کرنے کی وجہ نہیں بلکہ لوگوں کی کثرت سے۔ دیواروں سے پلاستر گر چکی تھی۔ چھت پر کہیں شہد کی مکھیوں کے چھتے اور کہیں مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ فرش پر پرانے ٹیوبس اور زنگ آلود لوہے کا سامان پڑا تھا۔ دیواروں کے شلفوں میں کتابیں اور فائلیں الٹی پڑی تھیں۔

بابا دیبی اور میری دادی نے ایک دوسرے سے گلے مل کر ہنسنا شروع کر دیا۔ اچھی بری حالت کچھ نہیں ہے۔ میری دادی نے کہا۔

ساڑی پہنی ہوئی ایک عورت جس کے گھٹنوں سے دو بچے چمٹے ہوئے تھے دور پردے کے پیچھے سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ امی! خلیل نے اس سے کہا۔ ان کے لیے چائے بناؤ۔ فوراً۔ یہ لوگ وکیل بابو کے رشتہ دار ہیں اور کلکتے سے آئے ہیں۔

پردہ ڈھل گیا اور وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ لیکن بچے ٹھہرے رہے اور چمکدار گول گول آنکھوں سے ان کو دیکھتے رہے۔

خلیل جب تک دوسرے کمرے میں نہیں گیا ان لوگوں نے بڑے میاں کو نہ دیکھا۔ کمرے کے آخری کونے میں ایک اونچی پلنگ پر وہ بیٹھا ہوا تھا اور کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اسے آنے والوں کی خبر بھی نہ تھی۔ روبی چونکا۔ اس نے اس قدر خفیف آدمی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس قدر بوڑھا تھا کہ بچہ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ٹھڑا ہوا۔ ننھا منا سا منہ کے دونوں طرف سے تھوک بہتا ہوا۔

جب میری دادی کی نظر بڑے میاں پر پڑی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جلیبھ موشائی۔ وہ چلائی۔ آخر کو ہم گھر آگئے.....

تب اس نے دادی کو دیکھا اور اپنے سر کو گھمایا کہ اس کو اچھی طرح دیکھ کر پہچانے۔

سر پر پلو ڈالتے ہوئے دادی تیزی سے اس کے قریب گئی۔ ہم لوگ واپس آگئے ہیں۔ جلیبھ موشائی۔ اس نے کہا۔ اس کی آواز روہانسی تھی۔ ہم لوگ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔

رک جاؤ۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اپنے اطراف پھیلے ہوئے میلے تکیے اور گاؤ تکیوں کو چادر سے ڈھانکنے لگا۔ رکو، رکو، رکو۔ عورتو۔ تم کیا کر رہی ہو۔ رکو۔

میری دادی سکتے میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ رکو سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ اس نے کہا۔ اس کی پھٹتی ہوئی آواز اس کی انا کو ٹھیس پہنچا رہی تھی۔ کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں تمہیں...

اے عورت۔ تو کون ہے میں جانتا ہوں۔ طیش میں آکر اس نے کہا۔ اس کی باریک آواز

ھڑانے لگی۔ میں اپنے موکلوں کو اپنے قریب آنے نہیں دیتا۔ میرے باپ نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ کہا کرتا تاکہ یہ بڑی غلط عادت ہے۔ تم وہاں اسٹول پر جاکر بیٹھو اور بتاؤ تمہارا کیا کیس ہے؟

میری دادی حیرت میں پڑ گئی۔ اُس کا حکم بجا لاتے ہوئے وہ اسٹول پر جا بیٹھی۔

بڑے میاں نے اپنی اُنگلی سے خلیل کی طرف اشارہ کیا اور دوسروں کی طرف ایک نگاہِ غلط ڈالتے ہوئے کہا۔

اُن سے کہو کہ باہر کیو میں کھڑے رہیں۔ میں باری باری سے اُن سے ملوں گا۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ موکل سے نہیں ملتا۔

اب میری بات سنو، وکیل بابو۔ یہ لوگ آپ کے رشتہ دار ہیں۔ خلیل نے سماجت کی۔

یہ لوگ موکل نہیں ہیں۔ آپ کے رشتہ دار ہیں۔ رشتہ دار۔

لیکن بڑے میاں کچھ سن نہیں رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں منّے کی طرف لگی تھیں۔ اُن کا لٹکتا ہوا منہ کھل کر پھیل گیا تھا اور دانتوں کی درازوں کے بیچ میں سے ان کی زبان باہر نکل گئی تھی۔

کھلنڈرے پن سے بڑے میاں نے منّے کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

مسکراہٹ میں اس نے جواب دیا۔

وہ دوسرے ملک کی ہے وکیل بابو۔ خلیل نے چیخ کر کہا۔ اس قدر زور سے کہ روبی نے اپنے پاؤں میں اس کی آواز سنی۔ وہ تمہارے رشتہ داروں کے ساتھ کلکتے سے آئی ہے۔

میں جانتا ہوں۔ بڑے میاں نے اس کی طرف پلک جھپکاتے ہوئے کہا۔ میں جانتا ہوں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ کلارا لو میری پک فورڈ۔ میں جانتا ہوں۔

وکیل بابو کا سر معلومات سے بھرا پڑا ہے۔ خلیل نے فخر کے ساتھ میری دادی سے کہا۔

تم کیسی ہو؟ بڑے میاں نے انگریزی میں سوال کیا۔ اُن کے دانتوں سے ہوا خارج ہو رہی تھی۔ تم کیسی ہو؟

اُن کے ذہن میں کوئی خیال آیا اور انھوں نے اپنا سر دیواروں کی طرف اُٹھایا۔ اُن کی آنکھوں کے پُتلے ایسے لگ رہے تھے جیسے انڈے کی سفیدی میں چھید مار دیا گیا۔ انھیں وہ مل

گیا جس کی تلاش تھی۔ پھر انھوں نے اپنا ہاتھ آہستہ سے دیا سلائی کی طرف بڑھایا۔

وہاں انھوں نے ایک پکچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے شہنشاہ۔ خدا ہمارے رحم دل بادشاہ کو محفوظ رکھے۔

پکچر پر اتنی دھول پڑی تھی کہ اس کے فریم میں روبی کو ایک داڑھی جیسی شکل نظر آئی اور اس کے اوپر دھول کے مرغولوں سے مکڑی کے جالوں سے بھرا ایک تاج دکھائی پڑا۔

بڑے میاں نے گانا شروع کیا۔ خدا محفوظ رکھے ہمارے رحمدل... لیکن دھن بھول جانے کی وجہ اس نے ترنم کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

منے خوب ہنسی۔ اس نے بھی گانا شروع کیا۔

پھر اچانک ان کا منہ کھل گیا اور تردد سے چہرے پر سیاہی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

خلیل۔ انھوں نے کہا۔ ایک سیٹی جیسی ان کے کمرے میں گونجی۔ خلیل بھاگو۔ فوراً بھاگو اور جلدی سے ٹائلٹ پیپر لے آؤ۔

وہ کیا ہے؟ خلیل نے دریافت کیا۔ کس لیے؟

کیا پتہ اس خاتون کو ضرورت پڑ جائے۔ بوڑھے میاں نے کہا۔ میرے باپ ہمیشہ کہا کرتے جب کبھی کوئی باہر کے ملک سے آئے تو یاد رہے کہ سب سے پہلے تمہیں ٹائلٹ پیپر خریدنا چاہیے۔ وہ جانتے تھے۔ انھوں نے کتابیں پڑھی تھیں۔

وکیل بابو۔ اس کی فکر نہ کریں۔ خلیل نے کہا۔ وہ صبح صبح اس سے فارغ ہو چکی ہیں۔

تم کیسے جانتے ہو؟ کیا اس نے تم سے کہا ہے۔ تم تو انگریزی سے واقف ہی نہیں ہو۔

میری دادی بے چین ہونے لگی۔ مزید برداشت کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ اچک کر کھڑی ہو گئی اور چلائی۔ جیبیتو موشائی کیا تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟

جب انھوں نے آہستہ سے مڑ کر میری دادی کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ اے عورت کیا میں نے تم سے کہا نہیں کہ بیٹھ جاؤ۔ انھوں نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔

فرمانبرداری کے ساتھ میری دادی پھر سے بیٹھ گئی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے؟ وہ اپنے ہاتھوں کو جنبش دیتی ہوئی منمنائی۔ آپ۔ آپ کے سگے بھائی کی بیٹی ہوں۔

ٹھیک ہے عورت۔ انھوں نے کہا۔ اپنے کیس کی وضاحت کرو۔ کس سے متعلق ہے؟

تب تردیب نے مداخلت کی۔ اب سنئے۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ہم آپ کے رشتہ دار ہیں۔ ہم آپ کو یہاں سے لے جانے آئے ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ اپنے بھائی کے ساتھ اس مکان کے دوسرے حصّے میں رہتے تھے۔

بڑے میاں کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ مر گئے۔ انھوں نے کہا! ان کی آواز فاتحانہ تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا چہرہ گدھ کی طرح تھا۔ اور دوسری زہریلی ناگن تھی جو دیکھنے میں تو مُنّی سی حسین لگتی تھی۔

تردیب نے قہقہہ لگایا۔ ٹھیک۔ اب وہ آپ کو یہاں سے لے جانے آئے ہیں۔

وہ تو کسی کباڑ خانے میں غائب ہو گئے۔ بڑے میاں کہنے لگے۔ میں باہر نکلا۔ ہر اس شخص کو گھرنے آیا جو مجھے پہلے ملا۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ وہ لوگ واپس آئیں۔

وہ دانت پیسنے لگے۔ تردیب دیکھتا رہا کہ کس طرح اُن کے بے دانت کے کالے مسوڑوں سے بدخواہی آشکار ہے۔

میں انتظار کر رہا ہوں کہ وہ لوگ واپس آئیں تاکہ میں انھیں چھوٹی بڑی عدالتوں سے لے کر وائسرائے کونسل تک کھینچوں۔ میرے کزن برا جن کہا کرتے کہ قانون کے مطابق قبضے اور ملکیت میں بہت کم فرق ہے۔ دس میں نو حصّے قابض کے ہیں۔ وہ جانتا تھا کیونکہ اس نے مٹھی بھر جائیداد کے لیے اپنے چچا کو ایک ایک عدالت کا پانی پلایا تھا اور اس کا حصّہ ہڑپ کر لیا تھا۔

یہ سچ ہے مایا دیبی نے تردیب سے کہا۔ مجھے یاد ہے کہ وکیلوں کی فیس دینے کے لیے اسے اپنی زمین فروخت کرنی پڑی تھی۔

صرف مٹھی بھر جائیداد کے لیے۔ بڑے میاں نے چھت کی طرف گھورتے ہوئے مایا دیبی کا جملہ پورا کیا۔ یہی خون تو میری رگوں میں ہے۔ اُنھیں ذرا آنے تو دو۔ پتہ چل جائے گا۔

وہ لوگ آ گئے ہیں۔ میری دادی نے بڑی نرمی سے کہا۔ لیکن آپ سے عدالتوں میں لڑنے کے لیے نہیں۔ ہم کو مکان نہیں چاہیے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ گھر لے جانے آئے ہیں۔ یہاں آپ محفوظ نہیں ہیں کبھی بھی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ جب تک کہ آپ اس لائق ہیں کہ یہاں سے نکل سکیں

چل پڑیں۔

چل پڑیں؟ بڑے میاں نے مذاق اُڑانے کے انداز میں کہا۔ کہاں کے لیے چل پڑیں؟

یہاں آپ محفوظ نہیں ہیں۔ میری دادی نے فوراً جواب دیا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ لوگ آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال کر رہے ہیں لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ بڑے میاں بڑبڑائے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ایک بار چل پڑو تو پھر آپ رکتے کہاں ہیں۔ یہی بات تو میں نے اپنے بیٹوں سے کہی تھی جب انھوں نے ٹرین پکڑی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے انڈیا شنڈیا میں میرا یقین نہیں ہے ٹھیک ہے کہ اب تم جا رہے ہو لیکن فرض کرو کہ جب تم وہاں پہنچو اور وہ لوگ فیصلہ کریں کہ ایک اور سرحد کی لکیر کھینچی جائے تو تب تم کیا کرو گے؟ تم کس طرف چل پڑو گے؟ کوئی بھی تمہیں اپنانے کو تیار نہ ہوگا۔ میرا جہاں تک تعلق ہے میں یہیں پیدا ہوا اور یہیں مروں گا۔

یہ سن کر میری دادی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ان سے بات کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ہم کو جو کرنا تھا کر چکے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ پاگل پن ہے۔ انھیں یہاں سے نکالنے کے لیے ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

اس پر خلیل نے فوراً اپنے ہاتھ اُٹھائے اور میری دادی سے مخاطب ہوا۔

آپ ان کی بات نہ سنیں۔ وہ چلّایا۔ یہ صرف اس لیے کہہ رہے ہیں کہ سارے مکان پر اپنے قبضے کا حق جتائیں۔ لیکن یہ اب کچھ نہیں کرسکتے۔ آپ انھیں لے بھی نہیں جاسکتے" وہ نہیں جائیں گے۔ اب یہ میرے بچّوں کے لیے دادا کی طرح ہیں۔ ان کے بغیر وہ کیسے خوش رہیں گے۔

میکانک نے انھیں اپنی بغل میں لیتے ہوئے دیوار کی طرف کھسکایا۔

یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ میکانک نے کہا۔ مکان پر قبضہ کرنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ خلیل کتنا سادہ لوح ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ انھیں لے جائیں۔ اس میں انھیں کی بھلائی ہے۔ ادھر انھوں نے کئی لوگوں سے دشمنی مول لی ہے۔ گذشتہ جب حالات خراب ہو گئے تھے تو ان کی حفاظت کرتے ہماری جان پر بن آئی تھی کون جانے اگلی بار کیا ہو۔

آپ انھیں یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔ خلیل چیخ کر کہنے لگا۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔
تب اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔ خلیل کی بیوی تھی۔ پردے میں آدھی چھپی ہوئی۔
انھیں ساتھ لے جائیں۔ اس نے کہا۔ خلیل نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسے تو ان کے لیے پکوان کرنا اور کھلانا ہے نہیں۔ ہمارے دو اور بچے ہیں۔ ہم لوگ کہاں تک سنبھال سکتے ہیں۔ پیسہ کہاں سے آئے گا؟

وہ لوگ خاموش گم صم بیٹھے رہے اور ابھی کوئی فیصلہ ہی نہ کر پائے کہ ان کا ڈرائیور دوڑتا ہوا آیا۔

مادام جلدی سے چلیں۔ وہ چلایا۔ ہمیں چل پڑنا چاہیے۔ باہر کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔
اتنا کہہ کر وہ بھاگا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میری دادی نے فیصلہ سنایا۔
سنو خلیل۔ اس نے کہا۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اب ہم انھیں یہاں سے لے جائیں گے اور کچھ دن کے لیے ہمارے ساتھ رکھیں گے۔ گڑبڑ دفع ہونے تک۔ اس کے بعد اگر وہ واپس ہونا چاہیں تو ہم انھیں واپس لا دیں گے۔ کیسا رہے گا۔

خلیل کا سر اب ندامت سے جھک گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ آپ کی کار میں نہیں جائیں گے۔ مجھے اپنی رکشہ میں انھیں لانا پڑے گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ انھیں کورٹ جانا ہے ورنہ وہ گھر نہیں چھوڑیں گے۔ میں آپ کی کار کے پیچھے آؤں گا۔

میکانک نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ تم ان کی کار کا ساتھ کیسے دے سکتے ہو۔ اسے دیکھا ہے۔ مرسیڈیز ہے۔

آپ فکر نہ کریں۔ خلیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اگر وہ ذرا آہستہ چلیں تو میں ان کا ساتھ دے سکوں گا۔

یہ کہہ کر وہ بڑے میاں کے قریب گیا اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ بڑے میاں نے اپنا سر پلٹایا اور وحشت سے وہ اپنے ہاتھ ہوا میں ہلانے لگے۔ لیکن خلیل اصرار کرتا رہا۔ آخر کار وہ مان گئے اور اپنے بازو پھیلا دیئے۔ خلیل نے ایک سوتی کالا کوٹ کھونٹی سے نکال کر انھیں پہنایا۔

پھر بستر کے نیچے سے ان کے جوتوں کا ایک جوڑا نکلا۔ اُسے اُن کے پاؤں میں پہنا کر اس نے ڈوریاں باندھیں۔
ٹھیک ہے۔ بڑے میاں نے کہا۔ اب میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔
خلیل نے اُن کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھما دی اور اپنے ہاتھ سے اُن کے کاندھوں کو سہارا دے کر بستر سے اُٹھنے میں اُن کی مدد کی۔
تم لوگ چلو۔ انھوں نے میری دادی سے کہا۔ چل کر اپنی کار میں بیٹھو۔
وہ لوگ آگے آگے اور خلیل اور بڑے میاں پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ جب وہ صحن تک پہنچے تو تردیب نے خلیل کی مدد سے بڑے میاں کو رکشہ میں بٹھایا۔
میکانک گیٹ تک ان کے ساتھ آیا۔
آپ لوگوں نے مناسب قدم اٹھایا ہے۔ اس نے مایادیبی اور میری دادی سے کہا۔ آپ لوگوں کو بس یہی کرنا چاہیے تھا۔
میکانک کو نظرانداز کرتے ہوئے ان لوگوں نے ایک آخری نظر مکان پر ڈالی۔ اس کی بالکونی اور ٹرلیس پر جو سیڑھیوں کے اوپر سے باغیچہ کی طرف نکلتے تھے۔ جہاں انھوں نے کبھی اپنی شامیں گزاری تھیں اور اپنے چچا کے حصّے میں آئے ہوئے مکان کے بارے میں کہانیاں گھڑی تھیں۔
پھر وہ گیٹ سے آگے بڑھ کر گلی میں سے گزرنے لگے۔
بچّے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ آپس میں ہنستے بولتے وہ پیچھے چلے۔ ایک چھوٹی لڑکی جس نے منے سے دوستی کر لی تھی دوبارہ نظر آئی۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ چند بچّے رکشہ کے پیچھے دوڑنے لگے۔ خلیل سے باتیں کرتے ہوئے وہ اس کے ہینڈل کو پکڑ کر ادھر اُدھر کود رہے تھے۔
کار کے پاس کھڑا ہوا ڈرائیور گھبراہٹ سے اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر بلا رہا تھا۔ اس نے اور سکیوریٹی گارڈ نے مل کر کار کے دروازے کھولے اور جلدی سے انھیں اندر بٹھا لیا۔
جلدی کریں مادام۔ ڈرائیور نے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ اب جلدی کریں۔
روبی کو توقع تھی کہ ایک ہجوم ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن سڑک خالی پڑی تھی۔ بڑی سنسان۔ تمام دکانیں بند تھیں۔

یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ تم کس لیے اتنے فکر مند ہو۔؟
ذرا انتظار کرو۔ ڈرائیور نے ہاتھ کی پشت سے اپنی پیشانی پونچھی اور کہا — روبی ماسٹر بس تھوڑا انتظار کرو۔

اس نے کار اسٹارٹ کی اور وہ خالی سڑک پر روانہ ہوگئی۔ پیچھے رکشہ آرہی تھی۔
جوں ہی وہ پہلا موڑ مڑے روبی نے سب سے پہلے انھیں دیکھا۔ یہ موڑ میری دادی کو خوب یاد تھا۔ لیکن یہاں لڑکے فٹ بال میچ کھیلا کرتے تھے۔

سڑک پر وہ کئی درجن کی تعداد میں تھے۔ بیچ سڑک پر انھوں نے آگ جلائی تھی اور اس پر چند لکڑی کے ٹھونٹ اور چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں ڈال دی تھیں۔ چند لڑکے آگ کے اطراف اُچھل کود رہے تھے اور چند دوسرے بجلی کے کھمبوں اور دُکانوں کے دروازوں سے لگے کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر روبی یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ لوگ کار کے انتظار میں تھے۔
تب اس نے اپنے پیٹ کے اندر سے ایک سرد بگولہ سا نکلتا ہوا محسوس کیا۔ وہ جان گیا کہ آخر کار مصیبت سامنے آکھڑی ہے۔

۱۹۶۴ء سے متعلق جو واقعات میں نے قلمبند کیے ہیں اُن کا ہر لفظ ایک خاموش جدوجہد کا غماز ہے۔ اس جدوجہد کی شکست یقینی ہے۔ شکست تو ہو چکی۔ اس طویل عرصے سے گزر جانے کے بعد بھی میں نہیں جانتا کہ میری دُنیا کے کس گوشے میں یہ خاموشی چھُپی ہے۔ اس کے بارے میں میں وہ سب جانتا ہوں جو وہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہ کسی کمزور یادداشت کی خاموشی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کسی جابر حکومت کی پروردہ ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ کوئی خاردار باڑہ نہیں۔ کوئی چیک پوسٹ نہیں کہ مجھے اس کی سرحدوں کا علم ہو۔ میں۔ میں اس خاموشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ یہ میری ذہانت کی گرفت سے باہر ہے لفظوں سے ماورا۔

اسی لیے اس خامشی کی جیت ہونا چاہیے۔ کسی طرح یہ مجھے شکست دے دے اس لیے کہ اس کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک خلاء ہے، ایک دراڑ، ایک شگاف جس میں لفظ نہیں ہیں۔

تقریر خامشی کی دشمن ہے۔ لیکن الفاظ کے بغیر تقریر نہیں ہو سکتی اور لفظ معنی کے بغیر نہیں ہوتے — ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ صغرا و کبرا کا ایک کھٹور قیاس کہ جب ہم ایسے واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں جن کے معنی سے ہم واقف نہیں ہوتے تو لازم ہے کہ ہم ایک ایسی خامشی میں کھو جائیں جو الفاظ اور اِس دنیا کے درمیان خلاء میں موجود ہے۔ یہ ایسی خامشی ہے جو حقارت یا ہمت کے کسی بھی ممکنہ عمل کے خلاف دماغ کا کام دیتی ہے۔ یہ دماغ کے حدود کے باہر ہے کیوں کہ محض لامعنویت کے دماغ کے لیے ہمارے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ جہاں معنی نہیں ہوتے وہاں فرسودگی ہوتی ہے۔ یہی تو خامشی ہے اور اسی لیے اسے شکست نہیں دی جا سکتی کیوں کہ یہ ایک مطلق اور ناقابل گزر فرسودگی کی خامشی ہے۔

یہ اٹوٹ خامشی ایسی ہے کہ اس سے واقف ہونے کے لیے مجھے پندرہ برس لگے۔ تب کہیں جا کر پتہ چلا کہ ان دنوں بس میں سفر کرنے والے دہشت ناک تجربات کا ایک ربط ہے ان واقعات کے ساتھ جو ڈھاکہ میں تردیب اور دوسروں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ میری یہ دریافت بھی ایک چھوٹے سے واقعے کی دین ہے۔ ایک اتفاقی حادثہ۔ ایک عرصہ تک میں اپنے احمق پن کو معاف نہ کر سکا لیکن معاف کرنے والی ایسی کوئی بات بھی نہ تھی۔ میں تو بچہ تھا اور دوسرے تمام بچوں کی طرح میں بھی پند و نصاح کی نظمت کو مان کر پلا بڑھا تھا۔ مجھے یقین تھا مکان کی حقیقت پر، مجھے یقین تھا کہ فاصلے ایک دوسرے کو جدا کرتے ہیں اور ان کی مادی حقیقت ہے۔ مجھے یقین تھا ملکوں اور سرحدوں کی حقیقت پر۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ سرحد کے اس پار بھی ایک حقیقت ہے۔ ان مختلف حقیقتوں کے درمیان جو رشتہ قائم ہو سکتا تھا وہ میری لغات کے مطابق یا تو دوستی کا تھا یا جنگ کا۔ اس کے علاوہ کسی اور احساس کی گنجائش نہ تھی اور وہ جو میری لغات میں جگہ نہ پا سکتے تھے وہ اس خامشی کی نذر ہو گئے۔

میں یہ سوچ نہیں سکتا کہ اُن واقعات کا جن کی جھلک میں نے کلکتے میں بس کے سفر کے دوران دیکھی تھی کوئی تعلق ہے اُن واقعات سے جو ڈھاکہ میں گزرے صرف اس لیے کہ ڈھاکہ ایک

دوسرے ملک کا شہری ہے۔ ان کا تعلق تھا وہ ایک اتفاقی حادثے سے بڑھ کر نہیں تھا۔

۱۹۷۹ء کی ایک دوپہر جب کہ میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام شروع کر چکا تھا دہلی کی تین مورتی ہوز لائبریری میں ایک لکچر سننے کے لیے گیا۔ مقرر ایک آسٹریلین تھا۔ ایشین افیرس کا ماہر مانا جاتا تھا۔

اس نے ۱۹۶۲ء کی ہند۔چینی جنگ کے عنوان پر تقریر کی۔ وہ کوئی ایسا خاص مقرر نہیں تھا۔ اس نے کوئی نئی بات بھی نہیں کہی۔ لیکن اس نے ہماری یادداشت کو کریدا لکچر کے بعد جب میں اور میرے دوست مل کر لیا کینٹین میں داخل ہوئے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی ہماری یادیں تھا۔

ہم لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے بے شمار واقعات ہمیں یاد ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب جنگ چھڑی تھی تو اس سے ذرا قبل ہی ہم لوگ سدرن ایونیو کے مکان منتقل ہوئے تھے۔ ہماری پوجا ہو چکی تھی۔ اس شام میں اور میری ماں پوجا کے لیے نئے کپڑے پہنے تھے اور میرے باپ کی آمد کے منتظر تھے تاکہ ان کے آتے ہی ہم لوگ رشتہ داروں سے ملنے کے لیے روانہ ہوں۔ وہ بہت دیر میں آئے۔ گیٹ کی آواز سن کر میری ماں مجھے لے کر باغیچے کی طرف بڑھی کہ وہ ہماری بے چینی کو دیکھ سکیں لیکن جب وہ ہماری طرف آگے بڑھے تو ہم نے محسوس کیا کہ انھیں ہماری بے چینی کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اُن کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں اور اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لے کر اُٹھایا۔ میں ان کے منہ سے نکلنے والی وہسکی کی بو سونگھ سکا۔ انھوں نے کہا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ کیا ہوا ہے۔ نہرو نے فوج کو حکم دیا ہے کہ چینیوں کو ہماری سرحد سے نکال باہر کریں۔ اب جنگ ہونے والی ہے۔

میں اُن کی گود سے کود کر اپنی دادی ماں کے کمرے کی طرف بھاگا۔ خوشی سے میں چلّایا۔ تھامّا جنگ ہو گئی ہے۔ چین سے جنگ۔۔۔

مجھے یاد ہے کہ اس پر وہ ہنسی۔ ہنس کر آئے بہت دن ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سمیٹتے ہوئے کہا۔ اچھا ہے کہ ہم انھیں سبق سکھائیں۔

کینٹین میں آدھی آدھی پیالیاں چائے لیے ہوئے ہم نے یاد کیا کہ اُن کے ایئر کرافٹ کی شکل

ہمارے ایئر کرافٹ سے کس قدر مختلف ہے۔ کس طرح ہماری ماؤں نے اپنی چوڑیاں اور کانوں کے بُندے چندے میں جمع کروائے تھے۔ کس طرح ہم لوگ گلیوں کے نکڑوں پر اکٹھے ہو جاتے تھے اور کاغذ کی جھنڈیاں بیچ بیچ کر چندہ جمع کرتے تھے۔ ہم کو یاد آیا کہ کس طرح ہماری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ چینیوں نے ہندوستانی فوج کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ ہم لوگ خوف و حیرت کرنے لگے کہ کہیں وہ آسام اور کلکتہ پر قابض نہ ہو جائیں۔

ہم میں سے جو اونچے قد کا تھا اور جس کے ڈاڑھی تھی اس کا نام ملک تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کس طرح اس کے باپ نے جو پارلیمنٹ کے ممبر تھے صبح صبح اخبار کھولا۔ باوجود یہ کہ وہ لنگی میں تھے۔ اخبار کی سرخیاں پڑھ کر ہی فارن سکریٹری کے بنگلے کی طرف سڑک پر دوڑ پڑے۔

کیسی عجیب بات تھی۔ کسی نے کہا۔ ہم سب کو یاد رہ گئی۔

کیوں نہیں۔ ملک نے کہا۔ یہ عجیب بات بالکل نہیں۔ جب ہم بچے تھے یہی ہمارے ملک کا سب سے اہم واقعہ تھا۔

دوسروں نے ہاں کہہ کر سر ہلایا۔ میں اپنی انفرادیت کے لیے مشہور تھا۔ میں نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اوہ! چھوڑو۔ وہ تو پہاڑیوں میں کہیں ایک چھوٹی سی لڑائی تھی۔ کوئی اہم بات نہ تھی۔ ہم اسے یاد بھی نہ رکھتے اگر ہندوستانی فوج کو ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔ کئی لوگوں کے پاس اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

ٹھیک ہے۔ ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ۱۹۶۲ء کی جنگ کے سوا کون سا اہم واقعہ ہے؟

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ ذہن پر بار ڈالتے ہوئے میں اپنا سر کھجانے لگا۔ وہ لوگ میری طرف دیکھتے رہے۔

پتہ نہیں اچانک کیسے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ میں نے کہہ دیا۔ فسادات کے بارے میں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے....؟

کون سے فسادات؟ ملک نے پوچھا۔ فسادات تو بہت ہوئے۔

وہ فسادات۔ میں نے اپنی انگلیوں پر سال گنے۔ ۱۹۶۴ء کے فسادات۔ میں نے کہا۔

اُن کے چہرے پھیکے پڑ گئے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
۱۹۶۴ء کے فسادات کیا تھے۔ تلک نے غصّے سے پوچھا۔
میں جانتا نہیں تھا کہ اسے اندازہ نہیں کہ وہ کیا کر رہا تھا۔
میں دوسروں کی طرف پلٹا۔ پھر زور سے پوچھا۔ کیا آپ لوگوں کو یاد نہیں۔
اپنے اپنے سروں کو ہلاتے ہوئے وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگے تب مجھے خیال آیا کہ وہ سب دلی کے لوگ ہیں۔ اُن سب میں میں اکیلا ہی تو تھا جو کلکتہ میں پروان چڑھا تھا۔
یقیناً آپ لوگوں کو یاد ہوگا۔ میں نے کہا ۱۹۶۴ء میں کلکتے میں بڑے بھیانک فسادات ہوئے تھے۔
اچھا! تلک نے کہا۔ کیا ہوا تھا۔
جواب دینے کے لیے میں نے اپنا منہ کھولا۔ لیکن کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میرے پاس کہنے کے لیے صرف وہ آوازیں تھیں جو میرے اسکول کی دیواروں سے ٹکرائی تھیں اور پارک سرکس میں دکھائی دینے والے ہجوم کی ایک جھلک۔ اُن واقعات کی ایک خاموش ہیبت جو میری یادداشت میں چھپی تھی اور ان کے اہم ہونے پر میرا اعتقاد۔ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا تذکرہ ایک ہنسی مذاق سے کم نہ تھا۔
ایک فساد ہوا تھا۔ میں نے بے بس ہوتے ہوئے کہا۔
فسادات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ تلک نے کہا۔
یہ ایک بھیانک فساد تھا۔ میں نے زور دے کر کہا۔
سارے فساد بھیانک ہوتے ہیں۔ تلک نے کہا۔ شاید وہ ایک مقامی فساد تھا۔ بھیانک رہا ہوگا کہ نہیں۔ ایک جنگ سے اس کا کیا مقابلہ۔
لیکن کیا تمہیں یاد نہیں؟ میں نے کہا۔ کیا تم لوگوں نے اس کے بارے میں پڑھا یا سنا نہیں۔ چین کے ساتھ جنگ تو تمہارے گھر کی دہلیز پر نہیں ہوئی تھی لیکن وہ تمہیں یاد رہی۔ وہ فساد بھی تمہیں یاد تو ہوگا۔ یاد رکھنا چاہیے۔
افسوس کے ساتھ انھوں نے اپنے سر ہلائے اور سگریٹوں سے دھوئیں کے بادل اُڑانے لگے۔

میں نے کھڑے ہو کر ملک کے کاندھے کو دھکا دیا۔ اب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اپنے ماضی کو اس طرح فراموش ہونے نہیں دوں گا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی اہمیت کا احساس انھیں دلا کر رہوں گا۔

میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا۔ ہم لائبریری میں چلیں اور ۱۹۶۴ء کے اخبارات پر نظر ڈالیں۔ تب میں تمہیں بتاؤں گا۔

وہ لوگوں کی طرف دیکھ کر ہنسا اور بچی ہوئی چائے کو غٹ سے حلق سے اتار لیا۔ ٹھیک ہے۔ اس نے کہا۔ ہم چلیں گے۔

ائیر کنڈیشن سے آراستہ پُر سکوت لائبریری میں داخل ہو کر ہم لوگ ان شلفوں کی طرف بڑھے جہاں اخباروں کی جلدیں رکھی ہوئی تھیں۔ جس اخبار کی مجھے تلاش تھی وہ کلکتہ کا ایک مشہور روزنامہ تھا۔ شلف کے تیسرے خانے میں یہ اخبار رکھے تھے۔ ۱۹۶۴ء کی موٹی موٹی چار جلدیں تھیں۔

کیا تمہیں تاریخ یاد ہے۔ ملک نے کہا۔ کم از کم مہینہ؟

میں نے اپنا سر ہلایا۔ نہیں میں نے کہا۔ مجھے یاد نہیں۔

ان تمام اخباروں کی چھان بین کرنے سے تو ہم رہے۔ اس نے چار ضخیم جلدوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہمیں کئی دن لگ جائیں گے۔

تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا۔

شاید اس کا حوالہ کسی کتاب میں ہوگا۔ اس نے خیال ظاہر کیا۔

لیکن وہ کتاب ہمیں کیسے ملے؟ میں نے کہا۔

تب ملک نے بڑے صبر سے کہا ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ساری باتیں تمہارے ذہن کی پیداوار ہیں۔

وہ پلٹ کر شلف کے دوسرے خانوں کی طرف گیا۔

ملک اُس لائبریری سے اچھی طرح واقف تھا۔ برسوں سے وہ وہاں کسی نہ کسی موضوع پر ریسرچ کر رہا تھا۔ وہ ایک شلف کے پاس رکا۔ وہاں ۱۹۷۱ء کی جنگ سے متعلق مواد تھا۔ انھیں کتابوں سے پورا شلف بھرا پڑا تھا۔ تاریخ، سیاسی تجزیے، یادداشتیں، تحقیق، جنگ

کی اہم دستاویزات۔ پھر اس نے مسکرا کر دوسرے شلف کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ۱۹۶۵ء کی پاکستان سے جنگ سے متعلق مواد تھا۔

کم ازکم وہ جنگ تو ہم نے جیتی تھی۔ اُس نے کہا۔

آدھے گھنٹے کی تلاش پر بھی ہمیں اس فساد سے متعلق کوئی مواد دستیاب نہ ہوا۔ اب ملک اُکتا گیا تھا۔ اس نے اپنی گھڑی کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی اور پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اب میرے گھر واپس ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ ہم شاید کسی اور دن...

میں نے خاموشی سے اپنا سر ہلا دیا۔ ایک خیالی واقعہ کو برسوں سے میں اپنے ذہن میں لیے ہوں یہ سوچ کر مجھے اچھا نہیں لگا۔ ملک جانے ہی کو تھا کہ ایک واقعہ کی یادداشت میرے ذہن پر اُبھری۔

ایک صبح فٹ پاتھ پر کھڑا میں اپنی اسکول بس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بات مجھے یاد آگئی۔

ملک کے ہاتھ کو تھامے ہوئے میں نے کہا۔ جاؤ نہیں۔ اب مجھے کچھ یاد آگیا ہے۔ وہ ٹسٹ میچ کا زمانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ انگلینڈ کے ساتھ۔ کیا تمہیں وہ ٹسٹ سیریز یاد نہیں؟ وہ وکٹ کیپر جسے بعد میں کھیل سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی پہلی سنچری بنائی تھی۔

ہاں یہ ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہاں مجھے یاد ہے۔ وہ بدھی کندیران تھا۔ وہی نا؟

ہاں میں چلایا۔ بالکل ٹھیک۔ بدھی کندیران۔ تو وہ کرکٹ کے سیزن کا واقعہ ہے۔ شاید جنوری یا فروری کی بات ہے۔

ٹھیک ہے۔ ملک نے کہا۔ لیکن اب تمہاری یہ آخری باری ہے چلو چل کر دیکھ لیتے ہیں۔

ہم لوگ واپس اخبارات کے سکشن کی طرف گئے اور ۱۹۶۴ء کے جنوری اور فروری کے شمارے کھول کر اُلٹنے لگے۔ پہلے اسپورٹس کے صفحات کو دیکھا۔ ملک کو بہت ہی جلد انگلستان کرکٹ ٹیم کی آمد کا حوالہ مل گیا۔ کچھ اور صفحات اُلٹنے کے بعد ہماری نظر مدراس ٹسٹ کی سرخی پر پڑی۔

وہ رہا۔ میں نے فاتحانہ کہا۔ یہ وہی دن تھا۔ اب مجھے یاد آیا۔ اسکول سے گھر پہنچ کر میں نے ریڈیو پر کمنٹری سنی تھی۔

وہ جمعہ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۴ء کا ایڈیشن تھا۔

ہم نے جلدی جلدی سے صفحات اُلٹے اور زرد رنگ کے صفحات سے گزر کر پہلے صفحے پر پہنچے۔

تمہارا فساد کہاں ہے؟ ملک نے کہا۔

مشمولات میں کہیں بھی فسادات یا کلکتہ کا ذکر نہ تھا۔ کانگریس پارٹی کے اڑسٹھویں اجلاس کا ذکر تھا جو بھوبنیشور میں ہوا۔ یاس و نا امیدی کے احساسات لیے میں نے پارٹی کے صدر مسٹر کامراج کی وہ تقریر پڑھی جس میں انھوں نے ان تمام طاقتوں کو اکٹھے ہونے کی دعوت دی جو سوشلزم اور جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں تاکہ ایک نئے سماج کی تشکیل دی جاسکے۔

ایسا لگتا ہے، ملک نے کہا کہ تمہارے فساد نے پہلے صفحے پر جگہ نہیں پائی۔

لیکن ایک لمحہ بعد مجھے وہ چیز مل گئی جس کی تلاش تھی۔ ایک سُرخی جو اخبار کے نچلے حصّے میں چھپی تھی۔ ۲۹ آدمی فسادات میں مارے گئے۔

وہاں۔ میں نے اخبار پر اپنی ہتھیلی رکھتے ہوئے کہا۔ وہاں تم خود ہی پڑھ لو۔

اپنی پتلون کو ٹھیک کرتا ہوا اور اطمینان کا سانس لیتا ہوا میں کھڑا رہا۔ اُسے رپورٹ پڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے پہلی بار رپورٹ آہستہ سے پڑھی۔ اس کے چہرے پر ناخوشگوار تاثر اُبھرا۔ اس نے دوبارہ رپورٹ کو پڑھا۔

تب اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ فسادات کلکتے میں ہوئے تھے۔

ہاں۔ بالکل ٹھیک۔ نے جواب دیا۔

یہ عجیب بات ہے۔ اس نے اخبار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس لیے کہ یہ فسادات کھُلنا میں ہوئے تھے۔ کلکتے سے پرے سرحد پر مشرقی پاکستان میں۔

لائبریری کی پُرسکون فضا میں اس کا فرش میرے قدموں کے نیچے سے کھسکتا ہوا محسوس ہوا اور مجھے ہوا میں معلق لٹکتا ہوا چھوڑ گیا۔ اگر ملک نے اپنے ہاتھ کا سہارا نہ دیا ہوتا تو میں فرش پر لڑھک گیا ہوتا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے میز کو مضبوطی سے تھامے جھک کر میں نے خود

وہ رپورٹ پڑھی۔

لکھا تھا۔ کھلنا میں ایک دن قبل فوج طلب کرلی گئی تھی تاکہ اُس جلوس کو منتشر کردے جو تشدد پر اُتر آیا تھا۔

یہ عجیب بات ہے۔ ملک نے میری طرف تجسس کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ تم نے پاکستان میں ہوئے فساد کو یاد رکھا۔

پھر وہ اپنا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بہت دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ اخبارات میں تو ایک دن قبل کی خبریں چھپتی ہیں۔ میں نے شنبہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۴ء کے اخبار کی ورق گردانی کی۔ میرا قیاس صحیح نکلا۔ ایک بہت نمایاں سرخی تھی۔ کلکتے میں کرفیو۔ پولیس نے گولی چلادی۔ دس آدمی مارے گئے اور پندرہ زخمی ہوئے۔

میری چھٹی حس کام کرنے لگی۔ ایک اور سرخی پر نظر پڑی۔ یہ صفحہ کے آخری حصّے میں چھپی تھی۔ لکھا تھا۔ کندریان کی حیران کن بیٹنگ۔ مدراس کے پہلے ٹسٹ میں آوٹ ہوئے بغیر ایک سو ستر رن۔ اُس سے ذرا اوپر ایک چھوٹا سا باکس بنا تھا۔ اس میں جلی حروف میں سرخی میں لکھا تھا۔ موئے مبارک کی بازیابی۔ نیچے تفصیل تھی کہ سری نگر کی مسجد حضرت بل میں موئے مبارک کو پھر سے رکھ دیا گیا ہے۔ پورے سری نگر میں جوش خروش میں خوشیاں منائی گئیں۔

اس طرح ایئر کنڈیشن لائبریری کی خاموشی میں بیٹھے ہوئے میرے اس عجیب وغریب سفر کا آغاز ہوا۔ لاامکان کی ایک دنیا اور فاصلوں کے بغیر ایک ومعد [illegible] سفر۔ آئینے میں دکھائی دینے والے واقعات کی دنیا کا سفر۔

متبرک آثار جنھیں موئے مبارک کہا جاتا ہے۔ یقین سے آنحضرت صلعم کے بال سمجھے جاتے ہیں۔ کشمیر کے ایک تاجر خواجہ نورالدین نے انھیں بیجاپور (حیدرآباد سے قریب) میں ۱۶۹۹ء میں خریدا تھا۔ اُس کے دوسرے سال ان متبرک آثار کو کشمیر کی وادی میں منتقل کیا گیا۔ آثار کے بارے میں یہ ایک مصدقہ روایت ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور روایتیں بھی ہیں۔ جو کچھ بھی ہو یہ سچ ہے کہ جب موئے مبارک کشمیر کی وادی میں پہنچے تو وہاں بے حد خوشیاں منائی گئیں۔ کشمیر

کی وادی کے کونے کونے سے لوگ اکٹھا ہوا۔ درّہ بنی ہال جیسے دور دراز مقام سے بھی لوگ آئے تاکہ اُن آثار کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ بعد میں یہ آثار سری نگر کے حضرت بل کی خوش نما مسجد میں محفوظ کر دیئے گئے۔ یہ مسجد لوگوں کی زیارت کا مرکز بن گئی۔ ہر سال موے مبارک کی زیارت کے موقع پر ہندو، سکھ اور بدھسٹ سب ہی کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ اس کی بہ خوبی تصدیق ان یوروپی سیاحوں نے بھی کی ہے جن کی مذاہب کے درمیان قرنطینی کی ضرورت کے احساس کو بلاتفریق مذہب و ملّت زائرین کے اس منظر سے دھکا پہنچتا تھا۔ اس طرح مرور زمانہ کے ساتھ یہ عبادت گاہ کشمیر کی انوکھی امتیازی تہذیب کی علامت بن گئی۔

مسجد حضرت بل میں موے مبارک کے محفوظ کرنے کے کوئی دو سو تیرسٹھ سال بعد ۲۷ دسمبر کے دن یہ موے مبارک مسجد سے غائب ہو گئے۔

جوں ہی یہ خبر عام ہوئی کشمیر کی ساری وادی میں زندگی معطل ہو گئی۔ شدید ترین سردی کے باوجود (دہلی موسمیات کے کالم نگار نوٹ کرلیں کہ سری نگر کے پانی کے سارے ذخیرے منجمد ہو گئے تھے)۔ ہزاروں لوگ جن میں ماتم کرتی ہوئی عورتیں بھی شامل تھیں۔ سیاہ جھنڈیاں لیے سری نگر سے حضرت بل مسجد کی طرف جاتے ہوئے جلوس میں شامل ہوئے۔ مدرسے کالج اور ساری دکانیں بند ہو گئیں۔ سڑکوں سے ساری بسیں اور کاریں غائب ہو گئیں۔

دوسرے دن ۲۹ دسمبر اتوار کو سری نگر میں بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ ان میں مسلمان سکھ اور عیسائیوں نے ایک ساتھ حصّہ لیا۔ عوامی جلسے بھی کیے گئے۔ انھیں تمام اہم مذاہب کے پیشواؤں نے مخاطب کیا۔ یکّا دُکّا فساد ہوئے۔ فوراً کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ فسادات کا نشانہ (آج بھی ہمیں یقین نہیں آتا) عوام نہیں تھے، ہندو نہیں تھے، مسلمان نہ سکھ بلکہ وہ املاک تھیں جس سے حکومت اور پولیس کی شناخت ہوتی تھی۔

حکومت نے اس کا الزام قوم دشمن عناصر پر لگایا۔

اس واقعے کے چند دنوں تک پوری وادی میں اجتماعی غم کی لہر پھیلی رہی۔ سیاہ جھنڈیوں کے بے شمار جلوس نکالے گئے۔ ساری دکانوں اور عمارتوں پر سیاہ جھنڈیاں لہرائی گئیں۔ گلی گلی میں لوگ سیاہ پٹّیاں باندھے پھرتے رہے۔ ان پورے واقعات میں ایک حادثہ ایسا نہیں

ہو اگر کسی مسلمان، ہندو یا سکھ نے ایک دوسرے سے دشمنی کا اظہار کیا ہو۔ مشترکہ تہذیبوں کی طاقت میں ہمارا عقیدہ کچا ہے کہ اُن اخباری اطلاعات میں جن میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ موئے مقدس کی چوری سے کشمیری عوام کے اتحاد میں پہلے سے زیادہ استحکام ہو گیا تعجب کا ایک عنصر شامل ہے۔ اس کا سبب کچھ حد تک مولانا مسعودی کی قیادت مانا گیا۔ وہ ایک سچا پیرو تھا لیکن اُسے بھلا دیا گیا۔ ہمارے برصغیر کا یہی تو وصف ہے کہ سمجھداری کی باتیں کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس لیڈر نے پہلی بار کشمیریوں کو سبز رنگ کے بجائے سیاہ جھنڈیوں کے جلوس نکالنے کی ترغیب دی۔ اس طرح سارے مذاہب کو ایک مشترک سوگ منانے کے لیے یکجا کیا گیا۔ دہلی میں چاروں طرف مایوسی چھا گئی تھی۔ نہرو نے صبر کی اپیل کی۔ ہوم منسٹری اور سنٹرل بیوریو آف انٹلیجنس کے چند اہم عہدیداروں کو آثار کی بازیابی پر مامور کیا گیا۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ چند بدمعاشوں نے یہ چوری کی ہے۔

پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں علاقوں کے شہروں میں میٹنگیں بلائی گئیں۔ جلوس نکالے گئے۔ مذہبی ملاؤں نے جو بت پرستی کی مذمت میں فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اعلان کیا کہ آثار کی چوری مسلم شناخت پر ایک حملہ ہے۔ کراچی میں ۳۱ دسمبر کو یوم سیاہ منایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے شہروں نے اس کی اتباع کی۔ پاکستان کے اخباروں نے اعلان کیا کہ آثار کی چوری کشمیریوں کے روحانی جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور وادی میں قتل و غارتگری پھیلانے کی ایک گہری سازش ہے۔

۴ جنوری ۱۹۶۴ء کو سنٹرل بیورو آف انٹیلیجنس کے عہدیداروں نے موئے مبارک کی بازیافت کی کوئی توجیہات پیش نہیں کی گئیں۔ درحقیقت آج تک کوئی نہیں جانتا کہ حضرت بل کے آثار کی چوری کا واقعہ کیا تھا۔

لیکن موئے مبارک کی بازیافت کے ساتھ ہی سری نگر میں جشن چراغاں منایا گیا۔ لوگ گلیوں میں ناچنے لگے۔ شکرانے کی محفلیں سجائی گئیں۔ ہندو، مسلم، سکھ سب نے مل کر جلوس نکالے اور مطالبہ کیا کہ سازشیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ پہلی اور یقیناً آخری بار ہندوستان کے اس شہر کی گلیوں میں سنٹرل انٹیلیجنس زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے۔

مسرت کے اس مسعود موقع پر صرف ایک حادثہ پیش آیا۔ مشرقی پاکستان کے کسی کونے کے ایک شہر کھلنا میں آثار کی چوری کے خلاف نکالا گیا ایک جلوس تشدد پر اتر آیا۔ چند دکانیں جلائی گئیں اور چند آدمی مارے گئے۔

جب میں وہ مختصر رپورٹ پانچویں دفعہ پڑھ رہا تھا تو اچانک کسی یادداشت نے جیسے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ اس واقعے کے ایک دن قبل ہی مٹے، تردیب اور میری دادی ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ پھر میں نے ایک اور بار تردیب کو دیکھا جیسے وہ ڈم ڈم ائیرپورٹ پر روانگی کے لونج کی طرف بڑھ رہا ہو۔

اس واقعے کے بعد ایک عرصے تک لائبریری میں جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ ہاسٹل کے مرطوب کمرے میں میں اپنے بستر پر پڑا رہتا اور اس سبز کائی کو دیکھتا رہتا جو مان سون کے موسم میں چھت پر ابھر آئی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ میرے باپ نے انھیں وہاں جانے کا موقع ہی کیوں دیا۔ وہ تو بے حد محتاط اور عملی آدمی تھے۔ انھیں شاید علم تھا کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے یاد آیا۔ میں نے سن لیا تھا کہ وہ کسی مصیبت کا ذکر کرتے کرتے رہ گئے تھے کہ کہیں میں پوری بات نہ سن لوں۔ اس وقت تو اس لفظ کے کوئی معنی مطلب ہی نہ تھے لیکن میں چھت میں پھیلتے ہوئے سبزے کو دیکھتا ہوا اب یہ سوچ رہا ہوں کہ انھوں نے ایک خاص مقصد سے انھیں وہاں جانے کی اجازت دی تھی اور یہ کہ انھوں نے تردیب کی موت کی سازش کی تھی۔

اور پھر دنوں بعد جب میں لائبریری گیا اور میری یادداشت سے چمٹی ہوئی "تاریخ ۴ جنوری ۱۹۶۴ء کا اخبار تلاش کیا تو ایک اور بات دریافت ہوئی کہ اس میں مشرقی پاکستان کے کسی بھی ایسے واقعے کا ذکر نہ تھا اور نہ ہی کشمیر میں ہوئے کسی واقعے کا۔ یہ تو کلکتے سے نکلنے والا اخبار تھا جس کے ارباب فاصلوں کی توانائی کو اسی طرح مانتے تھے جس طرح میں مانتا ہوں۔

پرانے اخباروں کے مطالعے کی اکساہٹ بڑی شدید ہوتی ہے۔ عبادت کا تعلق عصری واقعات سے بھی ہوتا ہے۔ موسم کی کیفیات، شہر کے معمولات، فلموں کے اشتہارات کی ادھوری یادیں ان کی جلی سرخیوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس کہ جیسے سب کچھ آج ہی کی بات ہے۔ اس کے علاوہ وہ کیفیت جو اس احساس کی دین ہے کہ تم نے ان اخباروں کو پہلے بھی چھوا تھا۔ اخبار وہی

دھی، اس جیسا۔ اس کا جڑواں بھائی۔ یہ ساری باتیں وقت کو اس طرح پھلانگتی ہیں کہ کسی دوسرے میں یہ وصف نہیں۔ لہٰذا اب وہ اخبار دیکھتے ہوئے جسے میرے باپ نے پڑھا تھا مجھے خیال ہوا کہ اس دن صبح جو خاموشی ان کے اطراف پھیلی ہوئی تھی آنے انھوں نے نظرانداز کردیا تھا۔ تب تو اس کا الزام اُن پر نہیں دیا جاسکتا اس لیے کہ اس اخبار میں کوئی ایسی بات لکھی نہ تھی جس سے آئندہ کے واقعات کی پیش قیاسی کی جاسکتی۔ سارا اخبار معمول کے مطابق تھا۔ پھر میں نے یکم، دوسری اور تیسری جنوری کے اخبار اُلٹائے تو وہ بھی ویسے ہی نکلے۔ میں انھیں کیسے موردِ الزام ٹھہراتا۔ وہ بھی اُسی بے نام خاموشی کا شکار رہتے۔

تاہم وہ جانتے تھے اور سب ہی واقف رہے ہوں گے۔ سارے سیانے جرنلسٹ۔ ہر شخص اپنی ذات کے کسی نہ کسی بے آواز گوشے میں کیوں کہ اتنے بڑے واقعات کا کوئی نہ کوئی پیش خیمہ ہوتا ہے لیکن اگر وہ جانتے ہی تھے تو انھوں نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کئی دوسری باتوں کا تو کثرت سے ذکر ہوا تھا۔ کانگریس کانفرنس کا، کمیونسٹ پارٹی کی امکانی پھوٹ کا۔ جنگوں اور انقلابات کا، وہ تمام باتیں جنھیں سیاست کہتے ہیں آن کا تو چرچا ہوا تھا لیکن ان باتوں کا جن کے کوئی نام نہیں دیئے جاسکتے ان پر ایک خاموشی؛ وہ تمام صحافتی، وہ تمام تاریخ داں۔ آخر یہ سب تو ذہین لوگ ہیں اور نیک طینت والے بھی۔ دوسروں سے کسی طرح کم نہیں۔ جب فساد شروع ہوا تو انھوں نے ہزاروں مسودے تیار کیے۔ ایک ایک تفصیل کے ساتھ۔ لیکن جب سب کچھ ہو چکا اور کوئی بات کہنے کے لیے باقی نہ رہی تو پھر دوبارہ اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ اس کے برخلاف وہ دوسرے واقعات۔ پارٹیوں میں پھوٹ، پارٹی میٹنگیں اور پارٹی الیکشن ان کا ذکر تو آن کے گزر جانے کے برسوں بعد بھی اخباروں اور تاریخ کی کتابوں میں بار بار اس طرح ہوتا ہے جیسے ان کی اہمیت کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری طرح کی باتیں جب وقوع ہوتی ہیں تو ان کا جائزہ تو لیا جاتا ہے لیکن پھر ایک چپ۔ ان کے لیے الفاظ تلاش کرنے کا مطلب انھیں معنی پہنانا ہے اور یہ ایک ایسا دردِ سر ہے جو ننگے پن سے کم نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تردیپ کی موت کے واقعہ کو میں ثانوی حیثیت سے بیان کرسکتا ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس واقعہ کو معنی پہناؤں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور ذخیرہ میں آتی

طاقت نہیں کہ میں اسے سنوں۔

کھلنا میں ایک بار فسادات شروع ہوئے تو مشرقی پاکستان کی حکومت نے ان کی روک تھام کے لیے وہاں فوج بھیجنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا۔ ۷ رجنوری کے اخبار کی ایک سرخی تھی: کھلنا کے فساد میں چودہ افراد کی موت۔

اگلے چند دنوں میں کھلنا کے آس پاس کے علاقوں میں فسادات پھیل گئے اور ڈھاکہ کی طرف بڑھنے لگے۔ کئی ہندو ریل سے اور پیدل سفر کرتے ہوئے سرحد پار کر کے ہندوستان میں داخل ہو گئے۔ پاکستانی حکومت نے ان ریل گاڑیوں میں فوجی دستے مامور کر دیے تاکہ مہا. ں کی حفاظت ہو سکے۔ سرحد کے بعض مقامات پر ہجوم نے ریل گاڑیوں کو روکا۔ بعض کو یوم کشمیر زندہ باد کے نعرے لگاتے سنا گیا۔ (شاید یہ وہی لمحہ تھا کہ کشمیر میں ہجوم سنٹرل انٹیلجنس زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا) لیکن کسی ریل پر کسی بڑے حملے کی اطلاع نہیں ملی۔ مشرقی پاکستان کے بہت سے شہروں اور دوسرے قصبات میں لوٹ مار آتش زنی اور قتل کے متعدد واقعات ہوئے۔

کلکتے میں چاروں طرف افواہیں پھیل گئیں وہی ہمیشہ کی طرح پھیلنے والی افواہ جو ہر بڑے فساد سے وابستہ ہے کہ پاکستان سے آنے والی ریل گاڑیاں نعشوں سے بھری پڑی ہیں۔ کلکتے کے بعض اخباروں نے رونگٹے ہلانے کی بعض تصویریں چھاپیں۔ ان میں مشرق میں ہوئے چند واقعات اور راستوں پر رکے ہوئے مہاجروں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ ۸ راور ۹ رجنوری کو جب کہ مہاجرین جوق در جوق آ رہے تھے افواہیں سیلاب کے پانی کی طرح پھیل گئیں اور غصے میں بھرا ہجوم اسٹیشنوں پر اکٹھا ہوتا گیا۔

اس طرح واقعات کی بے تکی منطق چل پڑی۔ ۱۰ رجنوری کو جب مدراس میں کرکٹ ٹسٹ میچ شروع ہوا تو کلکتے میں تباہی مچی ہوئی تھی۔ شہر کی سڑکوں پر فسادی نکل پڑے، مسلمانوں کو قتل کرتے ہوئے ان کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹتے ہوئے انھیں نذرِ آتش کرتے رہے۔

کئی جگہ پولیس نے فسادیوں پر گولی چلا دی اور شہر کے بعض حصوں میں رات کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ فسادات نے پولیس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ۱۱ رجنوری کو فورٹ ولیم سے فوج طلب کر لی گئی اور شہر کے کئی مقامات پر مامور کر دی گئی۔ دوسرے دن کے اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں

کے ساتھ تصویروں میں سکھ فوجیوں کو گشت کرتا ہوا دکھایا گیا لیکن پارک اسٹریٹ کے مولن روگے
یں ہمیشہ کی طرح کاروبار چل رہے تھے۔ ۵ اور ۷ بجے شام کے وقفے میں چائے کا ڈانس۔
اس کے بعد ولیلا کے ساتھ ڈِنر ڈانس جو پاپولر موسیقی کے ساتھ پیش ہونے والا تھا۔

...ے دن فوجی گاڑیوں کے سڑکوں پر گشت کے دوران مولن روگے نے ایک اور
ڈ ں کے مقابلے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ساقی سیشن اور بنگو کی موسیقی۔ کرفیو کی وجہ شاید
انھیں اخبار کے دفتروں سے ربط قائم کرنے کا موقع نہ ملا۔

ڈھاکہ اور کلکتہ میں فوجیوں کی موجودگی کے باوجود لوٹ مار کے یکاّ دکاّ واقعات چند دنوں تک
جاری رہے۔ حالات کے معمول پر آنے کی اطلاع اخباروں میں چھپنے تک ایک ہفتہ لگا۔

۱۹۶۴ء کے فسادات میں کتنے لوگ مارے گئے اُن کے صحیح اعداد و شمار دستیاب
نہ ہو سکے۔ چند سو سے لے کر چند ہزار کی تعداد ہو سکتی ہے۔ یہ تعداد ۱۹۶۲ء کی جنگ میں مرے
ہوئے لوگوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اخباروں سے یہ بات واضح تھی کہ ہندوستان ہو کہ پاکستان دونوں ہی جگہ فساد ایک بار شروع
ہوا تو معتبر اور سنجیدہ افراد کا ردِ عمل بھی بھیانک رہا۔ ڈھاکہ اور کلکتے کی یونیورسٹیوں نے
بازآبادکاری اور امن مارچ کا انتظام کیا۔ دونوں جگہ کے اخبارات نے مصالحتانہ خبریں
چھاپ کر انسانی خدمت انجام دی۔ ہمیشہ کی طرح کئی مسلمانوں نے مشرقی پاکستان میں اپنی
جان پر کھیل کر ہندوؤں کو پناہ دی اور اسی طرح ہندوؤں نے مسلمانوں کو دی۔ لیکن وہ
تو عام انسان تھے۔ انھیں جلد بھلا دیا گیا۔ ان کے لیے نہ کوئی یادگار ہی قائم ہوئی اور نہ
کوئی جیوت جیوتیاں جلائی گئیں۔

دونوں طرف کی حکومت کا جہاں تک تعلق تھا انھوں نے مسلسل ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا۔
امور خارجہ کے سرکاری نمائندے نے دہلی میں ۷ جنوری کو اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان
میں جو فسادات اور غیر قانونی واقعات ہوئے وہ بلاشبہہ پاکستانی لیڈروں اور پاکستانی
اخبارات کا اشتعال انگیز بیانات اور خبروں کا نتیجہ ہیں۔ چند دنوں بعد پاکستان کی امور خارجہ
کی منسٹری نے ہندوستانی ہائی کمشنر کو طلب کیا اور پاکستان کے خیالات سے واقف کروایا۔

کہ مشرقی پاکستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں پاکستان کا ہاتھ ہے تاکہ لوگوں کی توجہ کو کشمیر کے مسئلہ سے ہٹایا جا سکے۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات تو وہ تھی کہ دونوں حکومتوں نے حالات کا دوبارہ جائزہ لینے کا ذکر کرتے ہوئے فسادات کے فرو ہونے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے صدور اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور عوام سے آپسی یگانگت کے لیے اپیل جاری کریں گے۔ لیکن بہت جلد اس پلان کا بھی وہی حشر ہوا جو برصغیر میں ہر نیک نیت پلان کا ہوتا ہے۔ پھر لوگوں کی یادداشت عام فقروں کے انبوہ میں گم ہو گئی۔

اخباری اطلاعات کے مطابق یہ سچ ہے کہ فسادات جب شروع ہوئے تو دونوں طرف کی حکومتوں نے انھیں فرو کرنے کے لیے تیزی سے اقدامات کیے۔ اس لیے کہ وہ ایک ایسی منطق کے محکوم ہیں جو ان سے زیادہ طاقتور ہے کیونکہ فساد کا جنون انسان کی ذہنی کیفیت میں ایک مریضانہ تبدیلی ہے اور اسی لیے یہ جنون ہمارے لیے اس عظیم غیر منقسم ہوش مندی کی یاددہانی کا کام بھی دیتا ہے جو لوگوں کو اپنی حکومتوں کی طرف سے پابندی کے بغیر ایک دوسرے سے متحد رکھتی ہے۔ اور یہ قدیم اور غیر پابند تعلق حکومت کا فطری دشمن ہے کیونکہ حکومتوں کی منطق تو یہ ہے کہ اپنے وجود کے لیے عوام کے تمام باہمی تعلقات پر اسے اجارہ داری حاصل ہونی چاہیے۔

جنگ کے اسٹیج پر جہاں جنرلس ملتے ہیں مملکتیں ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ فسادات کی یاددہانی سے انھیں کیا حاصل؟

جنوری ۱۹۶۴ء کے اختتام تک اخباروں کے صفحات سے فسادات کا ذکر غائب ہو چکا تھا۔ ذمہ دار لوگوں کے اجتماعی تصور میں باقی نہ رہا تھا۔ تاریخ کی کتابوں اور بک شلفوں میں جگہ پائے بغیر مفقود ہو چکا تھا۔ ان یادوں کو کسی اتھاہ سمندر کی خاموشی کی نذر کر دیا گیا تھا۔

تین مورتی لائبریری کی اس دریافت کے چند ماہ بعد مجھے اپنے بک شلف کے نچلے حصے میں بارتھلومیوز کا اٹلس بوسیدہ حالت میں ملا۔ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس اٹلس میں مختلف مقامات دکھا کر تردیب مجھے کہانیاں سنایا کرتا تھا کئی سال قبل مایا دیبی نے یہ اٹلس مجھے دیا تھا۔

ایک دن جب یہ اٹلس میرے ہاسٹل روم کی میز پر کھلا پڑا تھا میری میز کے ڈرائر سے اتفاقاً ایک زنگ آلود کمپاس میرے ہاتھ لگا۔ مجھ سے پہلے جو طالب علم یہاں رہتا تھا شاید وہ اسے یہاں بھول گیا۔

میں نے اسے اٹھالیا اور اُس سے کھیلتا ہوا اس کا ایک سِرا کھُلنا پر رکھ دیا اور دوسرا پنسل والا سِرا سری نگر پر۔

ناک کی سیدھ جائیں تو کھُلنا سے کلکتے کا فاصلہ ایک میل سے زیادہ نہ ہوگا۔ سرحد کی دونوں طرف ان دونوں شہروں کا فاصلہ برابر برابر ہے۔ میں نے کمپاس سے ناپ کر دیکھا تو کھُلنا اور سری نگر کا فاصلہ ۱۲۰۰ کیلومیٹر ہے۔ یہ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن جب میں نے کمپاس سے اُسی اٹلس پر جس پر ترڈیب کی انگلیوں کے نشان ابھی باقی تھے ناپ کر دیکھا تو کھُلنا اور سری نگر کا فاصلہ مجھے اتنا ہی لگا جتنا ٹوکیو سے بیجنگ کا یا ماسکو سے وینس کا یا واشنگٹن سے ہوانا کا یا قاہرہ سے نیپلز کا۔

تب میں نے کھُلنا کو پرکار کا مرکز بنا کر سری نگر سے گزار کر ایک دائرہ بنانے کی کوشش کی۔ مجھے فوراً احساس پیدا ہوا کہ جنوبی ایشیا کا نقشہ کچھ بڑا نہیں ہے۔ مجھے اپنا دائرہ بنانے کے لیے پورے ایشیا کے نقشے کو گھیرنا پڑا۔

یہ ایک حیرت انگیز دائرہ بنا۔

سری نگر سے شروع ہو کر گھڑی کی سوئیوں کی مخالف سمت میں گھومتے ہوئے دائرے نے نصف پنجاب کو پاکستان سے علاحدہ کیا۔ راجستھان کی سرحد سے گزرتا ہوا بحیرہ عرب سے ہو کر جنوبی ہندوستان کے آخری کونے تک پھر سری لنکا میں کینڈی سے گزر کر بحیرہ ہند۔ وہاں سے سوماترا کے شمالی حصّے کو چھوتا ہوا تھائی لینڈ کے آخری کونے پر رُکتے ہوئے خلیج سے گزر کر پھر تھائی لینڈ میں نمودار ہو کر پھوم پینھ اور لاوس کی پہاڑیوں میں داخل ہو کر ویت نام میں ہیو سے قریب اور آگے ٹونکنگ کی خلیج میں داخل۔ آگے چین کی ریاست یُنان سے نکلتے ہوئے اور چنک کنگ سے گزر کر یانگزے کیانگ تک پھر دیوارِ چین سے ہو کر وسطی منگولیا اور سنکیانگ اور آخر میں قراقرم کے پہاڑ کے اُوپر سے دوبارہ کشمیر کی وادی میں پہنچ کر دائرے

نے اپنا سفر پورا کیا۔

یہ ایک غیر معمولی دائرہ تھا۔ آدھے سے زیادہ انسانی آبادی اس دائرے کے اندر بستی ہے۔

اس طرح تردیب اپنی موت کے پندرہ سال بعد بھی مجھے دیکھ رہا تھا کہ میں فاصلوں کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مثال کے طور پر اس کے اٹلس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ اقلیدس کے مکانی تصور کے مطابق تھائی لینڈ کا چیانگ مائی شہر دلی کے مقابلے میں کلکتے سے قریب ہے۔ اسی طرح چین کا چنگدو سری نگر کے مقابلے میں قریب ہے۔ میں نے دائرہ بنانے تک ان مقاموں کے نام سُنے نہیں تھے اور مجھے بچپن کا وہ زمانہ یاد نہیں جب میں دلی اور سری نگر کے ناموں سے آشنا ہوا تھا۔ اس دائرے نے مجھے بتایا کہ ہنوی اور ہونگ کنگ سری نگر کے مقابلے میں کھلنا سے قریب ہیں۔ اس کے باوجود کیا کھلنا کے باشندوں نے ویت نام اور جنوبی چین کی سرحدوں (جو صرف ایک جست کے فاصلے پر ہیں) کی پروا کی ہے؟ مجھے شک ہے۔ لیکن دوسرے رُخ پر ایک ہفتے سے زیادہ وقت نہیں لگا...

میں نے بے خیالی میں اٹلس کے پچھلے صفحات اُلٹے۔ اپنی آنکھیں بند کیں اور کمپاس کی سوئی کو اٹلس کے کسی بھی حصے پر ٹکنے دیا۔ یہ سوئی شمالی اٹلی کے شہر میلان پر ٹک گئی۔ اب میں نے میلان کو مرکز مان کر ۱۲۰۰ میل کے فاصلے کا دائرہ بنایا۔

یہ بھی ایک حیرت انگیز دائرہ تھا۔ فن لینڈ میں ہیلسنکی، سویڈن میں سنڈسوال، ناروے میں مولڈ اور جزائر شٹلینڈ کے اوپر سے گزر کر بحیرۂ اوقیانوس کے علاقے سے ہو کر کاسابلانکا پہنچا۔ وہاں سے آگے الجیریا کا صحرا، لیبیا، مصر، بحیرہ روم تک پہنچا جہاں پر کریٹ اور رہوڈس کو چھو کر ترکی تک نکل آیا۔ پھر بحیرہ اسود سے ہو کر روس میں کریمیا، یوکرین، بیلو رشیا، استونیا کو اپنے احاطے میں لیتا ہوا ہیلسنکی کے نقطۂ آغاز پر واپس ہوا۔

دائرہ بنانے کی اُلجھن کے ساتھ میں نے ایک چھوٹا سا تجربہ کیا۔ اپنی محدود معلومات کے مطابق میں نے کسی واقعے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ کوئی بھی واقعہ جو اس دائرے کے احاطے میں موجود شہر میں گزرا ہو (یا اس سے بالکل قریب) اسٹاک ہوم، ڈبلن، کاسابلانکا،

اسکندریہ، استنبول، لیو، کسی بھی طرف کا کوئی شہر۔ میں نے کسی بھی ایسے واقعے کے بارے سوچنے کی کوشش کی جس میں میلان کی آبادی باہر سڑکوں پر نکل آئی ہو۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی واقعہ یاد نہ آیا۔

صرف ایک جنگ کے سوا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ اس دائرے کے اندر تو مملکتیں ہیں اور اُن کے شہری ہیں۔ وہاں لوگ نہیں ہیں۔

جب میں نے پھر سے اپنے کو پہلے دائرے کی طرف رجوع کیا تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی ایک وقت ایسا بھی آیا تھا اور وہ زیادہ پرانی بات بھی نہیں کہ لوگ، زیادہ ہی ہوش مند لوگ، نیک ارادوں والے لوگ۔ ان لوگوں نے سوچا کہ سارے نقشے ایک جیسے ہی ہیں اور ان لکیروں میں ایک سحرکاری ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اس بات کو لے کر ان لوگوں پر الزام دینا مناسب نہیں کیونکہ یہ لوگ اس یقین کو قابلِ ستائش سمجھتے ہیں کہ سرحدوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے تشدد استعمال کیا جائے اور اس کے لیے سائنس اور کارخانوں سے مدد حاصل ہو اور یہ کہ یہی دنیا کا دستور بن گیا ہے۔ اسی دستور اور لکیروں کی سحرکاری پر عقیدہ رکھتے ہوئے انھوں نے سرحدیں متعین کیں شاید اس امید میں کہ انھوں نے نقشوں پر جو لکیریں کھینچیں اور اس کی وجہ جب سرحدیں بن گئیں تو زمین کے یہ دو ٹکڑے ایک دوسرے سے اسی طرح جُدا ہو جائیں گے جیسے ماقبل تاریخ میں گونڈوانا لینڈ ٹکڑوں میں بٹ کر علاحدہ ہو گیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ انھیں اس تقسیم سے کیا ملا جب انھیں پتہ چلا کہ لکیریں کھینچ کر وہ ایک دوسرے کو جُدا نہ کر سکے بلکہ انھوں نے ایک ایسی ستم ظریفی کی جس نے تردید کو مار ڈالا: اُن کے اس عمل سے ڈھاکہ اور کلکتہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہوئے کہ گذشتہ چار ہزار سال کی تاریخ میں ایسا لمحہ کبھی نہیں آیا۔ اس قدر قریب کہ میں کلکتہ میں رہ کر آئینہ دیکھوں تو ڈھاکہ پہنچ جاؤں۔ اس لمحے نے انھیں ایک دوسرے کی شبیہہ معکوس بنا دیا۔ وہ لکیریں جو ہمیں آزاد کرنے والی تھیں انھوں نے ہمارے حدود متعین کر دیئے۔ ہماری آئینے کی سرحدیں۔

جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ میری دادی کی کٹر سادگی پسندی کے باوجود ان میں ایک بڑی کمزوری تھی۔ وہ زیورات کی دلدادہ تھیں۔ بچپن ہی سے انھیں زیورات کا شوق اور اس بات سے سب لوگ واقف تھے۔ زیورات سے انھیں حد درجہ لگاؤ تھا۔

مجھے اس کا علم اس وقت ہوا جب میں نے ان لوگوں سے یہ بات سُنی جو ہمارے رشتے دار تھے اور ڈھاکہ میں رہتے تھے۔ وہ اسے جانتے تھے۔ زیورات کا نام لے کر اُسے چھیڑتے تھے پوچھتے تھے کہ وہ زیورات کیا ہوئے جنھیں اس نے میرے دادا کو خریدنے لگوایا تھا۔

لیکن اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کی میری دادی کو پروا نہ تھی۔

اچھا ہوا کہ وقت پر کام آنے کے لیے میرے پاس کچھ تو تھا۔ وہ چپکے سے کہتی میں نے کس طرح گزارا کیا ہوگا؟ وہ ساری مدت جو میں نے جھونپڑی میں گزاری۔ اس وقت تو تم لوگ [illegible] تو ہمیشہ کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ زیورات ہی تو میرے کام آئے۔

اس کے حریف رشتہ داروں [illegible] بند ہو جاتا۔ بعد میں جب وہ لوگ اس کی سماعت سے دور ہوتے تو مجھ سے کہتے کہ اس کے بچپن میں اس [illegible] کے شوق کو لے کر خاندان والوں نے لطیفہ بنا لیا تھا۔

وہ اکثر چند لمحات لین میں جوہری کی دکان پر کھڑی ہوتی۔ لوہے کے سلاخوں کے اندر جھانکتی ہوتی۔ سناروں کو اندر کام کرتے دیکھتی۔ خاندان کے لوگ خاص طور پر اس کے کزنس تو اس کی آمد سے پہلے اپنے زیورات کے ڈبوں کی چابیاں اپنی ساڑی کے پلو سے باندھے تیار رہتے۔ شادی بیاہ کے موقع پر خواتین اس کی رائے لیتیں کہ دُلہن کے لیے کس طرح کے گہنے خریدے جائیں۔ وہ تو ابھی بچی تھی لیکن لوگ اسے کسی جوہری کی نانی سمجھتے۔

بیوہ ہونے کے بعد سے میری دادی نے زیورات پہننا چھوڑ دیا۔ جز زیورات اُس کے

پاس بچ رہے تھے انھیں اس نے ماں کو شادی میں دے دیا۔ میری ماں جب بھی اس کے دیئے ہوئے کنگن اور نیکلس پہنتی تو انھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی لیکن میری ماں تو زیورات کی خواہش مند نہ تھی۔ وہ انھیں کبھی کبھار پہنتی۔ شادیوں میں بھی کم کم۔

ماں کی اس حرکت سے دادی ہمیشہ ناراض ہوتی۔ تم خالی گلے سے شادی میں جانے والی ہو؟ وہ میری ماں پر خفا ہوتی۔ شاید تم لوگوں میں بدنام کرنا چاہتی ہو کہ ہمارے پاس فاقے کرتی ہو۔

اس گرمی میں سونا پہننا حماقت ہوگی۔ میری ماں احتجاج کرتی۔

تو پھر میں نے انھیں کس دن کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ میری دادی اس کی طرف گھورتی۔ میں انھیں بھی بیچ سکتی تھی۔ اس لیے بچا رکھا تھا کہ بہو کو کوئی شکایت نہ ہو اور اب تم اپنی فیشن پرستی میں کہہ رہی ہو کہ تم سونا پہننا نہیں چاہتیں۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری جنریشن کی لڑکیاں فیشن پرست ہو گئی ہیں۔ تم لوگوں کے پاس چیزوں کی قدر نہیں ہے۔ تو میں بھی دیکھوں گی کہ تم اپنے نالائق بیٹے کو کسی ایک کمرے والے کرایہ کے مکان میں پالو پوسو۔ کسی گندی بستی میں اس کی پرورش کرو۔ اب میں یہی دیکھنا چاہتی ہوں۔

دادی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میری ماں اپنے کپ بورڈ سے اسٹیل کا صندوقچہ نکالتی اور اس میں سے دادی کا دیا ہوا کوئی زیور لے کر پہنتی۔

میری دادی بہانہ کرتی جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت خوش ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد مناسب موقع محل سے وہ میری ماں کو بلاتی اور اپنی انگلیاں اس کے نکلیس پر پھیرتی۔ ایسے وقت وہ مسکراتی اور اس دکان کا نام یاد کرتی جہاں سے وہ زیور خریدا تھا۔

میری ماں گھر سے باہر نکلتے ہی نکلیس کو گلے سے اتار کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیتی (تکلیف دہ وزنی چیز) میری دادی اس سے واقف ہی نہ ہوتی۔ وہ تو نکلیس کو دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتی۔

لیکن ایک زیور ایسا تھا جسے میری دادی نے کبھی اپنے سے جدا نہ کیا۔ وہ ایک پتلی لمبی زنجیر تھی جس میں ایک روبی جڑا تھا۔ یہ زنجیر اس کے جسم کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ جہاں تک مجھے

یاد ہے اس زنجیر کو اس نے گلے سے کبھی نہیں نکالا۔

تاہم اسے پہن کر وہ بہت شرماتی تھی۔ اسی لیے اس کی ساری کوشش یہ ہوتی کہ وہ اس کے بلوز کے اندر چھپی رہے اور کوئی دیکھ نہ پائے۔ اسے یقین تھا کہ اگر رشتہ داروں کی اس پر نظر پڑے تو وہ چہ میگوئیاں کرنے لگیں گے۔

میں جانتی ہوں کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ بڑبڑاتی۔ یہی کہیں گے۔ دیکھو اس کی طرف اسے بیوہ ہو کر کئی برس بیت گئے لیکن اب بھی وہ ایک لڑکی کی طرح زیور پہنتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا باپ بھی اپنے دل میں یہی سوچتا ہوگا۔

ساتھ ساتھ میرے باپ کو بھی وہ اپنے خیالات سے واقف کروانا نہ بھولتی۔ میرے باپ کا جہاں تک تعلق تھا وہ تو اصرار کرتے کہ دادی نکلیس ہی کیا بلکہ سارے زیورات پہنے تاکہ وہ انھیں دیکھ کر خوش ہوں۔ وہ تو چاہتے تھے اُن کی ماں بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسی طرح کلب جائے جیسے ان کے دوسرے ساتھیوں کی فیشن پرست مائیں اپنے ماضی کی رکاوٹ کا احساس دلانے کے لیے طرح طرح کے زیور اپنے گلوں اور کلائیوں میں پہن کر جاتی ہیں۔

جب بھی میرے باپ یہ کہتے کہ دادی کا زیور پہننا انھیں برا نہیں لگتا تو میری دادی اس پر کبھی یقین نہ کرتی۔ میرے باپ تو نہیں چاہتے تھے کہ میری دادی کوئی زیور پہنے۔ یہاں تک کہ وہ سونے کی پتلی زنجیر بھی نہیں گو ان کے دل میں پوشیدہ ایک احساس تھا کہ اس سے ان کے مرحوم باپ کی توہین ہوتی ہے۔

ویسے میری دادی کے ذہن میں توہین کا تصور دور دور تک نہ تھا۔

میں اسے اس لیے پہنتی ہوں کہ انھوں نے اسے مجھے تحفہ دیا ہے۔ تمہارے دادا نے ایک بار اس نے مجھ سے وضاحت کی۔ یہی تو ایک چیز تھی جو انھوں نے مجھے دی۔ رنگون میں ہماری شادی کے فوراً بعد۔ وہاں بڑے قیمتی اور عمدہ روبی دستیاب ہیں۔ یہ میں کسی اور کو دینا نہیں چاہتی۔ انھیں یہ بات پسند نہ ہوگی۔ ان بتیس برسوں میں میں نے ایک بار بھی اسے اپنے گلے سے نہیں نکالا۔ میرے گلے کا جب آپریشن ہوا تھا تب بھی نہیں۔ انھوں نے نکالنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن میں نے اسے اسٹرلائز کروا کر اپنے گلے میں رہنے دیا۔ اس کے بغیر میں آپریشن

کے لیے تیار نہ تھی۔ اب یہ میرے جسم کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔

کبھی کبھی اُس کی گردن کی مالش کرتے ہوئے یا جب وہ اپنی کرسی پر سو گئی ہوتی تو میں اس زنجیر کو اس کے بلوز میں سے کھینچ لیتا اور اس پر اپنی انگلیاں گھماتا۔ اس پر اتنی لکیریں پڑ گئیں تھیں اور رنگ بھی اتنا پھیکا پڑ گیا تھا کہ وہ سونے کی لگتی ہی نہ تھی۔ اس میں بھی امی کے جسم کی بو آتی۔ صابن کی، کلف اور پاؤڈر کی۔ اور تھوڑی سی دھات کی بو بھی شامل ہو جاتی۔ یہ زنجیر سچ مچ اس کے جسم کا ایک حصّہ تھی۔

اور ایک دن سن ۱۹۶۵ء کے سال میں جب کہ دادی کو ڈھاکہ کا سفر کیے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اس نے وہ زنجیر گلے سے نکال دی۔

ایک دوپہر جب میں اسکول سے گھر آیا تو میں نے اوپر دادی کے کمرے میں ریڈیو کی اونچی آواز سنی۔ آواز اتنی تیز تھی کہ بس اسٹاپ کے فٹ پاتھ تک سنائی دے رہی تھی۔ میری ماں اپنے بستر پر اوندھی لیٹی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ اس کی کنپٹیوں کو پکڑے ہوئے تھے اور ایک گیلا کپڑا۔ اس کی آنکھوں سے لگا ہوا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔

کون جانے سوائے خدا کے۔ اس نے کہا۔ تمہاری دادی آج صبح دس بجے گھر سے باہر گئی اور چند گھنٹوں بعد واپس آئی۔ اُس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ میں نے خود اس سے پوچھا اور کہا کہ اگر وہ کچھ نہ کھائے گی تو بیمار پڑے گی، لیکن کون کس کی سنتا ہے؟ کچھ کہے بغیر وہ اوپر چلی گئی۔ ریڈیو لگا کر اُس نے آواز اونچی کی۔ تب سے یہ آواز آ رہی ہے۔ جب خبریں ہونے لگیں تو اُس نے آواز کو اور بھی اونچا کیا۔ ابھی تک تین بار ایسا ہو چکا ہے۔

وہ کہاں گئی تھی؟ میں نے پوچھا۔ میں حیرت میں پڑ گیا تھا کیونکہ وہ اپنے کمرے سے باہر کہیں جاتی ہی نہ تھی۔ گذشتہ ایک سال میں وہ جتنی بھی باہر گئی اسے ہم اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

میری ماں نے کندھے جھٹکائے اور منہ بسور لیا۔ کون جانے وہ کہاں گئی تھی؟ اس نے کہا۔ کسے پروا ہے؟

کیا تم نے اوپر جا کر نہیں پوچھا؟ میں نے کہا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے جواب نفی میں ملے گا

اس لیے کہ اس گھر میں میں اکیلا ہی ایسا فرد تھا جسے وہ اپنے کمرے میں آنے دیتی تھی۔

تم جاکر اس سے کیوں نہیں کہتے آواز کم کر دے ؟ میری ماں نے کہا۔ شاید وہ تمہاری بات سن لے۔ میرے پوچھنے کا کوئی حاصل نہیں ہے۔

میں اوپر بھاگا اور دادی کے کمرے کو دھکیل کر کھولا۔ میں اس کی صرف پشت دیکھ سکا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ ریڈیو کو پکڑے ہوئے تھی جیسے وہ منتظر ہو کر ریڈیو کی آواز اس کے اندر ایک شگاف پیدا کر دے۔

اسے دیکھتے ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی۔

تھاما! میں چلایا۔ تمہاری زنجیر کیا ہو گئی ؟ تم نے اسے کیا کیا۔

تب وہ میری طرف پلٹی۔ گیلے لٹوں کی شکل میں بال اس کے چہرے پر لٹک رہے تھے۔ آنکھیں دمک رہی تھیں اور عینک نیچے پڑی ہوئی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے خوف ہوا اور میں پچھتانے لگا کہ میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیوں کیا۔

میں نے اسے دے دیا ہے۔ اس نے کہا۔ اس کی دمکتی اور ٹھہری ہوئی آنکھیں میری طرف نہیں تھیں بلکہ میرے سر کے اوپر سے دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

کیوں تھاما۔ میں نے کہا تم نے ایسا کیوں کیا ؟

میں نے اسے دے دیا ہے۔ وہ چلائی۔ میں نے اسے جنگ کے چندے میں دے دیا ہے۔ دینا ہی تھا۔ کیا تم نہیں سمجھو گے ؟ تمہاری ہی خاطر۔ تمہاری آزادی کی خاطر۔ ہمیں انھیں مار ڈالنا ہے اس سے قبل کہ وہ ہمیں مار ڈالیں۔ تمہیں ان کا صفایا کرنا ہے۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ریڈیو کو پیٹ رہی تھی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور دروازے کا ہینڈل تلاش کرنے لگا۔

یہی ایک موقع ہے۔ وہ حلق کے اندر سے چیخی۔ بس ایک موقع۔ آخر کار ہم ان سے ڈھنگ کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ٹینکوں سے، بندوقوں اور بموں سے۔

اس کی ایک مٹھی ریڈیو کے اسکرین پر پڑی اور وہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ شیشے کے ٹکڑے فرش پر گر پڑے اور ریڈیو سے آواز آنی بند ہو گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کے

ہاتھ کی جھڑی شیشوں کے ٹکڑوں سے چھٹ کر الگ ہو گئی۔ خون بہتے ہوئے ہاتھ کو اس نے جھٹکا دیا۔ پھر اُسے اپنی گود میں رکھ کر دیکھنے لگی۔ رِستا ہوا خون اس کی ساڑی کے کناروں پر ٹپک رہا تھا اور گہرے ارغوانی رنگ میں ساڑی کو بھیگتے ہوئے دیکھ کر وہ محفوظ ہو رہی تھی۔

مجھے دواخانہ جانا چاہیے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ بڑے سکون کے ساتھ۔ مجھے سارا خون ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میں اسے جنگ کے فنڈ میں عطیہ دے سکتی ہوں۔

اس پر میں نے ایک چیخ ماری۔ پیٹ کے اندر کی گہرائی سے اپنے سر کو تھامے اور آنکھوں کو میچے ہوئے میں اس وقت تک چیختا رہا جب تک کہ ہمارے نوکر اور میری ماں مجھے اپنے کمرے پر لے جانے نہیں آئے۔ تب بھی میں چیختا ہی رہا اور اپنی آنکھیں بند رکھیں۔

میں اس وقت بھی کانپ رہا تھا جب ماں ڈاکٹر کو لے کر میرے کمرے میں آئی۔ اس نے میرا سر تھپک کر کہا۔ ڈاکٹر تمہیں انجکشن دیں گے تاکہ تم تھوڑی دیر آرام کر سکو۔

میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا اور کہا۔ تھاتا کو کیا ہو گیا ہے؟

اس کی فکر نہ کرو۔ ماں نے کہا۔ وہ ٹھیک ہے۔ تمہارے باپ ایک اور ڈاکٹر لے آئے اور اب آئے ایک دوسرے اچھے دواخانے کو لے گئے ہیں جہاں وہ چند دن آرام کرے گی۔ ڈاکٹر اور نرسیں اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ اب وہ سکون سے رہے گی اور خوش رہے گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔

اُس نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے کہا۔ وہ چاہتی کیا ہے؟

جب ڈاکٹر اپنی سرنج کا معائنہ کر رہا تھا تو میری ماں تشویش سے میری پیشانی کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

تھاتا کی فکر نہ کرو۔ اس نے کہا۔ پاکستان سے جنگ کا معاملہ ہے۔ تمام وقت وہ ریڈیو کی خبریں سنتی رہی ہے۔ یہ اس کے لیے اچھا نہیں ہوا۔ جب سے وہاں تردیب کو مارا گیا ہے وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔

تردیب کو مارا گیا۔ میں نے کہا۔ سوئی میری بغل میں دھنسی جا رہی تھی۔ تردیب کو کس نے مارا؟ تم نے تو کہا تھا کہ وہ حادثہ تھا۔

ہاں، ہاں۔ میری ماں نے فوراً کہا۔ میرا یہی تو مطلب تھا۔ اب سو جاؤ۔ فکر نہ کرو۔

مار ڈالا؟ تم نے کیوں کہا۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟

انجکشن کا اثر مجھ پر ہونے لگا تھا۔ پھر نیند کا غلبہ چھانے لگا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں سب کچھ بھول گیا۔

وہ پہلا موقع تھا مجھے محسوس ہوا کہ تردیب کی موت کا سبب حادثہ نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ جب اس کی نعش ڈھاکہ سے لائی گئی تھی تو مجھے اپنی ماں کے بھائی کے پاس درگاپور میں رہنے کے لیے بھجوا دیا گیا تھا۔

اسے جب جلا دیا گیا تو میں بہت دور تھا۔ اسی دن مئے لندن کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد بابا دیبی اور اس کا خاندان ڈھاکہ واپس ہو گیا۔

میں کچھ نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ کچھ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ تردیب مر چکا ہے۔

ایک ہفتہ بعد مجھے لینے کے لیے ماں باپ درگاپور آئے۔ کلکتہ جاتے ہوئے میرے باپ نے کار کو دکشنیشور میں مہا کالی کے بڑے مندر کے پاس روکا۔ مجھے عجیب سا لگا کیونکہ میں جانتا تھا کہ دیولوں کے پاس ہجوم کو چیر کر گزرنا میرے باپ کو پسند نہیں ہے۔ ہم لوگ یہاں کیوں رکے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

کوئی بات نہیں۔ انھوں نے کہا۔ یکایک مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک خاص موقع ہے۔

ہم نے کار کو مقفل کیا اور دیول کے اندر گئے۔ ہمارے پیچھے چند پجاری لگے تھے۔ میرے باپ نے ہمارے خاندانی پجاری کو پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر ہمارے پاس پہنچا اور ہم لوگوں کو ہجوم سے گزار کر مندر کے اندرونی حصے میں لے گیا جب ہم پرساد ہاتھ میں لیے مندر کے پھیرے کر رہے تھے تو میرے باپ نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور کہا۔ سنو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ایک افسوسناک واقعہ ہو چکا ہے۔ اس وقت تم درگاپور میں ہم لوگوں سے دور تھے۔ ڈھاکہ میں تردیب ایک حادثہ میں مر گیا۔

وہ رکے اور جھک کر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ میں رو پڑوں گا۔ لیکن میرے لیے مرنا صرف ایک لفظ تھا جو فلم اور حکایات کی دین تھا۔ صرف اسی حد تک۔

اُسے کسی وجود سے وابستہ کرنے کے لیے میرے پاس کوئی وجہ نہ تھی جیسا کہ تردیب کیا کرتا تھا۔ میں نے کچھ محسوس نہیں کیا۔ نہ کوئی بجلی گری نہ کوئی شدید صدمہ۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی نہ آئی کہ اب میں اسے کبھی دیکھ نہ سکوں گا۔ میرے ذہن میں ابھی اتنی وسعت نہ تھی کہ اس میں کسی کی غیر حاضری کے احساس کو جگہ دے سکوں۔

کیسا حادثہ تھا؟ میں نے پوچھا۔

ان کی کار کو چند غنڈوں نے روکا تھا۔ میرے باپ نے مجھ سے کہا۔ غنڈے جنھیں تم ہر جگہ پاتے ہو۔ کار نے جھوکا کھایا اور شاید کسی دیوار سے ٹکرا گئی۔ بس اتنا ہی ہوا تھا۔ کسی اور کو چوٹ نہیں لگی۔

میں نے اپنا سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے ہاتھ میں پرساد ابھی تک محفوظ تھا۔

نہیں ـــــ رُکو، میرے باپ نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ سنو، تم مجھ سے وعدہ کرو۔ یاد رکھو۔ تمہارے ہاتھ میں مہاکالی کے پھول ہیں اور تم اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کسی اور سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ اسکول میں بھی نہیں۔ ماشو سے بھی نہیں۔ پارک میں اپنے دوستوں سے نہیں۔ تم جانتے ہو۔ تردیب کے باپ میتھو موشائی حکومت کے ایک اہم عہدیدار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ اس سے واقف ہوں۔ اسے راز میں رکھنا ہوگا۔ اسی لیے تم اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم اس کے بارے میں تھانا سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ یوں بھی وہ پریشان ہے اور اگر تم نے اس بارے میں کوئی بات چھیڑ دی تو وہ اور بھی پریشان ہو جائے گی۔ اب تم بڑے ہو رہے ہو۔ بڑے بچے۔ اور تمہیں تو معلوم ہے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بڑے لوگ کبھی نہیں کرتے۔

میں نے اپنا سر ہلایا لیکن ان سے کوئی وعدہ نہیں کیا اس لیے نہیں کہ میں وعدہ پورا نہ کر سکوں گا بلکہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس بات کو اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔ میرے دوست ایسے کسی حادثے سے دلچسپی نہیں رکھتے جو کہیں بہت دور ہوا ہو۔ بات کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ ایک حادثہ ادنیٰ سا ہوا نہ ہے مرنے کا۔

روبی نے تردیب کی موت کا ذکر پہلی بار لندن میں کیا تھا۔ ستمبر کے اختتام کا وہ ایک سہانا دن تھا جب اِلا ہم لوگوں کو مسز پرائس سے ملانے کے لیے کیمنگٹن روڈ لے گئی تھی۔

اِلا نے مجھ سے اور روبی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ ریسٹورنٹ "انڈین" میں ہمیں ڈنر دے گی۔ کلاپ ہام میں وہ بنگلہ دیشیوں کی ایک چھوٹی سی جگہ تھی جسے مہاراجہ کہا جاتا تھا۔ مسز پرائس سے ملنے کے بعد ہم لوگ وہاں جانے والے تھے۔ جب ہم نِک کے ساتھ ویسٹ ہمپسٹڈ ٹیوب اسٹیشن کی طرف جارہے تھے تو اِلا نے بہت اصرار کیا کہ نِک بھی ہمارے ساتھ آئے لیکن نِک نے معذرت کرلی۔ اس نے کہا تھا کہ اس شام اسے دوسرا کوئی کام ہے۔ کسی اور موقع پر وہ ہمارا ساتھ دے گا۔ اس نے ویسٹ ہمپسٹڈ اسٹیشن پر ہم لوگوں کو خدا حافظ کہا۔

اِلا اس قدر بد دل ہوئی کہ اس نے کلاپ ہام کامن پہنچنے تک ایک لفظ بھی نہ کہا۔

زیر زمین اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور پر رسٹورانٹ واقع تھا جوں ہی ہم باہر نکلے اِلا نے شیشے کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی مدھم روشنی کی طرف اشارہ کیا۔ بھاری مخملی پردے لٹک رہے تھے۔ گویا نیز سے لے کر ترکش جیسے کئی اور چھوٹے چھوٹے کھانے کے مقامات اس جگہ تھے۔ جب روبی نے دروازہ کھولا تو ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایک تنگ مستطیل کمرے میں پایا۔ کمرے کو کئی کیوبیکس میں تقسیم کردیا گیا تھا اور وہاں میز اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر پیتل کے شمع دان روشن تھے اور کرسیوں پر اطلس کا کپڑا لگایا گیا تھا۔ کمرہ مسالوں کی خوشبو سے ایسے بھرا تھا جیسے سنٹرل ہیٹنگ کا نظام باورچی خانے کے مسالوں کی خوشبو اسی ہال میں سمیٹ لایا ہو۔

ہم جب وہاں داخل ہوئے تو رسٹورانٹ تقریباً خالی تھا۔ کمرے کے اس پار کاؤنٹر کے پیچھے جو آدمی کھڑا تھا اس نے اِلا کو دیکھتے ہی ہماری طرف ہاتھ ہلایا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

رحمٰن صاحب۔ کیسے ہو؟ اِلا نے اپنا کوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

میں بہت اچھا ہوں۔ کھل کر مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ بوڑھے قدمیں وہ درمیانی

عمر کا آدمی تھا۔ گال دائرے نما تھے اور سر کے بال سفید۔ وہ سیال جیکٹ پر سفید بوٹائی پہنا ہوا تھا اور سلہٹ والوں کے لہجے میں ناک سے آواز نکالتا ہوا بنگالی میں بات کر رہا تھا۔

آپ اتنے دنوں سے کہاں تھیں؟ وہ اِلا سے کہہ رہا تھا۔ آپ طویل عرصے سے دکھائی نہیں دیں تو میں نے سمجھا آپ اسٹاک ویل سے کہیں جا چکی ہیں۔

اِلا ہنسی۔ وہ نہیں۔ رحمٰن صاحب۔ اس نے کہا۔ میں تمہیں بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔

رحمٰن صاحب ہم لوگوں کو ایک میز کی طرف لے گیا۔ کرسیوں کو پیچھے کھینچتے ہوئے اُس نے ہم سب کو ہاتھوں میں ایک ایک مینو کارڈ دیا۔ روبی نے اپنا کارڈ کھولا۔ تھوڑی دیر تک اُسے پڑھتا رہا پھر میری طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔

چکن سنگاپور؟ اس نے آہستہ سے کہا۔

پران بابے؟ میں نے جواب دیا۔

روبی نے سانس کھینچی اور اپنا مینو کارڈ بند کیا۔ اِلا تم آرڈر کیوں نہیں دیتیں۔ تم اس جگہ سے واقف ہو۔

اِلا نے مینو کارڈ دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور فوراً آرڈر دیا۔ جب رحمٰن صاحب ہمارا آرڈر لے چکا اور رسوئی گھر کی طرف گیا تو اِلا نے ہماری طرف جھک کر چپکے سے کہا۔ اسے کچھ ایسی کھانا سمجھو۔ اسکیمو کے کھانوں کی طرح۔ پھر تمہیں مزہ آئے گا۔ تمہیں اپنی ماں کے ہاتھ سے بنائے ہوئے کچوری اور رکابات تو ملنے سے رہے۔ اپنی زندگی [illegible] کی توقع نہ رکھنا۔

کھانا میز پر لگا دیا گیا تو اس کی باتیں سچ ہی ثابت ہوئیں۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ہم پوری طرح سے مانوس ہوں۔

یخنی، ملائی اور ووسٹر شائر کی چٹنی کی وجہ سے سالوں کا جانا بوجھا ذائقہ بالکل بدل گیا تھا۔ تاہم کھانے لذیذ تھے۔ ہم لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔ روبی نے اپنے ان دوستوں کی کہانیاں سنائیں جو انڈین سول سروس سے وابستہ تھے۔ چٹ پٹی کہانیاں۔ ان نوجوانوں کی جو دور دراز کے اضلاع میں بڑی بڑی شاندار عمارتوں میں تنہا رہتے تھے۔ علامتی شاعری کرتے ہوئے اور مچھر مارتے ہوئے اپنا وقت گزار رہے تھے۔

میز پر سے برتن ہٹا دیئے گئے تو اِلا نے اپنے کریڈٹ کارڈ سے ڈنر کا بل ادا کیا۔ رحمٰن صاحب ایک ٹرے میں تین پیالیاں کافی لے کر آیا۔

یہ ہماری طرف سے ہے۔ اس نے کہا۔ ہوٹل کی طرف سے نذرانہ۔ آر۔ کی۔ آپ جانتے ہیں۔ یہاں کا یہ رواج ہے۔

اوہ رحمٰن صاحب! اِلا نے کہا۔ یہ سب تم نے کیوں کیا؟ اس کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اب تم تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ بیٹھو گے۔

ہاں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ بیٹھو۔ میں نے حامی بھری۔ میرے لیے کلکتے میں سُنی جانے والی بنگالی بولی کا لندن کی گلیوں میں سُننا ستم ظریفی سے کم نہ تھا۔

ٹھیک ہے۔ رحمٰن صاحب نے کہا اور ایک کرسی ہماری طرف کھینچی۔ وہ عجیب خاموشی کا ایک لمحہ تھا۔ پھر اِلا نے کہا۔ رحمٰن صاحب کیا تم جانتے ہو کہ میرے ایک انکل روبی آپ کے دلیس ڈھاکہ میں رہتے تھے جب کہ وہ بچے تھے۔

ایسا ہے کیا؟ رحمٰن صاحب نے کہا۔ کچھ عرصے کے لیے میں بھی وہاں رہا۔ آپ کہاں رہتے تھے۔

یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ روبی نے کہا۔ سن ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۶ء کے درمیان۔

اچھا رحمٰن صاحب نے کہا میں اس سے قبل ہی وہاں سے نکل آیا۔ میں نے ایک جہاز میں نوکری کرلی۔ کیا آپ دوبارہ وہاں گئے تھے؟ بنگلہ دلیش آزاد ہونے کے بعد؟

روبی نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

آپ کو جانا چاہیے۔ رحمٰن صاحب نے کہا۔ اب وہ مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ بلکہ ماڈرن۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ شہر میں کس جگہ رہتے تھے۔

دھن منڈی میں۔ روبی نے کہا۔

آہ، دہاں! رحمٰن صاحب نے کہا۔ وہ تو رئیسوں اور بدیسیوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ کبھی آپ پرانے شہر بھی گئے تھے؟ اس جگہ پر آپ کو جانا چاہیے تھا۔ جو مٹھائیاں آپ کو وہاں ملتی ہیں، دنیا میں ایسی کہیں نہیں ملتیں۔ کلکتے میں بھی نہیں۔ اور لوگ۔ ! وہ اس قدر مہمان نواز ہیں کہ سیدھے اپنے گھر لے جائیں۔ مگر

روبی کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آگئی۔

اِلا نے میری طرف فکر مند نگاہوں سے دیکھا اور اپنی کرسی کو پیچھے ڈھکیلا۔

میرا خیال ہے کہ آپ شہر کے اس حصّے میں کبھی نہیں گئے۔ گئے تھے کیا؟ روبی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے رحمٰن صاحب نے کہا۔

ہاں۔ روبی نے کہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میری ماں وہیں پیدا ہوئی تھی۔

روبی کی مسکراہٹ میں اب تصنّع آگیا تھا۔ ہاں۔ اس نے کہا۔ مجھے یاد ہے۔ صدر بازار سے ہوکر سڑک سے اُتر کر آگے جائیں گے دور تک سڑک پر دُکانیں ہیں۔ پھر ایک موڑ پر میدان ہے جہاں بچّے فٹ بال کھیلتے ہیں۔ وہیں لوہے کے سامان کی ایک دُکان ہے۔ وہاں سے ایک گلی نکلتی ہے۔ اسی جگہ میری ماں پیدا ہوئی تھی۔ چندا بہار لین، ڈھاکہ۔

اللہ۔ رحمٰن صاحب نے کہا۔ میں سمجھ گیا۔ آپ کو خوب یاد ہے لیکن آپ اُس وقت بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔ آپ کو یہ سب کیسے یاد رہا۔

میں نے اپنی کرسی پیچھے کی اور کھڑا ہو گیا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میں نے کہا۔

لیکن روبی نے سنا نہیں۔ وہ رحمٰن صاحب کی طرف جھکا ہوا تھا۔ میز کو تھامے ہوئے۔ سب کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔

مجھے اس لیے یاد ہے کہ میرا بھائی وہاں مارا گیا۔ اس نے کہا۔ اب فسادمیں۔ وہ اس جگہ سے دور نہیں جہاں میری ماں نے جنم لیا تھا۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے کیوں یاد رکھا۔

رحمٰن صاحب اُچھل پڑا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

روبی اُٹھ کھڑا ہوا۔ راستہ تلاش کرتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

اوہ میں تو، رحمٰن صاحب نے اِلا سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ سچ مچ میں نہیں چاہتا تھا کوئی بات نہیں۔ اِلا نے فوراً کہا۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم نہیں چاہتے تھے۔

یہ میری — مجھے اس موضوع کو چھیڑنا ہی نہیں تھا۔

اِلا نے اپنا کوٹ اُٹھا لیا۔ رحمٰن صاحب نے کاندھے کو آخری بار تھپکا اور سرگوشی میں اس

سے کہا۔ کوئی بات نہیں فکر نہ کرو۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ رسٹورانٹ سے باہر آئی۔

ہمارے باہر آنے تک وہ جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہم نے اسے جاتے ہوئے بجلی کے کھمبے کے پاس دیکھا تھا۔ وہ کلاپ ہام روڈ پر تیز تیز قدموں سے اسٹاک ویل کی طرف جا رہا تھا۔ ہم نے اُس کے پیچھے دوڑنا شروع کیا۔

جب ہم اس کے قریب پہنچ گئے تو اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اتنے بڑے بڑے ڈگ بھر رہا تھا کہ ہمیں اس کے ساتھ دوڑنا پڑا۔ کلاپ روڈ پر فاسٹ فوڈ شاپ سے آگے تک ریلوے پُل کے نیچے سے شمالی کلاپ ہام کے زیر زمین اسٹیشن تک چلتے رہے۔ آخر کار روبی وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے اپنے کاندھے جھٹکے اور کہا۔ میں یہاں کہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ منٹ کے لیے۔

ہماری بائیں جانب ایک ہرا بھرا باغ تھا۔ اس میں ایک ایسا چرچ تھا جہاں شاید لوگ اب نہیں آتے تھے۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ روبی ہم لوگوں کو لے کر گیٹ میں داخل ہوا اور ہم سیڑھیوں تک پہنچے۔ وہاں پتوں کو جھاڑ کر اُس نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی اور سگریٹ سلگا لیا۔

آپ لوگ جانتے ہیں یہ ایک خواب ہے۔ اس نے سگریٹ کا دھواں اپنے پاؤں کی طرف اُڑاتے ہوئے کہا۔ پچھلے دو برسوں میں میرے ساتھ کم از کم دو بار ایسا ہوا ہے۔ ابتدا میں جب میں ابھی بچہ تھا تو یہ ہر ہفتہ ہوا کرتا تھا۔ کالج کے زمانے میں۔ اب میں نے اس پر قابو پا لیا ہے۔ مجھے پہلے ہی سے احساس ہو جاتا ہے کہ ایسا ہونے والا ہے۔ ان راتوں میں میں جاگتے رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہمیشہ یہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہماری کار کسی طرف مڑنے والی ہوتی ہے۔ ایک طرف کیچڑ سے بھرا کھیت ہوتا ہے۔ چھوٹا میدان سا۔ اس میں کوئی بے تکا سا کھمبا گڑا ہوتا ہے۔ کونے پر ہم گاڑی موڑتے ہیں۔ وہ وہاں ہیں۔ ہم لوگوں سے آگے ہٹ کر۔ پر قطار میں کھڑے ہیں۔ کبھی تو ہجوم ہے اور کبھی تھوڑے سے لوگ۔ اب میں ان کے چہروں کو پہچاننے لگا ہوں۔ اپنے دوستوں کے چہروں سے بھی بہتر۔ ایک کا چہرہ پتلا ہے اور مونچھیں گھنی۔ ٹیڑھا منہ۔ وہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ لوگ کتنے ہی ہوں۔ تھوڑے سے یا درجن آدمی وہ موجود ہے۔ سڑک ہمیشہ سنسان ہوتی ہے۔ جب ہم وہاں سے گزر رہے

تھے تو اُس پر ایک ہجوم تھا۔ بازار لگا تھا۔ ساری دُکانیں کھلی تھیں۔ آتے جاتے لوگ۔ رکشائیں ٹھیلے، گاڑیاں، پھیرے لگانے والے، خچر۔ دُکانوں کے اوپر بھی مکانوں میں لوگ ۔ بالکونیوں اور کھڑکیوں میں سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ۔ لیکن اب ساری دُکانیں بند ہیں۔ بالکونیوں میں کوئی نہیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ رُکاوٹیں ہیں ۔ سڑکیں سنسان ۔ لیکن اُن آدمیوں کے لیے نہیں۔ کبھی کبھی دوسری چیزیں بھی دیکھتا ہوں۔ مثال کے طور پر ایک ہرے رنگ کا ناریل بیچ سڑک پر پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے گھومنے لگتا ہے۔ فٹ پاتھ پر ایک چپل پڑی ہے۔ اس کے جوڑ کی چپل نہیں ہے۔ صرف ایک ربر کی چپل جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

کار کے اندرونی حصے میں رگڑ کی آواز آرہی ہے۔ اُسے جھٹکا پڑا ہے۔ سب کے سب اگلی جانب لڑھک گئے ہیں۔ اس قدر تیزی سے کہ میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا ہے۔ پچھلی سیٹ پر کوئی۔ شاید میری ماں ۔ میں یقین سے کہہ نہیں سکتا۔ چیخ رہی ہے۔ رُکو مت۔ تیز چلاؤ۔

اور کار چلتی رہتی ہے۔ ڈرائیور نے کلچ ٹھیک سے دبائے بغیر گیئر بدلا ہے۔ یہ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رفتار میں استواری نہیں۔ جھٹکے پڑ رہے ہیں اس لیے کہ ڈرائیور گھبرایا ہوا ہے۔ اسے اپنے سیدھے پاؤں پر قابو نہیں ہے۔ اُس کی ٹوپی کہیں گر چکی ہے۔ وہ اسٹیرنگ پر جھکا ہوا ہے۔ چہرہ پسینے سے تر بہ تر۔ اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا سکیورٹی گارڈ اپنی قمیض میں کچھ ٹٹولتا ہوا سامنے دیکھ رہا ہے۔

اب لوگ ہماری طرف بڑھنے لگے ہیں۔ وہ دوڑ نہیں رہے ہیں۔ وہ دبے پاؤں اسکٹنگ کرنے والوں کی طرح پھسل رہے ہیں۔ پھر وہ ہمارا راستہ روک لیتے ہیں۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ میں نہیں سن سکتا۔ کوئی آواز بھی نہیں۔

سکیورٹی گارڈ مجھے نیچے کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور پیچھے دیکھ کر اطمینان کر لیتا ہے کہ کار کے دروازے بند ہیں۔ اپنی جگہ سے میں صرف اس کا بلو یونیفارم دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ میں باہر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں اُسے اپنی قمیض کے اندر کچھ تلاش کرتا دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک ریوالور ہے۔ اس کا رنگ بڑا عجیب ہے۔ سلیٹ کی

طرح بھورا۔ میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں اس لیے کہ وہ ٹھیک میرے چہرے کے سامنے ہے۔

پھر کار اپنا رخ بدلتی ہے۔ تب ہی اس کے بانٹ پر ایک زور کا گھونسہ پڑتا ہے۔ پیچھے کوئی چیختا ہے۔ میں اپنا سر ذرا اونچا ونڈ اسکرین کے برابر کر کے دیکھتا ہوں۔ وہاں ایک چہرہ ہے شیشہ کے اس پار۔ چپٹی ناک، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ یہ ٹیڑھے منہ کا آدمی ہے۔ وہ بانٹ کے اوپر لمبا لیٹا ہے اور اس نے مجھے دیکھا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ اُٹھا کر پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ کیا ہے مجھے نہیں معلوم میں اسے کبھی دیکھ نہیں سکتا۔ اس کا ہاتھ گھوم کر سر پر سے ہوتے ہوئے کمان کی طرح آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ونڈ اسکرین ایک دھماکے کے ساتھ ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ میں جب ڈرائیور کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے چہرے پر گہرا زخم ہے۔ وہ لٹکتی ہوئی جلد کو اپنے گال سے لگا کر تھامے ہوئے ہے۔ اس کا کوئی ہاتھ اسٹیرنگ پر نہیں ہے۔ کار جھٹکا کھاتی ہے۔ آگے کی طرف لڑھکتی ہے اور رک جاتی ہے اس کا اگلا پہیہ موری میں پھنس گیا ہے۔

سکیوریٹی گارڈ مجھے دوبارہ نیچے کی طرف دباتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر کود پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تیار ہے۔ وہ چلا کر کچھ کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کہتا ہے۔ وہ پھر چیختا ہے۔ ایک گونج نکلتی ہے۔ اس نے فائر کر دیا ہے۔ تب میں باہر دیکھتا ہوں کھڑکی سے باہر ہمارے اطراف لوگوں کو گھیرا بنائے ہوئے دیکھتا ہوں۔ پھر وہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ریوالور کی گونج بند کھڑکیوں اور خالی بالکونیوں سے ٹکرا کر ابھی بازگشت کر رہی ہے

وہ لوگ ہماری طرف اور ہم لوگ اُن کی طرف دیکھ رہے ہیں اور مکمل سکوت ہے۔ اس قدر خاموشی کہ میں ڈرائیور کے خون کے قطروں کے اسٹیرنگ پر گرنے کی آواز سُن رہا ہوں۔ پھر سکوت ٹوٹتا ہے۔ پیچھے سے کہیں چرچراہٹ کی آواز آتی ہے۔ چھوٹی سی آواز۔ یہی آواز خاموشی کے ماحول میں گرج کی طرح لگتی ہے۔ ہم سب پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ہم کار کے اندر۔ وہ کار کے باہر۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ وہ رکشا ہے۔ خلیل کی رکشا۔ بوڑھے آدمی کے ساتھ ہمارے چھوٹے دادا جنھیں ہم لینے کے لیے گئے تھے وہ رکشا کے پیچھے بیٹھے ہیں۔ وکیل کا کوٹ پہنے ہوئے۔

میں جیسے جیسے دیکھ رہا ہوں رکشا کا سائز بڑھتا جا رہا ہے۔ بہت بڑا۔ وہ رکشا اتنا بڑھتا

ہے کہ دکانوں اور مکانوں کے سائز سے بڑھ جاتا ہے۔ اتنا بڑا کہ میں بوڑھے آدمی کو اس کے ٹاپ پر بیٹھا ہوا نہیں پاتا۔ لیکن لوگ اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ جس تیزی سے وہ بڑھتا ہے اسی تیزی سے وہ دوڑ کر آ رہے ہیں۔ کھینچ تان کر اس کے پہیئے نکال رہے ہیں۔ بازوؤں سے اس کے راڈس نکال رہے ہیں۔ وہ اب ہمیں بھول گئے ہیں۔ ہمارے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ سب رکشا پر چڑھنے پر مصروف ہیں۔ سکیوریٹی گارڈ جھپٹ کر کار کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور چیخ کر ڈرائیور سے کچھ کہتا ہے۔ وہ اس سے کہہ رہا ہے کہ کار اسٹارٹ کرے اور جہاں تک ہو سکے چلاتا رہے۔ چہرہ کا خیال بعد میں کرے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ بھی چیخ رہے ہیں۔ ڈرائیور سے جلدی کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ چلتے رہنے کے لیے ڈرائیور چابی تلاش کرتا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کو جس قدر لمبا ہو سکتا ہے کر دیا ہے۔ پوری کوشش کے باوجود وہ چابی تک نہیں پہنچتا ہے۔ چابی تک پہنچنے کی جدوجہد میں ہے۔ کوئی کار سے باہر نکل آیا ہے۔ میں نے دروازے کی آواز سنی ہے۔ میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مئے نظر آتی ہے۔ وہ منحنی سی سکڑی ہوئی لگتی ہے۔ اس کے پیچھے ہی رکشا ہے۔ آسمان کی طرف اونچا ہوتا ہوا بہت بڑے چونٹیوں کے گھروندے کی طرح پہاڑ سا لگتا ہے اور اس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے آدمیوں کا اُبلتا ہوا سیلاب۔

مئے ہماری طرف چیخ رہی ہے۔ میں تو ایک لفظ بھی سُن نہیں سکتا لیکن سمجھتا ہوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ دونوں تم لوگوں کی وجہ سے مارے جانے والے ہیں۔ تم لوگ بزدل ہو، قاتل ہو۔ اُنھیں چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔

دروازہ دوبارہ کھُل گیا ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ تردیب کار سے اُترنے والا ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُسے کار میں کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن میرا ہاتھ اُس تک پہنچتا نہیں ہے۔ میں چلّانا چاہتا ہوں لیکن آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ معمولی سی بھی آواز نکال نہیں سکتا۔

یہی وہ لمحہ ہے جب میں جاگ جاتا ہوں۔ زبان بند ہے اور چیخنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

روبی نے ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکالی اور تیلی سے اُسے سُلگانے کی کوشش

کی۔ پہلی تیلی ٹوٹ گئی۔ اس نے تیلی پھینک دی۔ دوسری جلائی۔ اسے مضبوطی سے تھامے اُس نے اپنا سگریٹ جلایا ہے۔

اُس خواب سے میں کبھی بھی چھٹکارا نہ پاسکا۔ اُس نے کہا۔ اس واقعے کے بعد سے۔ جب میں بچّہ تھا تو دعا کرتا کہ اس پر قابو پالوں۔ اگر اس میں کامیاب ہوسکتا تو پھر کوئی دوسرا سانحہ ایسا نہیں تھا جو مجھے اس دن کی یاد دلاتا۔ میں اس سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ وہ باقی ہے۔ میں سوچا کرتا کہ اگر میں اس خواب سے چھٹکارا پالوں تو پھر بھی دوسرے لوگوں کی طرح رہ سکتا ہوں۔ میں اس یاد سے آزاد ہونے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔

اُس نے سگریٹ کے گُل کی طرف دیکھتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔

آزاد ہونا۔ پھر قہقہہ لگا کر اس نے کہا۔ تم جانتے ہو۔ تم گھر جاکر اخبار کے پہلے صفحات پر چھپی ہوئی تصویریں دیکھو جو اب زندہ نہیں رہے۔ آسام میں، شمال مشرق میں پنجاب، سری لنکا، تری پورہ۔ وہ لوگ جنھیں دہشت پسندوں نے، علاحدہ پسندوں نے، پولیس اور فوج نے مار ڈالا۔ ان سب کے پیچھے تمھیں ایک ہی لفظ ملے گا آزادی حاصل کرنے کے لیے انھیں یہ کرنا پڑا۔ میں جب ضلع کا حاکم تھا تو اُن تصویروں کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتا کہ اگر یہ حالات میرے علاقے میں پیش آتے تو میں کیا کرتا۔ مجھے شاید باہر نکلنا پڑتا اور اپنے پولیس والوں کے سامنے تقریریں کرنی پڑتیں: تم لوگوں کو اپنا فرض نبھانے کے لیے حالات سے سختی سے نبٹنا پڑے گا۔ ضرورت پر تمھیں پورے گاؤں کا صفایا کرنا پڑے گا۔ ہم عوام کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم دہشت گردوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ملک کی سالمیت اور آزادی کے لیے۔ اور جب میں گھر واپس ہوتا تو کسی نامعلوم شخص کا خط میرا انتظار کررہا ہوتا۔ ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔ کوئی شخصی دشمنی نہیں۔ ہم کو اپنی آزادی کے لیے تمھیں مارنا پڑے گا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی کہ میں اپنی تقریر کا عکس ایک آئینے میں پڑھ رہا ہوں۔ تب میں اپنے آپ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ہزاروں لکیریں پورے برصغیر پر کیوں نہیں کھینچ دیتے۔ کیا تبدیلی ہوگی؟ یہ ایک سراب ہے۔ ساری باتیں سراب ہیں۔ کوئی کیونکر کسی کی یاد کو تقسیم کرسکتا ہے۔ اگر آزادی ممکن ہوتی تو یقیناً تردیب کی موت مجھے

آزاد کر دیتی۔ ایسا تو نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ پندرہ سال بعد بھی ہزاروں میل دور ایک دوسرے ہی برّاعظم میں اتفاقاً رسٹورانٹ کے ایک ویٹر کے ریمارک پر میرا ہاتھ ایک درخت کے پتّے کی طرح کانپنے لگا۔

اس نے اپنا بدن جھٹکا، سگریٹ پھینکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم کو چلنا چاہیے۔ اس نے کہا۔

تب اِلا بھی جو اس کے بازو بیٹھی تھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ روبی کے کاندھوں پر اور دوسرا میرے کاندھے پر۔ اس طرح وہ ہم دونوں کو تھامے رہی۔ کلاب ہام کے اُس ویران چرچ کی سیڑھیوں پر ہم لوگ دیر تک اُسی طرح کھڑے رہے۔ ایک آزاد مملکت کے تین بچے۔ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے۔

میں نے سوچا تھا کہ اپنے لندن کے قیام کے آخری دنوں میں اُن مقامات کی یاد تازہ کرلوں جہاں میں جایا کرتا تھا۔ ویسٹ اینڈ لین، ہیمنگٹن روڈ، اسٹاک ویل اور ریمبیا تک منٹ، ہندوستان واپس ہونے سے قبل ایک آخری بار۔ شام میں مجھے اسلنگٹن جانا تھا۔ مینے نے ڈنر پر بلایا تھا۔

لیکن دن بھر سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ شام ہوگئی۔ ڈنر کی بات میں بھول گیا۔

مجھے فُل ہام سے ویسٹ اینڈ تک دو بار آنا جانا پڑا۔ میرا سامان ابھی تک باندھا نہیں گیا تھا۔ میں نے تحفوں کی فہرست دیکھی تو دو ایسے ناموں پر نظر پڑی جس کے بارے میں خیال تھا کہ میں نے نشان لگا دیا ہے مکان سے پٹنی برج کے ٹیوب اسٹیشن تک مجھے بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ چہرے پر پسینہ بہہ رہا تھا اور شرٹ پیچھے سے بھیگ گئی تھی۔ تب میں نے آکسفورڈ اسٹریٹ کے ہجوم کو چیرتے ہوئے اپنا راستہ بنایا اور دکانوں میں گھس پڑا۔ پھر دو چھوٹے پارسلوں کو لے کر باہر نکلا۔ مناسب رنگ اور سائز کا ایک جینس دلّی میں رہنے والے ایک دوست کے لیے اور کلکتے والے ایک فیملی فرینڈ کے لیے ہندسے والی ایک گھڑی۔ پھر واپس ٹیوب اسٹیشن کے

ٹرننگ میں آکر پہلی ٹرین پکڑا۔ سامنے بیٹھے گنجے سر والے آدمی کی نظریں بچا کر میں نے اپنی کرسی کے ہاتھوں پر طبلہ بجایا۔ واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر سوٹ کیسوں میں رکھی ساری چیزیں ادھیڑیں تاکہ پھر سے سامان کو جمایا جائے۔ اتنے میں ہوائی جہاز کا ٹکٹ میرے ہاتھ لگا۔ اس پر لکھی ہدایات کے مطابق ابھی تک میری سیٹ کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک بار مجھے ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف بھاگنا پڑا۔ سرد ہوائیں میری پیٹھ پر سے گزر رہی تھیں اور میں ائیر لائن آفس کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو یونیفارم میں کاونٹر پر بیٹھی لڑکی نے مجھے اپنے چہرے کا پسینہ پوچھتے ہوئے دیکھ کر ہمدردی ظاہر کی اور مسکرا کر کہا۔ آپ اس کی فون پر بھی تصدیق کروا سکتے تھے۔ وہاں سے پھر فل ہام لوٹا۔ میرے پاؤں دکھنے لگے۔ ابھی تک کچھ کام نہیں ہوا تھا۔ بہت سارا کام باقی تھا اور وقت کی کمی تھی۔

کل مجھے دوپہر کے وقت ہیتھرو پر رہنا ہے۔

دوپہر کھانے کے وقت میں نے اِلا کے آفس فون کیا۔

اوہ۔ تم ہو۔ میری آواز پہچان کر اس نے حیرت ہوتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ اِلا کیا تمہیں یاد نہیں کہ میں کل ہندوستان واپس ہو رہا ہوں۔

میں جانتی ہوں۔ غیر مانوس اور بے مُری آواز میں اس نے کہا۔ میں نے تکلف کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ اس کے کمرے میں کچھ اور لوگ تو نہیں۔

نہیں نہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں کوئی اور نہیں۔

تو پھر کیوں ایسا ہے۔ تمہاری آواز اس قدر مختلف کیوں ہے؟ میں نے کہا۔

دیکھو۔ اس نے کہا۔ میں تمہارے ساتھ ائیرپورٹ آنا چاہتی تھی۔ تمہیں خدا حافظ کہنے کے لیے۔ سچ سچ یقین کرو لیکن ....

اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے کہا۔ لیکن ہوا کیا؟

بات یوں ہے۔ اس نے کہا۔ نک اور ہم ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے لیے کارن وال جا رہے ہیں۔

بہت بہتر۔ میں نے کہا۔ میری آواز میں کھرا پن تھا۔

میں نے کل جو کچھ کہا ہے اُس کا بُرا نہ مانو۔ وہ جلدی میں کہنے لگی۔ یہ بات میں تم سے کہنا چاہتی تھی۔ میں کچھ زیادہ ہی بولنے لگی تھی۔ میں مشکوک ہو گئی تھی۔ نک کبھی ایسا کام نہیں کرے گا جو مجھے ناگوار ہو۔ سچ تم یقین کرو۔ کل کی کوئی بات سچی نہیں ہے۔ ساری باتیں من گھڑت ہیں۔ یہی تو میں نے کیا ہے۔ ساری باتیں بنائی ہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ بعد میں میں نے اس سے بات کی اور اس نے کہا کہ میں کس قدر بھونڈی لگ رہی تھی۔ اب تو سب ٹھیک ٹھیک ہے۔ ہمیں تھوڑی سی تفریح کی ضرورت ہے۔ بس اتنی سی بات۔

وہ بڑی تیزی سے بات کر رہی تھی۔ غیر فطری آواز میں۔

ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری بات پر بھروسہ ہے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہ کروں؟ میری نیک تمنائیں ہیں کہ تمہارا وقت اچھا کٹے۔

میں جانتی ہوں، تمہیں میری بات کا بھروسہ نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

اُس کی آواز تھرّا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ حلق میں اٹک رہی ہے۔

الا۔ میں نے کہا۔ کیا میں وہاں آؤں؟ تم ٹھیک تو ہو۔

میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ ٹیلیفون پر چلّائی۔ میں بہت اچھی ہوں۔ تمہارا سفر اچھا رہے۔

جوں ہی اس نے ٹیلیفون رکھا کھٹ کی آواز آئی اور لائن منقطع ہو گئی۔

میں اپنے سوٹ کیس کے لیے اوپر کی منزل پر گیا۔

شام کے تقریباً سات بجے جب میرا سامان باندھا جا چکا تو میں یروشلیم کا گلدان رکھنے کے لیے سوٹ کیس کے کسی کونے میں جگہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں زیادہ کوشش کروں تو وہ ٹوٹ جائے گا۔ سر کھجاتے ہوئے میں نے افسوس کیا کہ اسے کیوں خریدا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے ایک ہفتہ قبل خریدا تھا جب مئے نے مجھے ٹیلیفون کر کے ڈنر پر بلایا تھا۔ میں اس قدر متاثر تھا کہ اُسی صبح بازار میں یہ تحفہ اس کے لیے لایا تھا۔ یہی تو وہ گلدان تھا۔ اس کے لیے تحفہ۔ بازار جا کر میں اس کے لیے یہ تحفہ لے آیا تھا اور میں اُسی شام یہ تحفہ اُسے دینا چاہتا تھا۔

میں اپنے کمرے سے تیزی سے باہر نکل آیا اور دوڑ کر رسوئی گھر میں داخل ہوا۔ اسکانڈ نیوین کے ہاتھ سے ٹیلیفون کھینچ لیا۔ وہ میری طرف گھورتا ہوا کچن کی میز پر گھونسا مارتے ہوئے باہر نکل گیا۔

مجھے لگا کہ مئے کی آواز سنے ایک عمر گزر گئی ہے۔

ہلو مئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے مئے کو آواز دی۔ میں آرہا ہوں۔ میں ابھی نکل رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے بھولی نہیں ہو۔

بالکل نہیں۔ اس نے کہا۔ ڈیڑھ بجے سے پہلے تمہارے آنے کی توقع نہیں تھی۔

آدھے گھنٹے کے اندر میں تمہارے پاس رہوں گا۔ میں نے کہا۔ میں ٹیکسی لے رہا ہوں۔

بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے کہا۔ جلدی کی ضرورت نہیں۔ جب بھی آسکو آؤ۔

میں تھوڑی ہی دیر بعد اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گلدان میری جیب میں رکھا تھا۔

مجھے دلّی واپس ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ میں اس بات سے اکثر حیران رہا کرتا کہ کبھی مجھ میں اتنی جرأت بھی ہو گی کہ وہ سوال جس کی برسوں سے میرے دل میں خلش ہے میں مئے سے کر سکوں گا۔ میں نہیں جانتا۔ یہ مسئلہ میرے لیے حل طلب رہا کہ اس نے مجھے یہ آزادی دی کہ نہیں۔ ڈنر کے دوران میری مغموم اور طویل گفتگو کا رُخ اسی نے بدلا تھا۔ سر اُٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی نیلی آنکھیں راست مجھ سے مخاطب تھیں۔ اس نے کہا تم نے مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ ترد یب کس طرح مرا؟ میرا خیال تھا کہ تم یہ سوال سب سے پہلے کرو گے۔

میں نے اس سے سچ سچ کہہ دیا کہ میں نہیں جانتا یہ سوال میں کس طرح کروں۔ میرے پاس اس کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ موزوں الفاظ کا سہارا لیے بغیر اس کی خاموشی کو توڑوں۔

تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ اس نے کہا۔ یہ تمہارا حق تھا اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اس

کا جواب تلاش کروں۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میز پر تھے۔ ایک پر ایک۔

میرا خیال ہے کہ بہت سی باتوں سے تم پہلے ہی سے واقف ہو۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو اس لمحے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

ہم لوگ تمہارے دادا، دادی کے مکان سے واپس ہو رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔ کار کو روکا گیا تھا۔ ہجوم کی طرف سے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے واقف ہو۔ چند لوگوں نے ہم پر حملہ کیا۔ انھوں نے سامنے کا شیشہ توڑا اور ڈرائیور کو زخمی کیا۔ ہمارے ساتھ اسلحے سے لیس سکیوریٹی مین تھا۔ اس نے ان کی طرف گولی چلائی۔ وہ پیچھے ہٹے۔ وہ شاید وہاں سے چلے بھی جاتے لیکن تمہاری دادی کے چچا کو ہمارے پیچھے رکشہ میں لایا جا رہا تھا۔ وہی شخص جس نے ان کی ہمیشہ دیکھ بھال کی تھی وہی رکشہ چلا رہا تھا۔ ہجوم اُن کی طرف پلٹا۔ تمہاری دادی چاہتی تھی کہ ڈرائیور ہماری کار کو لے کر وہاں سے چل پڑے۔ اس نے چلّا کر ڈرائیور کو کار تیز چلانے کے لیے کہا۔ میں اُس سے اُلجھ پڑی اور کار سے باہر نکل آئی۔ تمہاری دادی مجھ پر جھلّائی۔ اس نے کہا میں نہیں جانتی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ میں سب کو مروا ڈالوں گی۔ میں نے اس کی بات نہیں سُنی۔ میں تو ہیروئن تھی۔ ایک احمق بوڑھی اور بزدل عورت کی بات کیسے سنتی لیکن وہ جانتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ میرے سوا سب ہی جانتے تھے۔ میں اکیلی ہی اس سے واقف نہ تھی۔ میں نے رکشہ کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ میں نے تردیب کو سُنا کہ میرا نام لے کر بُلا رہا ہے لیکن میں بھاگتی رہی۔ میں نے اسے بھی میرے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس کیا۔ میرے قریب پہنچ کر اُس نے مجھے پکڑا اور پیچھے سے ایک طرف کو ڈھکیل دیا۔ میں لڑکھڑائی اور گر پڑی۔ وہ رُک گیا تاکہ مجھے کار تک واپس لے جائے۔ لیکن وہ رکشہ کی طرف بھاگا۔ ہجوم نے رکشہ کو گھیر لیا تھا۔ انھوں نے بوڑھے آدمی کو رکشہ سے کھینچ کر گرا دیا۔ میں اس کی چیخیں سُن سکتی تھی۔ تردیب ہجوم میں گھس پڑا اور انھیں ڈھکیلتا ہوا شاید بوڑھے آدمی کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ تب ہجوم نے اُسے اپنی طرف گھسیٹا۔ پھر وہ نظر نہ آیا۔ میں اُن لوگوں کا پیچھا دیکھ سکی۔ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ پھر لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ میں اپنے آپ اُٹھی اور

اُن کی طرف دوڑنے لگی ۔ لوگ گلیوں میں غائب ہو چکے تھے ۔ میں وہاں پہنچی تو تین جسموں کو وہاں پڑا دیکھا ۔ وہ مر چکے تھے ۔ انھوں نے خلیل کا پیٹ چیر ڈالا تھا ۔ بوڑھے آدمی کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا اور تردیب کا گلا کاٹا گیا تھا اِس کان سے اس کان تک ۔

یہی سب کچھ تھا ۔ بس اتنا ہی تو کہنا ہے ۔

مجھے یاد ہے ۔ تب ہم لوگوں نے ڈنر کے برتن ہٹا لیے ۔ جو آئس کریم میز پر گری تھی آسے میں نے صاف کیا ۔ مئے نے چاقو کانٹے اور برتن دھوئے ۔ اس نے لذیز کھانے بنائے تھے ۔ ٹماٹروں کا لذیز سوپ ۔ عمدہ مزے دار ترکاریاں ۔ آئس کریم ، سفید وائن کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی ۔ ہمیشہ کی طرح میں نے اپنے برتن کے اردگرد کھانے سالن گرا دیے ۔ انھیں صاف کرنے کے لیے مجھے کافی وقت لگا ۔ میں یہ کر چکا تو مئے رسوئی گھر میں ابھی تک برتنوں کو کپڑے سے خشک کر رہی تھی ۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو تقریباً گیارہ بج رہے تھے ۔ مئے ، میں نے کہا اب مجھے جانا چاہیے ۔ کل مجھے ہوائی جہاز پکڑنا ہے ۔

میرا خیال ہے کہ تمھیں اب جانا ہی چاہیے ۔ اُس نے فوراً کہا ۔ وہ رسوئی گھر میں تھی ۔ اس لیے میں اس کا چہرہ دیکھ نہ سکا ۔ لیکن اس کی آواز ایسی تھی کہ سُن کر مجھے تعجب ہوا ۔ میں رسوئی گھر میں چلا گیا ۔ اُس کے کاندھوں کو چھوا اور جب اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

نہ جاؤ ۔ اُس نے کہا ۔ پلیز ۔ میں تنہا رہنا نہیں چاہتی ۔ میں خوفزدہ ہوں ۔

تب میں نے اس کے کاندھوں کو مضبوطی سے پکڑا ۔ اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا ۔ اُس کی نمناک آنکھیں میری قمیض کو گیلا کر رہی تھیں ۔ میں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا ۔ ایک بار ، دوبار ۔ پھر گھبرا کر پیچھے ہٹا لیے کہ پہلے کی طرح کوئی حرکت نہ کر بیٹھوں ۔ تھوڑی دیر وہ مجھے تھامے رہی ۔ پھر مجھ سے جُدا ہو کر وہ سیدھی کھڑی ہو گئی ۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اُسے مارا ہے ؟ اس نے کہا ۔

میں خاموش رہا ۔ میں اُسے کوئی جواب دینا نہ چاہتا تھا ۔

میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ اُس نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے ہی اُسے مارا ہے۔ میں سوچتی تھی۔ اگر میں سبب نہ بنتی تو وہ کار سے باہر نہ آتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں کیا کر رہی تھی۔ میں تو محفوظ تھی۔ دیکھوں تو۔ میں سیدھے اُس ہجوم میں گھس سکتی تھی۔ وہ لوگ میرا کچھ نہ بگاڑتے۔ ایک انگریز میم کا۔ لیکن وہ۔ وہ بالکل جانتا تھا کہ وہ مارا جائے گا۔ برسوں تک میں اس گھمنڈ میں رہی کہ اس کی زندگی کا انحصار مجھ پر ہے۔ لیکن اب مجھے پتہ چل گیا کہ میں نے اُسے نہیں مارا ہے۔ اگر میں چاہتی بھی تو ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ اس نے خود اپنے آپ کو حوالے کیا۔ وہ ایک قربانی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ جو سچی قربانی ہوتی ہے وہ پُر اسرار ہی ہوتی ہے۔

اُس نے بڑی نرمی سے میرے چہرے کو چھوا۔ اپنی انگلیوں کے کناروں سے، پھر کہا، آج رات تم یہاں ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟ کل صبح میں تمہارے ساتھ ایئر پورٹ آؤں گی۔

میں رُک گیا۔ رات جب ہم دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں لیٹے رہے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوش تھی۔ میں بھی خوش تھا۔ میں اس کا ممنون ہوں کہ اُس نے مجھے آخری نجات بخش رازِ حقیقت کی ایک جھلک دکھائی تھی۔

●